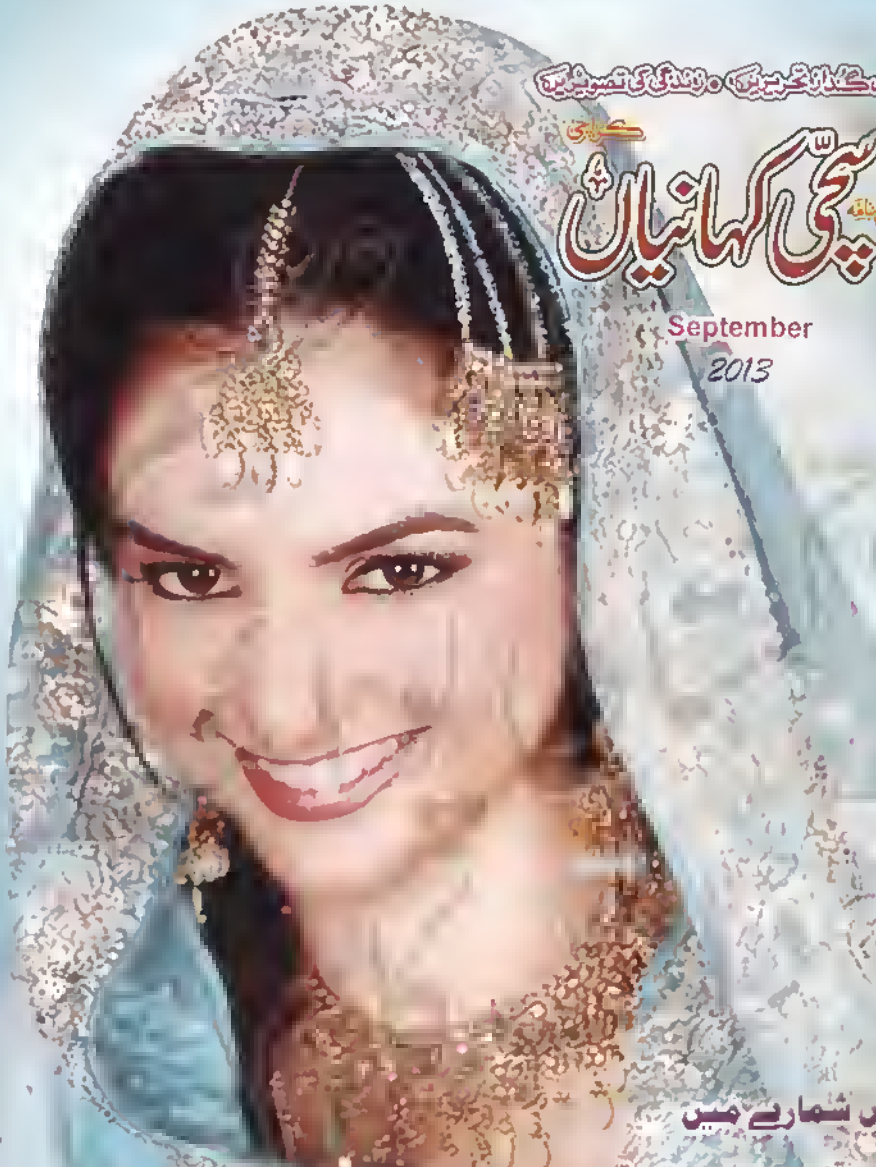

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی
September
2013
اس شمارے میں
☆ "آتشِ جنوں" سلیم فاروقی کے قلم سے
☆ ایک ناقابل فراموش سلسلہ "مکھنی" ارشد علی ارشد کے قلم سے
☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

سچی کہانیاں

اداریہ — کس سے منصفی — سلیم فاروقی — 7

قارئین کے خطوط — احوال — سلیم فاروقی — 9

شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ — شہید کی ڈائری — منزہ سہام — 48

اس ماہ کی خاص کہانی — سوپیکاں تھے... — [illegible] — 31

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت — آتش جنوں — سلیم فاروقی — 49

پہلی آپ بیتی — میرا جرم بتا دو — [illegible] — 86

دوسری آپ بیتی — رحمت کا اشارہ — [illegible] — 87

تیسری آپ بیتی — خود غرض محبت — [illegible] — 94

پہلی جگ بیتی — خالی ہاتھ — [illegible] — 99

دوسری جگ بیتی — سوال کرتا ہے — [illegible] — 105

تیسری جگ بیتی — لگا اک داغ — عذرا فردوس — 114

چوتھی جگ بیتی — کھنک ہنسی کی — محسنہ جیلانی — 119

پانچویں جگ بیتی — اک ذرا سی غفلت — [illegible] — 125

چھٹی جگ بیتی — قسمت کا چکر — رئیسہ خالد — 132

فون: 34930470--021-34939823 پرنٹر [illegible] OB-7 [illegible] کراچی

سچی کہانیاں

پہلی پُر اثر کہانی — کچھ تو کہا ہوتا — تسنیم منیر علوی — 137

دوسری پُر اثر کہانی — یہ جیتے جاگتے... — مینا تاج — 149

تیسری پُر اثر کہانی — کالی رات — عزیز احمد — 159

چوتھی پُر اثر کہانی — ڈھول سپاہیا — [illegible] — 172

پانچویں پُر اثر کہانی — سو بے خبری رہی — [illegible] — 178

پہلی ناقابل یقین کہانی — گھنٹی — [illegible] — 181

دوسری ناقابل یقین کہانی — اک پل کا عذاب — [illegible] — 187

تیسری ناقابل یقین کہانی — وہ اک سایہ — [illegible] — 193

ڈنمارک کا سفرنامہ — ذکر جل پری کا — قمر علی عباسی — 196

پہلی اعترافی کہانی — اندھیری رلبون کی — [illegible] — 205

دوسری اعترافی کہانی — میں سننا چاہتا ہوں — کرن شبیر — 212

ایک عجوبہ لڑکی کی داستان — مکھنی — ارشد علی ارشد — 217

قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل — مسئلہ یہ ہے — ادارہ — 232

کتاب تبصرہ، تعزیت، آپ کی ڈائری، خیال آرائی وغیرہ — Mini Mag — قارئین — 243

[illegible] 600 روپے [illegible] 65 [illegible] 65 [illegible] 65 [illegible] 55 [illegible] رابطہ نمبر: 34939823

کس سے منصفی چاہیں؟

عید بھی آ کر گزر گئی' اگر وہ واقعی عید تھی۔ کیا آپ کی "عید" سے ملاقات ہوئی؟ ہماری تو نہیں ہوئی۔ اللہ اس قسم کی عیدوں سے وطنِ عزیز کو محفوظ رکھے۔

اب یومِ آزادی کا غلغلہ ہے۔ جشنِ آزادی ہم یوں مناتے ہیں کہ گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر پاکستانی جھنڈے لہراتے ہیں' بے ہودہ چیخ پکار کرتے ہیں' نوجوان بالخصوص اس دھج سے یومِ آزادی مناتے ہیں کہ ہر قسم کی بے ہودگی اور بازاری پن کو آزادی کا "تحفہ" سمجھتے ہیں۔

اگر کرپشن اور بددیانتی کا نام یومِ آزادی ہے تو ہم آزاد ہیں' اگر سفارش' رشوت ستانی اور اقربا پروری کا نام آزادی ہے تو ہم آزاد ہیں' اگر لوٹ کھسوٹ اور ظلم کا نام آزادی ہے تو ہم آزاد ہیں اور مادر پدر آزاد ہیں۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر شخص آزاد ہے۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ عوام بھوکے مر رہے ہیں کہ انہیں بھوکے رہنے کی آزادی ہے۔

چھیاسٹھ سال سے وطنِ عزیز میں یہ ہی کچھ ہو رہا ہے اور ہر سال اس بددیانتی اور غلاظت میں کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔

عوام کب تک اس ظلم' بربریت' کرپشن اور مہنگائی کا بار سہہ سکتے ہیں؟ وہ تو اتنے مجبور ہیں کہ اپنی پتا کسی کو سنا بھی نہیں سکتے کہ سننے والے کان بہرے ہیں۔ عوام سے دو میٹھے بول بولنے والے گونگے ہیں تو پھر کس سے منصفی چاہیں؟

کیا آپ کے ذہن میں کوئی حل ہے؟

سلیم فاروقی

احوال

نگراں مدیر سلیم فاروقی قارئین کے درمیان

ساتھیو.....! جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے' عید کو گزرے ہوئے بھی کافی دن ہو چکے ہوں گے۔ہم گزشتہ شمارے میں عید کی پیشگی مبارک باد دے چکے ہیں۔اس کے باوجود ہماری اور ادارے کی طرف سے عید کی دِلی مبارک باد!

ویسے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ کیا واقعی یہ ''عید'' تھی؟ ''عید'' کا مطلب ہے خوشی۔کیا عید منا کر ہمیں واقعی سچی خوشی کا احساس ہوا؟ کم سے کم ہمیں تو نہیں ہوا۔ مارکیٹیں اور بازار خریداروں سے بھرے ہوئے تھے۔رمضان کے آخری عشرے میں تو بازاروں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ یہ کون لوگ ہیں جو پیسے کا اس بے دردی سے زیاں کرتے ہیں؟ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو نہ جانے کیسے رمضان المبارک کی کمر توڑ مہنگائی سے نبرد آزما ہونے کے بعد عید کی آمد تک بالکل نڈھال ہو جاتا ہے۔اس میں اتنی سکت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کے لیے معمولی ہی قسم کے کپڑوں اور جوتوں کا بندوبست کر سکے۔

ہم نے تو اس مرتبہ جوتوں کی ایک دکان میں ایک دلخراش منظر بھی دیکھا جو اب تک ہمارے ذہن پر نقش ہے اور شاید ہمیشہ نقش رہے گا۔سات' آٹھ سال کی خوب صورت سی ایک بچی اپنے باپ کے ساتھ جوتے کی خریداری کر رہی تھی۔ اُسے جو جوتے پسند آ رہے تھے' وہ اتنے مہنگے تھے کہ غالباً باپ کی استطاعت سے باہر تھے۔وہ بچی کو بہلا پھسلا کر کم قیمت کا ایک معمولی سا جوتا لینے پر مجبور کر رہا تھا۔اس کے پائیدار اور آرام دہ ہونے کا یقین دلا رہا تھا لیکن بچی بھی اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔باپ نے اُسے ہر طرح سمجھایا لیکن بچے تو بہر حال بچے ہوتے ہیں' وہ والدین کی مجبوریاں کب سمجھتے ہیں۔

ہم سے رہا نہ گیا اور اس شخص کے پاس پہنچ کر آہستہ سے کہا۔''آپ بچی کو اس کی پسند کا جوتا دلوا دیں۔ جو پیسے کم پڑیں گے' ہم ادا کر دیں گے۔آپ ہمارا کارڈ رکھ لیں' بعد میں ہمیں لوٹا دیجیے گا۔''

یہ سن کر وہ شخص بپھر گیا اور چیخ کر بولا۔''کیا آپ نے مجھے بھکاری سمجھا ہے؟ آپ کی جرأت کیسے ہوئی ایسی بات کرنے کی؟'' پھر اس نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور بولا۔''آؤ بیٹا! ہم کسی اور دکان سے خریدیں گے۔''

بچی بھی اڑ گئی کہ میں یہی جوتا لوں گی۔اُس لمحے باپ کے چہرے پر عجیب بے بسی اور بے کسی کے تاثرات تھے۔میں اپنی جگہ الگ شرمندہ تھا کہ اُس شخص کی خودداری کو ٹھیس کیوں پہنچائی؟ جب بچی نے اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیا تو اُس شخص نے بچی کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے یہ تھپڑ اُس نے نہ صرف میرے منہ پر بلکہ وہاں موجود ہر شخص کے منہ پر مارا ہے۔ مجھے اب تک شرمندگی ہے کہ میں نے اُس شخص کی خودداری کو ٹھیس کیوں پہنچائی؟ اُس نے نہ جانے کس دل سے اور کتنی ہمت کر کے اپنی پھول جیسی بچی کے رُخسار پر تھپڑ مارا ہوگا؟ بے بس و بے کس انسان جھنجلا کر یہ ہی کچھ کرتا ہے جو اُس شخص نے کیا۔ دکان میں موجود ہر شخص اُسی طرف متوجہ تھا۔ وہ شخص بچی کو گھسیٹتا ہوا دکان سے باہر لے گیا اور لوگ دوسرے ہی لمحے پھر اُسی زور و شور سے خریداری میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اگر پہلے خریداری نہ کر لی ہوتی تو بغیر کچھ خریدے دکان سے باہر آ جاتا۔ میری نظروں میں آج تک اُس معصوم بچی کا چہرہ، اُس کے آنسو اور اُس کے باپ کے چہرے کی بے بسی ہے اور شاید یہ واقعہ میں کبھی نہ بھلا پاؤں۔ عید کے دن بھی یہی منظر میری آنکھوں کے سامنے چکراتا رہا۔ ایسے میں کس کی عید اور کہاں کی عید؟ یوں بھی وطنِ عزیز کی اٹھانوے فی صد آبادی نے اسی طرح رو رو کر اور سسک سسک کر عید منائی ہے۔ گویا

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

یہ تو تھا ہمارا احوال، آیئے اب اپنے ''احوال'' کی محفل کی طرف چلتے ہیں۔ ہاں ایک بات اور، گئے وقتوں میں لوگ کبوتروں کے ذریعے نامہ بھیجا کرتے تھے پھر اس کی جگہ ڈاکیے نے لے لی اور خطوط کے ساتھ رنگ برنگ اور انواع و اقسام کے عید کارڈز کا ایک میلہ سا لگ گیا۔ عید سے کئی ہفتے پہلے اسٹال سج جاتے تھے اور بچے بڑے اور خاص طور پہ خواتین ان اسٹالز پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ عید کارڈز بھی ایسے کہ اُن کی چمک دمک اور خوب صورتی پر نظر نہ ٹھہرے لیکن برا ہو اس موبائل کا، اس نے نہ صرف عید کارڈز کی صنعت کو ختم کیا بلکہ لوگوں کو رنگ برنگ اور دیدہ زیب عید کارڈز دیکھنے سے بھی محروم کر دیا۔ اس کے باوجود ہمارے دوست عبدالعزیز جی آ نے اس روایت کو زندہ رکھا ہے۔ وہ واحد احوالی ہیں جن کی طرف سے ہمیں عید کارڈ موصول ہوا ہے۔ جی آ صاحب......! بہت بہت شکریہ!

☒ یہ پہلا خط ہے لاہور سے ایم سعید انور کا، لکھتے ہیں۔ ''بھائی سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور تمام قارئین خیریت سے ہوں گے۔ ماہ اگست کا پرچہ لیٹ ملا اس لیے عید کی مصروفیات کی وجہ سے پرچے کو مکمل نہ پڑھ سکا۔ امید ہے کہ آپ کی عید بھی بہت خوشیوں بھرے لمحوں میں گزری ہوگی۔ عبدالعزیز جی آ بھائی کی بیٹی کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت و تندرستی عطا فرمائے اور انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) اس ماہ شمارے میں سب سے بہترین راجہ محمود کی تحریر ''جھونپڑوں سے محلات'' ''آتشِ جنوں'' سلیم فاروقی اور ''منگنی'' ارشد علی ارشد کی تھی۔ منزہ سہام صاحبہ کی تحریر شہید کی ڈائری بھی بہت اچھی لگی۔ آخر میں تمام قارئین کو ڈھیروں ڈھیر دُعائیں اور عید کی مبارک باد!''

☒ کوثر سعید، لاہور سے لکھتی ہیں۔ ''بھائی سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! مجھے امید ہے کہ آپ اور شمارے کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ اگست کے شمارے کا ٹائٹل بہت اچھا لگا اور تمام لکھاری بہن بھائیوں کی تحریر بہت خوب تھیں جن میں سرِ فہرست تحریر ''آزادی کی قیمت'' جویریا سلیم ''قدرت کا انتقام'' ام عادل اور ''خوشیاں ماتم میں ڈھل گئیں'' نصرت سرفراز کی تحریریں، بہت اچھی لگیں۔ اللہ تعالیٰ عبدالعزیز جی آ بھائی کی بیٹی کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور بہت سی خوشیاں نصیب کرے۔ (آمین!) آخر میں تمام قارئین کو سلام و دُعا اور

عید کی بہت بہت مبارک باد!(ہماری طرف سے بھی آپ کو عید کی دلی مبارک باد!)"

☒ گڑی آپا' لاہور سے رقم طراز ہیں۔ "محترم سلیم فاروقی! السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) آپ کی آمد پر خوشی ہوئی۔ اللہ کرے آپ "سچی کہانیاں" کو مزید ترقی دینے میں معاون ثابت ہوں۔ (آمین!) جواب دینے کا شکریہ اس لیے ہم بھی فوری جواب دے رہے ہیں۔ امید ہے آپ نے میری کہانیاں دیکھ لی ہوں گی اور کوئی نہ کوئی پڑھ بھی لی ہوگی اور امید رکھتی ہوں' آپ انہیں جلد از جلد جگہ دیں گے۔ مزید ایک کہانی حاضرِ خدمت ہے۔ امید ہے' پسند آئے گی۔ کہانیاں نکلتی رہیں تو لکھنے میں روانی رہتی ہے ورنہ وقفہ آجائے تو دماغ کو زنگ سا لگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ (یہ آپ نے دماغ کا زنگ صاف کرنے کا اچھا طریقہ بتایا' ہم بھی اس سے استفادہ کریں گے۔) فون پر انشاء اللہ' بات ہوتی رہے گی۔ سچی کہانیاں کے سارے معاونین کو عید مبارک! اللہ ہم پر اپنی رحمت برسائے اور ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے۔ (آمین!)"

☒ لہڑی بلوچستان سے محمد اسلم آزاد کا اظہارِ خیال۔ "سلیم فاروقی! سدا خوش رہو۔ (آمین!) السلام علیکم! خیرم و خیر خواہم! بعد از خیریت اس طرح ہے کہ ماہ اگست کا عید ایڈیشن میرے سامنے ہے جس کا ٹائٹل تو بہت خوبصورت ہے مگر اسے جس طرح سے جوڑا جا رہا ہے' اس سے ڈائجسٹ کی خوبصورتی کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ چند ہفتوں کے بعد ٹائٹل الگ ہو کر ردی کی ٹوکری میں جا رہا ہے جس پر بہت سی رقم خرچ ہوتی ہے۔ (پرچہ احتیاط سے رکھیں گے تو کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس تو گزشتہ کئی ماہ کے شمارے موجود ہیں جن کا ٹائٹل جوں کا توں ہے۔) اس کے ساتھ ہی حال احوال میں آپ پہلے حال سنتے ہی نہیں ہیں اور درمیان میں بات کاٹ کر جواب دے دیتے ہیں جس سے میرے خیال میں حال احوال میں کوئی اچھا سرور نہیں رہا ہے۔ (اسلم صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ خطوط کی اکثریت میں کوئی بات جواب طلب نہیں ہوتی پھر ان کا کیا جواب دیا جائے؟ رہا سوال ہمارے احوال نہ سننے کا تو بھائی! ہم پہلے پورا خط پڑھتے ہیں پھر جواب دیتے ہیں۔) مزید یہ کہ تحریر کے عین مطابق ساتھ ہی تصویری خاکہ ہو تو تحریر جاندار محسوس ہوتی ہے۔ اس حوالے سے بھی کچھ کوشش کریں۔ (ہاں' اس سلسلے میں آپ کا اعتراض درست ہے۔ ہم اس پہ قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔) آخر میں عید ایڈیشن کے شمارے میں تحریر "میں نصیبوں والی ہوں" شائع کرنے پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری تحریر "ادھوری کہانی" بھی جلد شائع کریں گے۔ (نمبر آنے پر آپ کی وہ تحریر بھی شاملِ اشاعت ہو جائے گی۔)"

☒ بیگم عائشہ ضمیر' کراچی سے لکھتی ہیں۔ "محترم ایڈیٹر سچی کہانیاں! السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ گزارش ہے کہ آپ کا ارسال کردہ رسالہ ملا۔ یقین جانیے' مجھے بے حد خوشی ہوئی' بیان سے باہر ہے۔ اطلاع اس لیے نہ دے سکی کہ آج کل چھٹیوں کے باعث مہمانوں سے گھر بھرا ہوا ہے اور دوسرے لوگوں کا بھی آنا جانا لگا ہوا ہے۔ رسالہ تھوڑا تھوڑا پڑھتی رہی۔ تمام کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ آتش جنوں اور ملکھنی بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ شہید کی ڈائری کا تو جواب ہی نہیں۔ باقی دوسری تحریریں بھی اچھی ہیں۔ میں یہ مختصر اطلاعی خط لکھ رہی ہوں۔ انشاء اللہ' آئندہ پرچہ پر بھرپور تبصرہ کر دوں گی۔ (آپ کے "بھرپور" تبصرے کا انتظار رہے گا۔)"

☒ ملک ضیاء الرحمان' پپری سے لکھتے ہیں۔ "پیاری باجی منزہ سہام اور سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! تمام مسلمانوں کو رمضان المبارک' عید الفطر کی بہت بہت مبارک باد! دُعا ہے' اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو امن' محبت اور بھائی چارے میں مل جل کر عید کی خوشیاں نصیب فرمائے۔ پیاری باجی! اس بار سچی کہانیاں 29 جولائی کو ملا۔ تمام کہانیاں

اور شاعری اچھی تھی۔ عید کی مصروفیت کی وجہ سے میں نے تفصیل سے پڑھا نہیں۔ زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ تعالیٰ اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ آخر میں تمام دوستوں اور دوست نما دشمنوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام قبول ہو۔ اللہ حافظ! (ضیاء الرحمان صاحب! یہ دوست نما دشمن کون ہیں اب ان کی نقاب کشائی کر ہی دیں۔)''

✉ چکوال سے عبدالعزیز جی آ کا اظہارِ خیال۔ ''محترم سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! امید ہے سچی کہانیاں 2010ء ایوارڈ یافتگان سے پیچھا چھڑانے کے لیے انہیں کوئی سرٹیفکیٹ نما چیز By post بھیجی جائے گی۔ عزت مآب! یہ بات کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ ہم اُس کاغذ کے ٹکڑے کو کیا کریں گے جس کے لیے نہ کوئی تقریب منعقد ہوئی نہ اسٹیج سجا؟ اس سے ہماری عزتِ نفس ہی مجروح نہ ہوگی بلکہ سچی کہانیاں کی ساکھ بھی متاثر ہوگی۔ (محترم! ایسا کوئی بھی پروگرام نہیں ہے۔ ہم جب بھی ''سچی کہانیاں ایوارڈ'' کی تقریب کریں گے اُسی شان و شوکت سے کریں گے جس طرح دوشیزہ کی ہوتی ہے۔ یہ شاید سابق ایڈیٹر کا مشورہ تھا جو اُس وقت بھی قابلِ قبول نہیں تھا۔ رائٹرز کو ایوارڈز بھی اُسی باوقار طریقے سے دیئے جائیں گے۔) ''دوشیزہ ایوارڈ'' کا اسٹیج سجنے کی تیاریاں پھر ہونے لگیں۔ کیا سچی کہانیاں اس ادارے کا پرچہ نہیں؟ اس سے سوتیلی ماں جیسا سلوک کیوں کیا جارہا ہے؟ (دوشیزہ کی طرح سچی کہانیاں بھی ادارے کا ''کماؤ پوت'' ہے۔ اس سے بھلا سوتیلی ماں والا سلوک کیوں ہوگا؟) پچھلے تین سال سے اکیلا جنگ لڑ رہا ہوں۔ کچھ خدا کا خوف کیجیے۔ یہ ظلم و زیادتی آخر کب تک جاری رہے گی؟ پلیز! اب اس ناٹک کو بند ہونا چاہیے۔ سچی کہانیاں تقریب کا فی الفور اعلان کیا جائے پلیز! (بہت جلد آپ کو خوش خبری سنائیں گے انشاء اللہ! آپ کیا ہمیں اتنا ہی ظالم سمجھتے ہیں؟) تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے۔ عید کے حوالے سے جس طرح کا ٹائٹل ہونا چاہیے تھا ایسا نہیں ہے پھر بھی کوشش اچھی ہے۔ سلیم بھائی! کیا زبردست اداریہ لکھا ہے اور احوال کی ابتدائی پیراگرافی بخدا دل سنجیدہ و رنجیدہ کر گئی۔ کراچی کے خوف ناک دہشت ناک حالات و واقعات خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ ہم کریں تو کیا کریں؟ سمجھ سے بالا ہے۔ کاش میں اپنے وطن کے ہر شہر گلی محلے کو امن کا گہوارہ بنا سکتا۔ (جی آ صاحب! معذرت! آپ کی نظم ''احوال'' میں شائع نہیں ہو سکتی۔ ہاں آپ پوری نظم بھیج دیں۔ اسے میں ''سچی کہانیاں'' میں شائع کردوں گا۔) احوال میں اس مرتبہ بھی ثمینہ ناز نے میدان مار لیا۔ رسالے کے ہر کالم پر انہوں نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔ سکندر انا شاہد اور تھرڈ مریم شاہ بخاری کے خطوط تھے۔ مدتوں بعد گڈی آپا آئیں مگر مختصر تبصرے کے ساتھ۔ چوتھے نمبر پہ بلوچستان سے عمران مظہر کا تبصرہ بھی کیا زبردست تھا۔ میرے بارے میں جو انہوں نے چھوٹے بچے کی طرح بگڑنے والی پھلجھڑی چھوڑی پڑھ کر مزہ ہی آ گیا مگر سلیم بھائی نے بھی ہمارے بھتیجے کو خوب جواب دیا۔ ہاہاہا..... ماریہ جلال! اگر آپ اس محفل میں نئی مہمان ہیں تو ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اگر پرانی ہیں تو پلیز ایک عدد سلیمانی ٹوپی ہمیں بھی دلا دیں۔ سلیم بھائی! آپ نے کوثر بھابھی اور انور سعید بھائی کی ہینڈ رائٹنگ سے جو اندازہ لگایا وہ سو فیصد درست ہے۔ کوثر بھابھی کو تو گھر گرہستی سے ہی فرصت نہیں۔ یہ نیک کام سعید بھائی ہی کرتے ہیں۔ بھابھی صاحبہ اور انور سعید صاحب کے لیے ڈھیروں خلوص بھری دعاؤں کے پھول! تمام احوالیوں سے گزارش ہے کہ احوال میں کہانیوں پہ تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ چوپائی بن کر نوک جھونک کا تبادلہ کیا کریں اس سے احوال کا رنگ مزید نکھرے گا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ اپنے محبوب لیڈر میاں نواز شریف (جن کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ''وہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے'' کی پراثر تحریر نے جہاں بہت متاثر کیا وہاں راجہ محمود صاحب کے قلمی شارٹ کٹ نے تشنگی

احوال

ستمبر 2013ء

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام اور مکمل پتا:.....

.....

سچی کہانیاں MINI MAG

ستمبر 2013ء

میں اپنی پسند کا تراشہ بھیج رہا/ رہی ہوں جسے میں نے.....

نامی کتاب کے صفحہ نمبر..... سے اتارا ہے۔

میرا نام و پتا:.....

.....

پسند اپنی اپنی

ستمبر 2013ء

میرا پسندیدہ شعر الگ کاغذ پر ہے اسے شائع کر دیں

.....

.....

شاعر:.....

شعر بھیجنے والے کا نام:.....

پتا:.....

کو مہمیز کیا۔ چھپر چھاؤں یوں لگتا ہے' نگہت انور نے ماضی کے ادوار میں سے کسی گم گشتہ خزانے سے ہیرے موتی لعل چرا کر ہم پر لٹائے ہوں۔ (چرانے پر وہ برا بھی مان سکتی ہیں۔) سریندر کور کی آپ بیتی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ آتشِ جنوں + ملھنی کی جب اقساط مکمل ہوں گی تو سیر حاصل تبصرہ کروں گا۔ انشاء اللہ! آزادی کی قیمت اس ملک خداداد کو حاصل کرنے والے اصل محب وطن اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی ہے تو عزلت نشینی میں تڑپ رہا ہے مگر اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس وطن کی خاطر کتنے نوجوان شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے' کتنی ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کی عزتیں لٹیں' کتنے معصوم بچوں کو برچھیوں اور نیزوں میں پرویا گیا' کتنے بزرگوں نے جان کا نذرانہ پیش کیا' گویا خون کی ایک ہولی کھیلی گئی اور پاکستان کا نام دنیا کے نقشے پر واضح ہوا۔ ویل ڈن جویریا سلیم! ماشاء اللہ' لکھنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ یوں لگتا ہے الفاظ سرنگوں ہو کر قطار در قطار آپ کی معیت میں چل رہے ہوں۔ الفاظ کی بُنت بھی کمال کی ہے۔ نیکی رائیگاں نہیں جاتی' بے شک دُعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ صرف سمجھنے کی بات ہے۔ جو سمجھ جاتا ہے۔ اللہ اسے عمل کی توفیق دے دیتا ہے۔ اچھے کام کا صلہ اچھا ہی ملتا ہے۔ چودھویں کا چاند نہ سرنہ پیر' من گھڑت کہانی' صفحے کالے اور وقت برباد! قدرت کا انتقام' ایک عبرت ناک کہانی تھی۔ ام عادل کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ خوشیاں ماتم میں ڈھل گئیں' کہانی پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ اتنا لمبا کہانی کا عنوان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ (ہمیں خود بھی اتنے لمبے نام پسند نہیں ہیں' نشان دہی کا شکریہ۔) بولتا دل تو قیامت ہوتی' یعنی آپا! سب سے پہلے تو یہ بتایئے' آپ ملتان میں تھیں۔ کیا لاہور سیٹل ہو گئیں؟ اس مرتبہ کہانی پسند آئی۔ اللہ زورِ قلم اور زیادہ کرے' گردِ غم سے بھر گیا۔ میں خود حنا عزیز کی ڈولی دے کر دو تین ماہ کے اندر اُس کے سسرال کا ظالمانہ رویہ دیکھ چکا ہوں۔ بے شک بچیوں کی پیدائش سے نہیں' نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔ ویل ڈن' جیتی رہو۔ میں نصیبوں والی ہوں' محمد اسلم آزاد' یہ کچرے کے بدبودار اور تعفن زدہ ڈھیر' کبھی کبھی کسی مظلوم کو بڑا تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ گڈ' گڈ' کیا' ویری گڈ۔ اللہ زورِ قلم اور زیادہ کرے۔ اللہ پر بھروسا' شکیلہ انجم! بہت خوب' کیا ایمان افروز تحریر قلم بند کی ہے۔ ڈھیر ساری دُعائیں آپ کے لیے۔ بے شک اللہ پر بھروسا کرنے والے کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھتے۔ میری بہن' میری دشمن' واہ' واہ' سدرہ جی! آپ نے تو کمال کر دیا۔ اچھی کہانی لکھی۔ زورِ قلم اور زیادہ۔ جیتی رہو۔ عمر خطاب خان' شاہ رخ خان کے بارے میں پڑھ کر مزہ آ گیا۔ انڈیا میں جتنے بھی خان اسٹار ہیں' ان کے بارے میں جب یہ پڑھتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق پاکستان کے شہر پشاور سے تھا تو بڑا فخر محسوس ہوتا ہے بلکہ دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ اب غائب نہ ہو جانا پلیز۔ راہ کی دھول' میمونہ واحد کی کہانی پڑھ کر جہاں حمیدہ کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پہ دکھ ہوا' وہاں مکافاتِ عمل کی رو سے فوزیہ نے اُس عورت سے بدلہ لے لیا جسے اس زمین پر ''ساس'' کہتے ہیں۔ ویل ڈن' جیتی رہو میمونہ! آخر میں عکاشہ سحر' سید مستقیم نوشاہی' صفیہ سجل شاہ' انکل فہیم اور مہ ناز عبدالرشید! جلد از جلد احوال میں حاضری دیں پلیز۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔''

✉ کراچی سے محمد سہیل خان رقم طراز ہیں۔ ''سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! بعد سلام کے عرض ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو عید کی مبارک باد قبول ہو۔ (بہت شکریہ سہیل! آپ کو بھی ہماری جانب سے عید کی دلی مبارک باد! گو عید کو گزرے کئی دن ہو چکے ہیں۔) اللہ سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی ہزاروں عیدیں صحت اور تندرستی کے ساتھ دیکھنا نصیب فرمائے۔ (آمین! ثم آمین!) آپ نے صحیح لکھا کہ یہ عید واقعی پھیکی ہے جو کچھ آپ نے لکھا' درست لکھا۔ اس کے ساتھ رہی سہی کسر بارش نے پوری کر دی جس کی

وجہ سے بہت سے لوگ اس دنیا سے کرنٹ اور بارش کی وجہ سے چلے گئے اور بہت سے لوگوں کے گھروں میں پانی گھر کے اندر داخل ہوگیا جس کے باعث وہ لوگ پریشان اور بہت سے لوگ بے گھر ہوگئے۔ اس وجہ سے یہ عید واقعی پھیکی ہوگئی۔ خیر اللہ ہم سب کا بھلا کرے اور ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ (آمین!) اگر عید کے حوالے سے پسند اپنی اپنی میں کچھ اشعار عید کے بھی ہو جاتے تو شاید اور پڑھنے میں مزہ آتا۔ یہ ایک چھوٹی سی تجویز تھی' باقی شمارہ اگست 2013ء بہت اچھی کہانیاں ہیں خاص طور پر راہ کی دھول' (میمونہ واحد) ایک سبق آموز کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خوش رکھے۔ آپ کا شمارہ دن رات ترقی کرے۔ (آمین! ثم آمین!)''

✉ سلمیٰ غزل کا نامہ کراچی سے۔ ''السلام علیکم! روزے میں شاید دماغ بالکل ہی غائب ہو جاتا ہے۔ (بہت سے لوگوں کا دماغ تو رمضان المبارک کا چاند دیکھتے ہی غائب ہوتا ہے تو پھر چاند رات ہی کو حاضر ہوتا ہے۔) میرے حساب سے میں 27 جولائی کو آپ کو اپنی تحریر پوسٹ کر چکی ہوں مگر دراز کھولی تو اصل اور فوٹو اسٹیٹ سامنے پڑی منہ چڑا رہی تھیں۔ غصہ آیا کیونکہ مجھے یقین تھا' 10 اگست سے پہلے آپ کو تحریر مل گئی تو شاید چھپ بھی جائے کیونکہ 21 اگست کی صبح تو شوہر صاحب 3 ستمبر کو امریکا روانہ ہوں گے۔ ان کا ویزا اچانک ہی آ گیا اور پھر بکنگ بھی ساتھ! مشکل ہوگئی واپسی انشاء اللہ' 17 دسمبر کو ہوگی۔ اس مرتبہ نئی نئی states دریافت کرنے کا ارادہ ہے۔ (گویا آپ اس دور کی کولمبس ہیں؟) یعنی مشی گن' شارلٹ اور شاید نیویارک بھی۔ کوشش کروں گی کہ سفرنامہ آپ کی توقعات کے مطابق لکھ سکوں۔ (یہ بتایئے امریکا سے ہمارے لیے کیا لائیں گی؟) گھر کھلا ہوگا اور اعزازیہ کی توقع ہے۔ امید ہے' آپ زیادہ انتظار نہیں کرائیں گے۔ دُعاؤں میں یاد رکھیں۔ آپ سمیت پورے اسٹاف کو میری طرف سے دلی عید مبارک! (ہماری پوری ٹیم کی جانب سے بھی آپ کو عید کی مبارک باد!)''

✉ راولپنڈی سے فرزانہ نجمت کا خلوص نامہ! ''بہت پیاری منزہ باجی! سلامت تا قیامت باشد۔ السلام علیکم! امید ہے' بفضلِ اللہ تعالیٰ بخیریت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اس مبارک مہینے میں آپ پر اور آپ کے تمام اہلِ خانہ و اراکینِ ادارہ پہ اپنی بے پناہ رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے۔ (آمین!) ''سچی کہانیاں'' کا شمارہ ماہ اگست موصول ہوا۔ اس میں اپنی تحریر بھی دیکھی۔ صدقِ دل سے اور خلوصِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میری بے حد ہمت افزائی اور عزت افزائی ہوئی ہے۔ میرے لیے بڑے فخر و اعزاز کی اور خوشی کی بات ہے کہ ایسے اعلیٰ و عمدہ' پاکیزہ' صاف ستھرے اور خوبصورت رسالے نے میری ادنیٰ سی تحریر کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ اسے عزت و شان بخشی۔ (اب تمہاری تحریر اتنی بھی ادنیٰ نہیں تھی فرزانہ!) یہ نئی سچی کہانی حاضرِ خدمت ہے۔ یہ جنگ بیتی نہیں' اپنے ہی خاندان میں پیش آنے والے واقعات ہیں جو آج تک سب کے لیے عبرت ناک مثال بنے ہوئے ہیں۔ امید ہے' یہ کہانی بھی پسند آئے گی۔ ایک مرتبہ پھر آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ کراچی کے بلکہ ملک بھر کے حالات جس طرح ہر دم دکھ اور تکلیف میں مبتلا رکھتے ہیں' ان کے پیشِ نظر عید کی ویسی خوشی ہوتی نہیں معلوم ہوتی جو زمانہ امن میں تھی' تاہم خوشی کا موقع ہے لہٰذا آپ سب کو اس خط کے ذریعے عید کی مبارک باد قبول ہو۔ (آپ کو بھی ادارے کی جانب سے عید کی مبارک باد!) اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمتیں اور برکتیں ہر دم آپ کے شاملِ حال رہیں۔ (آمین!)''

✉ بشیر احمد بھٹی' فوجی بستی' بہاول پور سے لکھتے ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ! جون کا شمارہ تو بروقت مارکیٹ میں آ گیا تھا۔ بازار کے پہلے ہی چکر میں خرید لیا تھا۔ اگست کا شمارہ کافی لیٹ ہو رہا ہے۔ آج 15 جولائی ہے۔ کئی چکر بازار کے لگا چکا مگر ابھی تک ''سچی کہانیاں'' کا دور دور تک نشان نہیں۔ برائے مہربانی ہرنیا

شمارہ مقررہ تاریخ تک ارسال کیا کریں تاکہ اگلے شمارے کے آنے کا ماہانہ وقفہ برقرار رہے۔ شکریہ۔ (کوشش تو ہماری یہ ہی ہوتی ہے بھائی بشیر.....! لیکن کراچی کے حالات.....)''

✉ شازیہ گل 'مانسہرہ سے لکھتی ہیں۔ ''جناب سلیم فاروقی بھائی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں' آباد رہیں اور احوال کی بزم سجاتے رہیں۔ عرض یہ ہے کہ بہت عرصے سے میں ماہنامہ سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ آج پہلی بار کسی بھی رسالے میں خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے' ہمیں بھی آپ احوال کی بزم میں شامل کریں گے۔ (لیجیے کرلیا' اور بولیں!) مجھے آج ہی 23 جولائی کو شمارہ ملا۔ ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ جون کا رسالہ بھی بہت اچھا تھا۔ ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں خاص طور پر آتش جنوں بہت اچھی لگی اور اس بار بھی رسالہ ہاتھ میں آتے ہی آتشِ جنوں پر جا کر نظر ٹھہری۔ موبائل کہانیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ میرے پاس بھی کچھ کہانیاں ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں جو میں آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ میں سب سے پہلے آپ کو اپنی کہانی بھیجوں جو میری اپنی زندگی کی موبائل کہانی ہے۔ امید ہے' اسے اپنے شمارے میں شامل کر کے حوصلہ افزائی کریں گی۔ (تو پھر بھیج دیں' دیر کس بات کی ہے؟) مجھے کہانیاں لکھنے کا ہنر تو نہیں آتا لیکن سچ لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ (سچ لکھنا ہی تو ہنر ہے شازیہ!) میں آپ کے رسالے کی مستقل رائٹر بننا چاہتی ہوں' مستقل رائٹر بننے کے لیے کیا کوالٹی ہونی چاہیے؟ اور ہاں' نمایاں شخصیات' سچے واقعات میں مرحوم سلطان راہی کے بارے میں بھی پلیز' ضرور کچھ لکھیں۔ (مستقل لکھنے والے کی کوالی فکیشن' کوالٹی یہ بھی ہے کہ وہ مستقل لکھتا رہے۔ سلطان راہی کے بارے میں بھی جلد ہی لکھیں گے۔) ابھی ساری کہانیاں پڑھ نہیں پائی اس لیے کہانیوں پر زیادہ تبصرہ نہیں کر سکتی۔''

✉ حمیرا خان' شاہ کوٹ' (ننکانہ صاحب) سے لکھتی ہیں۔ ''منزہ آپی! السلام علیکم! امید ہے' آپ خیریت سے ہوں گی۔ دوشیزہ ڈائجسٹ میں اسٹوری بھیجنے کے حوالے سے آپ سے دو بار فون پر بات ہوئی ہے۔ آپی.....! میں اس وقت مختلف ڈائجسٹوں کے لیے لکھ رہی ہوں' اور انشاء اللہ' بہت جلد آپ دوشیزہ ڈائجسٹ اور دوسروں میں بھی میری تحریریں دیکھیں گی۔ میں ''سچی کہانیاں'' کے لیے باقاعدگی سے لکھنا چاہتی ہوں۔ امید ہے' اس سلسلے میں آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گی۔ (اس کے لیے آپ پہلے اپنی کوئی کہانی بھیجیں! ہاں' یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنے نام کے ساتھ اپنی تصویر کیوں بنائی ہے؟)''

✉ کراچی سے جعفر خان جمالی کی آمد! ''محترم سلیم فاروقی! السلام علیکم! امید ہے' آپ اور آپ کے تمام ساتھی خیریت سے ہوں گے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں آپ تمام احباب سے دور رہا' وجہ ملک سے باہر رہنا اور ذاتی مصروفیت لیکن سچی کہانیوں کا مطالعہ جاری رہا۔ آیئے' اب تھوڑی مطلب کی بات ہو جائے۔ سچی کہانیاں کا ہر حصہ ہمارے اور ہمارے ملکی حالات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارا گرتا ہوا معیار ہر کہانی اور ہر احوال میں صاف نظر آتا ہے۔ کہانیوں میں اکثر کردار اتنے گرے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہماری آنکھیں ندامت سے جھک جاتی ہیں۔ مجھے یہ کہانیاں پڑھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کیونکہ ان میں حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے اور یہی ان رسالوں کی جان ہوتی ہے' ان ہی احوالوں اور کہانیوں سے متاثر ہو کر میں نے نامور شاعر کے ایک شعر کو اپنے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے' جس کا تعلق میری ذات سے اور میرے ملک سے ہے۔

مرے خدا! مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں' اُس کو گھر کردے

اگر اوپر دیئے ہوئے شعر پر غور کریں تو ہمیں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ شاعر نے کس خوب صورت انداز میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا ہے۔ کیا یہ بڑی بات نہیں ہے؟ اسی کو ہم اعلیٰ ظرفی کہتے ہیں لیکن اس شعر کا بغور مطالعہ کرنے سے حقیقت کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ دراصل شاعر اپنے احساسات اور دلی جذبات کے ذریعے ہمیں ایک پیغام دے رہا ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے اپنے بداعمالیوں سے اپنے گھر یعنی اپنے ملک کی حالت ابتر کر دی ہے اور یہ حالت ایسی ہی رہے گی جب تک ہم اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کریں گے' ہمارے اپنے محاسبے میں ہی ہماری نجات ہے۔ (آپ کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے جمالی صاحب! واقعی ہماری حالت کچھ ایسی ہی ہے۔) شاعر کیوں اللہ سے التجا کر رہا ہے کہ وہ اسے معتبر کر دے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے اپنے اعمال ٹھیک نہیں ہیں اسی لیے اس کے گھر یعنی ملک کے حالات بگڑے ہوئے ہیں۔ گھر حقیقت میں اسے کہتے ہیں جہاں امن و سکون ہوتا ہے' جہاں محبت اور خلوص کے دریا بہتے ہیں' جہاں صبر و استقلال کا مظاہرہ ہوتا ہے' جہاں انسانیت کا بول بالا ہوتا ہے جہاں قربانی و ایثار کے جذبے پھلتے پھولتے ہیں۔ کیا یہ ملک ہمارا گھر نہیں ہے؟ ہم نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے' ہم نے قائد کے سنہری اصولوں کو کہاں اپنایا' نہ ہم میں اتحاد ہے' نہ ہم یقین کے جذبے سے سرشار ہیں نہ ہم میں ضبط و انضباط ہے۔ ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے' ہم انسانیت کے معیار سے گر چکے ہیں' ہمیں غیر ممالک میں بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا' ہم پر شک کیا جاتا ہے' ہم نے صرف دولت کو اپنا ایمان بنا رکھا ہے اور اس کی چاہت میں نفس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں اچھی چیز دکھائی نہیں دیتی کیونکہ ہم گندگی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شاعر کا پیغام ہی یہی ہے کہ جب تک ہم خود معتبر نہیں ہوں گے' ہمارا گھر یعنی ہمارا ملک ٹھیک نہیں ہوگا۔ (اس سلسلے میں روزنامہ اخبارات میں کالم چھپتے ہیں' صفحات سیاہ ہوتے ہیں لیکن ان صفحات کی طرح شاید ہمارا دل بھی سیاہ ہو چکا ہے۔ بہرحال ہمارا کام لکھنا ہے اور ہم لکھتے رہیں گے اس لیے میں نے آپ کا خط مکمل شائع کر دیا ہے کہ شاید اس سے ایک ہی آدمی پر کچھ فرق پڑے۔ صرف ایک آدمی بھی اگر سدھر گیا تو سمجھیں کہ ہمارے الفاظ کی محنت وصول ہو جائے گی۔)

وطن پرستی کے نعرے تو ہم لگاتے ہیں' وطن پرستی کو دل میں جگہ نہیں دیتے
دیارِ غیر میں دولت کو بھی چھپاتے ہیں' وطن پرست وطن کو دغا نہیں دیتے''

✉ ملک صفدر عباس اعوان' جہانیاں سے رقم طراز ہیں۔ ''سلیم فاروقی صاحب! آداب! کیا حال ہیں آپ کے؟ امید کرتا ہوں کہ آپ خیر خیریت سے ہوں گے۔ میری تو خود ویسے بھی یہ دُعا ہمیشہ لبوں پر سجی رہتی ہے کہ پاکستان کا ہر فرد خواہ بچہ' بوڑھا جوان امن و سلامتی سے' خیر خیریت سے رہے۔ دکھ اور غم کی ایک ہلکی سی بھی جھلک ان کو نہ دیکھنی پڑے۔ (آمین!) (بہت اچھی دُعا ہے صفدر!) اس بار ہمیشہ کی طرح اپنے محبوب رسالے کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رسالہ آپ کی طرف سے مجھے جلد ہی مل گیا' 29 تاریخ کی سہانی شام کو۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی حالانکہ دن کے وقت تو گرمی زوروں پر تھی پھر ہمارے ملتان والے علاقے میں تو گرمی کی مثالیں دی جاتی ہیں اور اوپر سے ہم سے ساون بھی ناراض سا ہے۔ یہ کم بخت' ایک بار بھی کھل کر نہیں برسا۔ قارئین سے خصوصی التماس ہے کہ دُعا کریں کہ رخصت ہوتا ہوا ساون کم از کم ایک بار ایسا برسے کہ جہانیاں میں جل تھل کر دے۔ (اس ''جل تھل'' کے پیچھے کوئی اور بات تو نہیں صفدر؟) بات ہو رہی تھی رسالے کی تو رسالہ جلد مل جانے کی بڑی خوشی ہوئی۔ کاش یہ خوشی ہر مہینے ہی دیکھنا نصیب ہو۔ رسالہ آپ کی طرف سے موصول ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ

میری کہانی شاملِ اشاعت ہوئی ہے۔ ایک بات بتاؤں' آپ یقین نہیں کریں گے کہ آپ کی آواز ہو بہو میرے چچا سے بہت ہی ملتی ہے۔ کال سننے کے دوران کئی بار مجھے یہی لگا کہ میں اپنے چچا جان سے بات کر رہا ہوں مگر میرے چچا تو بہت ہی دور رہتے ہیں' اتنا دور کہ میں چاہ کر بھی اُن کو واپس بلا نہیں سکتا' اُن سے بات نہیں کر سکتا' اُن کو دیکھ نہیں سکتا۔ اللہ نے جو ہمیشہ کے لیے اُن کو اپنے پاس ہی بلا لیا ہے ناں۔ آپ کی آواز سن کر میں بہت آبدیدہ سا ہو گیا تھا کہ بات کرنی گویا مشکل ہو گئی تھی مگر پھر دل میں خیال آیا کہ کیا ہوا جو میرے چچا جان اس دنیا میں نہیں ہیں۔ آپ بھی تو میرے چچا جیسے ہی ہیں ناں' آپ بھی تو میرے اپنے ہی ہیں ناں۔ (صفدر......! تم ہمیں بھی اپنا چچا ہی سمجھو مگر بھتیجا بننا آسان نہیں ہے' سوچ لو۔) اگست کا شمارہ جیسے ہی ہاتھوں میں آیا' پہلی نظر ٹائٹل پر ہی پڑی۔ ٹائٹل خاصا جاذبِ نظر اور زبردست قسم کا تھا۔ ٹائٹل گرل خوب بناؤ سنگھار کیے ہوئے' سر پر عروسی دوپٹہ لیے ہوئے' نگاہ اوپر رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔ لگتا تو یہی تھا کہ موصوفہ عید کا چاند دیکھنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔ (یہ چاند نظر آنے کے بعد کا منظر ہے۔) پتا نہیں' اُس کو چاند نظر آیا کہ نہیں آیا؟ مگر ہم نے چاند کا انتظار کیے بغیر ہی بس ہولے سے محترمہ کے کان میں عید مبارک کہا اور آگے بڑھ جانا مناسب سمجھا۔ (ہولے سے کیوں' زور سے کہتے تا کہ آواز اُن محترمہ تک بھی جاتی۔) اور اداریے پر جا پہنچے۔ ''دکھاوا'' کے عنوان پر آپ نے خوب لکھا۔ واقعی یہ کتنا سچ بھی لگتا ہے۔ روزہ واقعی اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہی رکھا جانا چاہیے۔ اس بار کہانیوں کا انتخاب اچھا تھا۔ 14 اگست کے حوالے سے کہانی ''آزادی کی قیمت'' بہت بھلی معلوم ہوئی۔ الفاظ کا چناؤ اچھا تھا۔ اپنی کہانی کے بارے میں کیا لکھوں' یہ تو قارئینِ کرام ہی اپنے تبصرے میں بتائیں گے۔ شاہ رخ خان کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا مگر ان کے بارے میں کم لکھا گیا۔ مزید ان کی حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی جاتی تو پڑھنے میں اور بھی دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔ سلسلے وار کہانیاں تو بیسٹ' دی بیسٹ تو ہیں' ان کے بارے میں کوئی الفاظ نہیں۔ باقی سب سلسلے بھی زبردست تھے۔ سر جی......! میری کم از کم چار کہانیاں جن میں دو پراسرار اور دو مختصر موبائل کہانیاں ہیں۔ آپ کے پاس موجود ہیں' ان میں ایک پراسرار کہانی جو تھوڑی طویل ہے' کافی ماہ پہلے بھیجی تھی۔ ایڈیٹر صاحب نے اس کہانی کو دو تین حصوں میں شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ سر جی......! آپ میری اس پراسرار کہانی اور باقی تین کہانیوں کو بھی جلد از جلد شاملِ اشاعت کر کے مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کریں۔ نوازش ہوگی۔ سلیم فاروقی صاحب! اب آپ جو میرے ''چچا جان'' بن گئے ہیں تو اس ناتے سے میں آپ کا بھتیجا ہوا اور بھتیجا' بیٹے کی طرح ہوتا ہے اور پھر بیٹے کی بات کون ٹال سکتا ہے بھلا' کیوں ایسا ہی ہے نا؟ کیونکہ چچا جان......! پاکستان میں دو چیزیں ہی اچھی ہیں' اک پنڈ وچ لسی' تے دوسرا جہانیاں وچ! ای......ہاہاہا...... (صفدر......! ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ بھتیجا بننا آسان ہے لیکن اس رشتے کو نبھانا مشکل ہے۔ سوچ لو اچھی طرح!)''

✉ یہ ہیں خیر پور ناتھن شاہ (بورڑی شریف) کی تحسین جونیجو' لکھتی ہیں۔ ''محترم انکل سلیم فاروقی! السلام علیکم! امید ہے کہ رمضان المبارک کی برکتیں آپ پر برس رہی ہوں گی۔ جب یہ خط آپ کے ہاتھوں میں آئے گا' تب عید کا چاند بھی عید مبارک کہتا ہوا سارے چمن میں وارد ہو چکا ہوگا' انشاء اللہ تعالیٰ! عید الفطر ہم سب کے لیے بے شمار خوشیاں لائے۔ (آمین!) ہائے ربا......! کتنی چاہ سے پچھلے ماہ خط روانہ کروایا تھا۔ جانے کس ظالم کے ہاتھوں لگ...... خیر' جو ہوتا ہے' اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ ٹائٹل بہترین رہا اور ڈریس بھی! اس بار اداریہ سلیم انکل نے پیش کیا۔ ''دکھاوا'' بہت خوب تھا۔ تمام رائٹرز سے معذرت خواہ ہوں کہ مصروفیت کی وجہ سے سوائے

شیلڈ کارپوریشن لمیٹڈ کی جانب سے ''آج اسکول' کل دنیا'' کی قرعہ اندازی کراچی پریس کانفرنس میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، اینا سید، اور شینا مصطفیٰ نے 100 خوش نصیب بچوں کے نام نکالے۔ شیلڈ کارپوریشن لمیٹڈ ان 100 بچوں کی سال بھر کی اسکول کی فیس ادا کرے گا۔

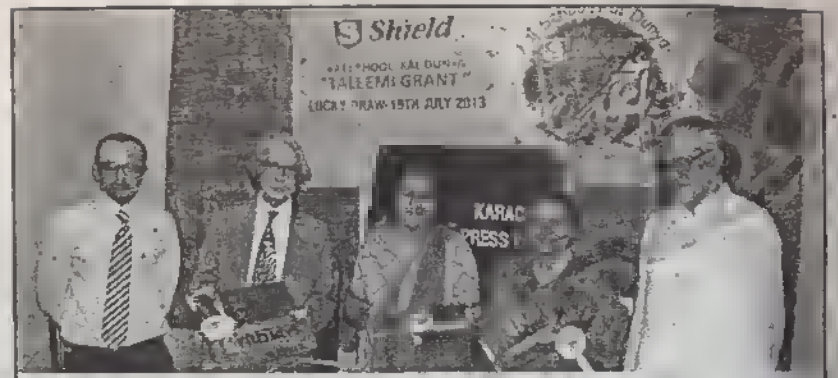

اپنے پسندیدہ سلسلے موبائل کہانی کے' کوئی تحریر پڑھ نہیں پائی۔ ''میری بہن' میری دشمن'' فریحہ ایک ظالم بہن تھی جسے سب لاحاصل ہی رہا' برائی کا صلہ تباہی ہی ہوتی ہے' یہی سزا ہونی چاہیے تھی۔ یہ من گھڑت کہانی نہیں لگی کہ ایسے کارنامے دیکھ اور پڑھ چکے ہیں۔ غم زدہ تحریر رہی۔ انکل کی بات سے متفق ہوں کہ کئی ساتھی آج کل ایسا تبصرہ کر رہے ہیں' صرف کہانیوں کی فہرست دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کہانی پسند آئی۔ یہ سراسر ناانصافی ہے' بے ایمانی ہے۔ وقت کی قلت کی وجہ سے شاید یہ ہو رہا ہے۔ خیر' یہ تو بناوٹی کام ہے جو اپن سے ہونے والا نہیں۔ (جتنی بھی کہانیاں پڑھ لی ہوں۔ ضروری تو نہیں کہ پورے پرچے پر تبصرہ کیا جائے) قارئین سے گزارش ہے کہ بغیر پڑھے ناموں کی بھرمار سے گریز برتیں۔ زیادہ نہیں تو دو چار ہی کہانیوں پہ تبصرہ کر دیا کریں۔ ویسے تو یہ بات اپنے انکل کے کہنے کی ہے مگر ہم نے ہاتھ بٹا دیا تا کہ وقت ضائع نہ ہو' ہے نا انکل؟ (ہم تو پہلے ہی یہ بات کہہ چکے ہیں بھتیجی......!) محفلِ احوال پر مزہ رہی۔ عمران مظہر صاحب! ہم نے منع تھوڑی کیا ہے' جتنا مرضی' جیب اڑائیں اور ہاں' باادب' باملاحظہ' ہوشیار' بلا مقابلہ نہیں چلے گا۔ یہاں ریس لگانی پڑتی ہے' ایویں کا ہے کا لقب؟ ولی عہد بن جانے پر غور کیجیے گا۔ خیال رہے' ہم بقلم خود ملکہ احوال نامزد ہیں' گئے زمانوں میں ثابت بھی کر چکے ہیں گر آپ کا حافظہ تیز ہے تو؟ (بھئی ملکۂ احوال اور ولی عہد صاحب! آپ دونوں ابھی تک بہ قلم خود ہی یہ عہدے لیے بیٹھے ہیں۔ اس کا فیصلہ تو قارئین کریں گے۔ ویسے سنا ہے کہ ملکہ اور شہزادیاں ذہین کے ساتھ ساتھ حسین بھی ہوتی ہیں۔) عبدالعزیز جی آ جی انکل! خط کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ (کبھی انکل جی آ کے خط کو بھی پسند کر لیا کرو۔ ویسے ہی وہ ناراض ناراض رہتے ہیں۔) کوثر سعید آپی......! بیٹے کی باسی سالگرہ کی یاد دہانی کروا دیتیں تو اسی دن فون پہ بھی وِش کر دیتی۔ (سالگرہ پر تو گفٹ دیا جاتا ہے تحسین! صرف وِش سے کام نہیں چلتا۔) سلیم اختر انکل کی خدمت میں اس ناچیز کا بھی سلام و دعائیں! (سلیم اختر انکل کی طرف سے ''ناچیز'' کو وعلیکم السلام!) پسندیدہ کالم ''میری کہانی' میری زبانی'' کی کمی محسوس ہوئی۔ (اس سلسلے میں یکسانیت سی پیدا ہو گئی تھی تحسین! ہاں' اگر کوئی منفرد تحریر ملی تو ضرور شائع کریں گے۔) خیال آرائی میں انسان سخت جان' (رضوانہ کوثر

آپی)، وہ میری محبت، (وفا صدام حسین) اور نیکی کا صلہ (عزیز جی آ انکل) کی بہت پسند آئیں۔ اب اجازت۔ اللہ حافظ! (اللہ ہی حافظ تحسین......!)"

☒ نزرینہ جونیجو بھی بورڑی شریف سے آئی ہیں۔ لگتا ہے، یہ جونیجو سسٹرز واقعی "ملکۂ احوال" بننے کی کوشش میں ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "سلیم فاروقی صاحب! آداب عرض! (ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں میں آداب کی بجائے السلام علیکم کا طریقہ رائج ہے۔) چند سالوں کی غیر حاضری کے بعد آج دل نے چاہا تو قلم سے ناتا جوڑا ہے۔ میں سچی کہانیاں کی پرانی قاری اور رائٹر ہوں۔ جب سے محفل اختتام پذیر ہوئی ہے تو میں نے سچی کہانیاں پڑھنا ہی چھوڑ دیا ہے کیونکہ محفل میں مزاحیہ خطوط، قاری، رائٹر کی نوک جھونک بہت اچھی لگتی تھی۔ اب شمارے میں پہلے جیسا مزہ نہیں رہا۔ کہانیاں پڑھی ہی نہیں تو تبصرہ کیسے؟ (آپ نے "احوال" کب چھوڑا تھا؟ اب انشاء اللہ آپ کو ویسا ہی مزہ آئے گا۔) کوثر سعید، محمد فہیم انکل، رضوانہ کوثر آپی، ملک ضیاء الرحمان صاحب! بہت بہت شکریہ۔ رضوانہ کوثر آپی کو اعتکاف اور سالگرہ ڈبل مبارکباد! (ایک مبارک باد ہماری طرف سے بھی اعتکاف سے باہر آنے کی!) بھیا سعید انور سعید، کوثر سعید، فہیم انکل، سدرہ انور، پیر صاحب مستقیم نوشاہی اور سینئر ساتھی جو میری طرح سچی کہانیاں کو چھوڑ چکی ہیں، بہت بہت سلام۔ (ہم سمیت اُن سب سے عرض کریں کہ "سچی کہانیاں" کو یوں نہ چھوڑیں، اب اس میں آپ کو وہی پہلے والی چاشنی ملے گی۔ اسے ایک دفعہ پڑھنا شرط ہے۔) کاشی چوہان بھیا اور آپ کی پوری ٹیم کے لیے ڈھیر ساری دُعائیں! (تو کیا ہم امید رکھیں کہ تم دوبارہ بھی نہ صرف "احوال" میں شرکت کرو گی بلکہ پرچے پر تبصرہ بھی کرو گی؟ ہمیں خاص طور پر تمہارے خط کا انتظار رہے گا۔)"

☒ کراچی سے نیر رضا ولی کا اظہارِ خیال۔ "ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ تمام لوگ خیریت سے ہوں گے اور دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمام پاکستانیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) اس سے قبل بھی ایک تحریر ارسال کی تھی لیکن سچی کہانیاں کی زینت نہ بن سکی۔ ایک اور تحریر ارسال کر رہا ہوں، امید کرتا ہوں کہ شائع ہو جائے گی اور جلد شائع ہو جائے گی۔ (تمہاری تحریر باری آنے پر ضرور شائع ہو گی نیر!) اس تحریر کا اگر کوئی شعر لائقِ اشاعت نہ ہو تو آپ کو اختیار حاصل ہے کہ آپ اس شعر کو ضائع کر سکتے ہیں اور اگر یہ پوری تحریر لائقِ اشاعت نہ ہو تو آپ ردی کی ٹوکری کے حوالے کر دیجیے گا۔ میں سمجھ لوں گا کہ میری تحریریں سچی کہانیاں کے لائق نہیں ہیں۔ (ارے بھئی! ایسی بھی کیا مایوسی؟) آپ نے اب تک جو تحریریں شائع کیں، ان پر نہایت ممنون و مشکور ہوں اور امید یہی ہے کہ آئندہ بھی موقع ملتا رہے گا۔"

☒ صفیہ سلطانہ مغل، جیکب آباد سے شکوہ کناں ہیں۔ "سلیم صاحب! السلام علیکم! اللہ پاک سے امید واثق ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ پرچہ اس بار وقت پر مل گیا لیکن ہم اسے وقت نہ دے سکے۔ وجہ رمضان کریم کی مصروفیات۔ بہرحال چونکہ میرا گزشتہ خط بھی تاخیر سے ملنے کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکا تھا اور اب بارشوں کی وجہ سے بھی وقت پہ نہیں مل سکے گا، سو آپ کو ای میل کر رہی ہوں۔ راجہ محمود کی تحریر گو اپنی جگہ بے حد عمدہ تھی، وسیع معلومات کا خزانہ سمیٹے ہوئے تھی مگر جس مردِ بحران پر پورے پاکستان کی نظریں جمی ہوئی تھیں، صد افسوس کہ وہ مردِ ناداں ثابت ہوا۔ کوئی واضح تبدیلی سامنے نہیں آئی۔ سلیم صاحب! آپ کا اداریہ میرے دل کی آواز تھا۔ کیا یہ نفس کو غلام بننے کی تربیت کا مہینہ ہے یا خود کو نفس کا غلام بنانے کا، پلیز ذرا سوچیے۔ گھر کی خواتین پہروں کچن میں ہلکان ہوتی ہیں، افطاری کے بعد وہی خورونوش کچرے کے ڈھیر پہ۔ احوال میں میرے علاوہ تمام احباب

کے خط بے حد اچھے تھے۔ خدا اس محفل کو سدا آباد رکھے۔ (یہاں تم کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہو صفیہ!) یومِ آزادی کے حوالے سے سب کہانیاں بے حد اچھی اور سبق آموز تھیں، ان کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ آتشِ جنوں کے بارے میں ایک فقرہ تیرے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے! اس کے علاوہ بھی تمام کہانیاں دلپذیر تھیں۔ آپ بے حد لگن اور محبت سے پرچے کی تدوین اور تزئین کرتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کے جنون کو سلامت رکھے۔ (آمین!) (بس محبت ہے تمہاری ورنہ......) میں نے شریف اکیڈمی کی رپورٹ ارسال کی تھی تو وہ کب شاملِ اشاعت کریں گے؟ میں نے اپنی کتاب کا اڈ بھی دیا تھا۔ وہ؟ (ایک چیز ہوتی ہے صبر تو ذرا صبر سے کام لو۔ دونوں چیزیں شائع ہو جائیں گی اور بھئی شریف اکیڈمی سے ہمیں بھی کوئی چھوٹا موٹا ایوارڈ دلوا دو۔)"

☒ کاشف عُبیدبٹہ موڑی بٹ گرام سے لکھتے ہیں۔ "نگراں مدیر سلیم فاروقی! السلام علیکم! سلیم فاروقی انکل! امید ہے، آپ خیریت سے ہوں گے اور آپ کا پورا اسٹاف بھی خیریت سے ہو گا۔ ایک عرصے سے ماہنامہ سچی کہانیاں کے ساتھ ہوں۔ اس سے پہلے اور اب بھی کراچی کے ایک رسالے کے ساتھ ہوں۔ اس میں بچوں کے لیے چھوٹی موٹی تحریریں لکھی ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی لکھتا رہوں گا لیکن وہاں اپنی پہچان بنانا اچھا نہیں لگا۔ (کیوں بھئی! پہچان تو کہیں بھی بن سکتی ہے، صرف تمہیں لکھنا آتا ہو۔) پھر سچی کہانیاں کی طرف آیا۔ اس رسالے میں آپ کے ادارے نے میری پہلی اور چھوٹی سی کہانی شائع کی، اپنی کہانی دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ میری تحریر ہے۔ سلیم انکل! آپ کا، پورے اسٹاف کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کر کے میری کہانی شائع کی۔ انکل! شائع شدہ کہانی کے ساتھ میں نے ایک دوسری کہانی بھی بھیجی تھی۔ اگر ممکن ہو تو اس کہانی کو بھی رسالے میں جگہ دے کر مجھے شکریہ کا موقع دیں۔ سلیم فاروقی انکل! اب چلتے ہیں رسالے کی طرف۔ میں نے تقریباً چند ہی کہانیاں پڑھی ہیں کیوں کہ آج کل ہمارے امتحان ہو رہے ہیں۔ (عبید! امتحان زیادہ اہم ہے۔ تم پہلے خوب اچھی طرح امتحان کی تیاری کرو۔) بس شمارہ تھوڑا سا ہی پڑھ پایا ہوں اور وہ بھی قسط وار سلسلے جن میں آپ کی آتشِ جنوں، تمر علی عباسی کی "ذکر جل پری کا" اور ارشد علی ارشد کی "منگھنی"۔ بس اتنا ہی پڑھا ہے اور ان سلسلوں سے پہلے دوستوں کا احوال یعنی دوستوں کے خطوط۔ اس دفعہ بھی احوال میں نئے قارئین موجود تھے۔ نئے قارئین کو دیکھ کر دل کو خوشی ہوئی کہ چلو، سچی کہانیاں کے چاہنے والے اور بھی بڑھ گئے۔ بس اس دفعہ اتنا ہی۔ اگر ممکن ہوا تو اگلے ماہ ضرور حاضری دوں گا۔ جاتے جاتے آپ کو، آپ کے پورے اسٹاف کو اور سچی کہانیاں کے قارئین کو بہت بہت عید مبارک!"

☒ اِم مناہل کا فکر انگیز خط۔ لکھتی ہیں۔ "جناب سلیم فاروقی انکل! السلام علیکم! سچی کہانیاں سے رشتہ جڑے تین سال کا عرصہ بیت چکا ہے مگر آپ سے پہلی دفعہ مخاطب ہو رہی ہوں حالانکہ سچی کہانیاں میں آپ کو بہت بچپن سے جانتی ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ امید ہے، خیریت سے ہوں گے۔ (ہم خیریت سے ہیں لیکن کیا تم نے سچی کہانیاں پانچ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کر دیا تھا مناہل؟) اس وقت جس ہستی کے لیے میں اپنے جذبات پیش کرنے جا رہی ہوں، انہیں "تھیں"، لکھتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے لیکن اسی مہینے ان کی برسی ہے اس لیے ان کی یاد بھی بہت زیادہ آ رہی ہے۔ موت برحق ہے اور زندگی فانی اور فانی دنیا سے دل لگانا دانش مندوں کی نشانی نہیں ہوتی۔ اچھی اور دل پر اثر انداز ہونے والی کہانیاں لکھنے کے لیے مطالعہ، تجربہ، تجزیہ، خاصی مواد، علم کی قابلیت اور قلم کی طاقت بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو آتے ہی محفل پہ چھا جاتے ہیں اور کچھ کو اپنا مقام بنانے میں برسوں درکار ہوتے ہیں۔ کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں پڑھ کر لوگ بھول جاتے ہیں اور کچھ ذہن کے پردہ

اسکرین پر ہمیشہ چھائی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دنیا سے جانے کے بعد زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے اور کچھ کی یادیں دنیا والوں کو ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی شخصیات میں ایک نام منورہ نوری خلیق کا بھی ہے۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کی وہ عظیم رائٹر جن کی نئی کہانی تو اب کبھی پڑھنے کو نہیں ملے گی مگر اپنے پیچھے وہ درسِ توحید کے جن حسین لفظوں کو کہانی کی صورت میں چھوڑ گئی ہیں وہ اگر سمجھ کر پڑھیں اور ان پر عمل پیرا ہوں تو وہی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ منورہ نوری آنٹی کے جانے کے بعد جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ اب شاید ہی کوئی پُر کر سکے کیوں کہ لفظوں کا جادو بھی کسی کسی کے قلم میں ہوتا ہے اور لفظوں سے کھیلنے کا ہنر ہر ایک کو نہیں آتا۔ منورہ آنٹی کی تحریریں کسی ایک زمانے کی نہیں' ہر دور کی ہیں۔ جتنی دفعہ بھی پڑھ لو' ہر بار نیا مزہ آتا ہے۔ تاریخ لکھنا جتنا مشکل ہے' اس سے کہیں زیادہ تاریخ کو کہانی کی صورت میں موڑنا مشکل ہے کیوں کہ ایسی کہانیوں میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ادارے کو ان کے نام کا ایک نمبر ضرور نکالنا چاہیے۔ (تمہاری تجویز قابلِ غور ہے منال!) سلیم انکل! مجھے منورہ آنٹی کی کتاب ''معلمِ اعظم'' اور ''نامور مسلم خواتین'' چاہئیں۔ کیا وہ ادارے میں موجود ہیں اور منگوانے کا کیا طریقہ ہے؟ پلیز' بتا دیں۔ (اگر یہ کتابیں ادارے میں موجود ہوئیں تو تمہیں بطورِ ردی پی روانہ کر دیں گے۔) ''چھپر چھاؤں'' قیامِ پاکستان کے پس منظر پہ لکھی گئی ایک منفرد تحریر ہے۔ اب تک صرف انڈیا سے آنے والے مسلمانوں کے اجڑنے کے واقعات ہی پڑھے تھے لیکن صد افسوس' اِدھر کے مسلمانوں نے بھی کم ظلم نہیں کیے۔ بہرحال اکثریت مسلمانوں کے اجڑنے کی ہی ہے کیوں کہ اتنے عرصے میں صرف یہ ایک کہانی مسلمانوں کے ظلم کی منظرِعام پر آئی ہے ورنہ پاکستان کی تاریخ تو ہندوؤں کے مظالم سے بھری پڑی ہے پھر جب یہ کہانی ختم کر کے اگلے صفحے پر آئے تو ''آزادی کی قیمت'' وہی ہندوؤں کے مظالم کی کہانی مگر ہندوؤں کے مظالم سے بچ کر پھر اپنوں کے دیئے ہوئے دکھ کی داستانِ حیات' کیا لکھوں' کیا نہ لکھوں' کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے' بس یہی کہ اچھے برے لوگ ہر رنگ' نسل' قوم اور خاندان میں موجود ہوتے ہیں۔ ''نیکی رائیگاں نہیں جاتی'' اگر اپنے جذبوں میں انسان سچا ہو اور نیک عمل سے اپنے مقصد کو حاصل کرے تو اللہ بھی اس کا بھرپور ساتھ دیتا ہے اور اس کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور پھر رشوت تو ہے ہی جہنم کا راستہ..... ''مجھے قرار آ جائے'' کاش لڑکیاں اجڑنے سے پہلے ہی سنبھل جائیں تو حوا کی بیٹیوں کو معاشرے کے سامنے رسوا نہ ہونا پڑے۔ ''دردِ دل کے وسیلے'' محبت کے عنوان پر ایک اچھی اور پراثر تحریر ہے۔ جب محبت کی آگ دونوں طرف لگی ہو اور بیچ میں زمانہ ظالم سماج بن کر کھڑا ہو تو پھر محبت کی انتہا ایسی ہی ہوتی ہے۔ ''راہ کی دھول'' عبرت ناک' سبق آموز کہانی کسی انسان کو صرف اپنے مطلب اور مفاد کی خاطر استعمال کر کے محبت جتانا اور وقت نکلنے کے بعد اس کو حقیر تصور کر کے پیچھا چھڑا لینا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و گھمنڈ کی چادر میں لپٹ جانے والوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اتنی بڑی بیماری سے صحت یاب ہو جانا قدرت کی طرف سے بہت بڑا تحفہ ہے مگر اس عورت نے تو ہر کامیابی کی بنیاد صرف پیسے اور اپنے آپ کو ہی سمجھ لیا تھا مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جو گناہ اس نے کیا تھا' اس کی سزا تو ملنا تھی۔ ''مکھنی'' کی کیا تعریف کروں' کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کی تعریف کی نہیں جاتی' وہ خود اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ ''مکھنی' گھائل آتما' ناشون' عشق سمندر ہے' ایسی ہی تحریروں کی لسٹ میں شامل ہیں۔ میں نے ایک کہانی منزہ باجی کو بھیجی تھی' اس کا شدت سے انتظار ہے۔ ایک کہانی اور بھیج رہی ہوں' پڑھ کر بتائیے گا کیسی ہے؟ یہ تو آپ لوگوں کی محبت ہے کہ آپ کسی کی محنت ضائع نہیں ہونے دیتے۔ تمام اسٹاف کو میری طرف سے سلام اور دلی عید مبارک! فاروقی

انکل' پلیز' پلیز' پلیز' اگر یہ خط آپ کو دیر سے ملے تو اگلے ماہ ضرور چھاپیے گا کیوں کہ بارشوں کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ (خط دیر سے ملا ہے' اس کے باوجود شائع کر دیا ہے کہ تم نے کہانیوں پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔)''

✉ مجید احمد ملتانی' ملتان سے لکھتے ہیں۔ ''سلیم فاروقی صاحب! مزاج گرامی! امید ہے' آپ کی سچی کہانیاں کی تمام ٹیم بخیریت' ہنستی مسکراتی' خوش باش ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سدا مسکراتے رکھے۔ صحت کی بادشاہی' ایمان کی سلامتی اور مسکراتی زندگی ہمیشہ رہے۔ (آمین! ثم آمین! کروڑ آمین!) (صحت کی بادشاہی کی ترکیب پسند آئی مجید!) اوہو' میرا پوچھ رہے ہیں' میں کون ہوں؟ بے صبرے مت ہوں' لو جی' تعارف کروا دیتے ہیں۔ میرا نام مجید احمد جائی ملتانی ہے۔ سچی کہانیاں سے ابھی ابھی تعارف ہوا' سومنہ اٹھائے' سر جھکائے' اس کی محفل میں حاضری دینے چلا آیا۔ (جب منہ اٹھا ہو گا تو سر کیسے جھکے گا؟) محمد سلیم اختر' راولپنڈی اور صفدر علی حیدری' اوچ شریف کا بہت ممنون ہوں جنہوں نے سچی کہانیاں کی محفل میں دعوت دی۔ شکریہ جی' فائٹ انٹری دے رہا ہوں۔ مجھے نہیں علم کہ اس کی پالیسیاں کیا ہیں؟ امید ہے' گزرتی زندگی کے ساتھ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ سلیم فاروقی کا نام دیکھتے ہی جیو نیوز کے سلیم صافی کا چہرہ آنکھوں کی اسکرین پر گردش کرنے لگا۔ نجانے آپ کے بھائی یا آپ اُن کے بھائی ہیں؟ بہرحال دونوں کو خدا سلامت رکھے۔ (آمین!) (وہ میرے دینی بھائی ہیں اور صحافتی رشتے دار ہیں۔) سنائیے جی' کیسے ہیں؟ اچھا' مسکرا رہے ہیں' مسکراتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ ماہ اگست 2013ء کا سچی کہانیاں بھاگتے' ہانپتے' دوڑتے ہوئے انارکلی بازار سے لیا۔ انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھنے کے بعد بالآخر چھ اگست کو مل ہی گیا۔ جامِ شیریں پیتے' خارش سے نجات پاتے' نوبہار شربت' بھانجی کے لیے خریدتے آگے کو بڑھے۔ سچی کہانیاں کی جھلکیاں دیکھتے' سلیم فاروقی کے ''دکھاوا'' پر پہنچے' زبردست لکھا تھا لیکن جناب' جو بالکل روزے نہیں رکھتے' ان کو کیا کہیں گے؟ دکھاوے کی نماز یا روزے کسی نہ کسی طرح رب کے حضور سربسجود کراتے تو ہیں جو مسلمان ہوتے ہوئے بے پردگی' عبادات سے غافل' رب کے نافرمان' خون ریزی میں شامل ہیں' ان کا کیا بنے گا؟ جو سرِعام عزتیں پامال کرتے پھرتے ہیں' جو عورتوں کو نیلام کر رہے ہیں' میرے وطن میں خون خرابہ بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے۔ (آمین!) آنکھیں نم ہیں' کراچی کو دیکھ لو' کوئٹہ میں کیا ہو رہا ہے' اُف اللہ! ''احوال'' میں پہنچے تو سلیم فاروقی سے آغاز ہوتے ہوئے سرگودھا سے حافظ مون کا احوال پڑھتے آگے کو بڑھتے گئے۔ سب کے سب بہت اچھے تھے۔ سلیم اختر کا نام جب آیا تو اسلام آباد نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں ہونے والی ملاقات کے مناظر آنکھوں کی اسکرین پر گردش کرنے لگے۔ ان کی محبتیں' ان کی خدمت' رہنمائی' چاہت کا مقروض ہوں۔ شکریہ سر جی' کراچی سے آخری احوال ثمینہ ناز کا پڑھتے ہوئے حیرت زدہ ہوئے کہ سچی کہانیاں میں شمولیت ہونے کی آخری تاریخ صرف دس ہے۔ بہرحال احوال لکھنے والوں کو جامع جواب دینے کا سلسلہ بہت پسند آیا ہے۔ ایک ننھا سا مشورہ دوں گا کہ احوال کے اوپر انعامات کا سلسلہ ہونا چاہیے اور کم از کم تھوڑی مہلت دینی چاہیے کہ لیٹر ایک ماہ بعد شائع ہو سکتے ہیں۔ مطلب' اگست کا تبصرہ' اکتوبر تک شائع ہو سکتا ہے تاکہ تسلی سے پڑھ کر تبصرہ کیا جائے۔ آگے آپ کی مرضی۔ (تمہارا مشورہ قابلِ غور ہے۔) منزہ سہام کی لکھی شہید کی ڈائری بہت پسند آئی۔ بتاتا چلوں کہ اب بھی گاؤں میں میری امی جان سحری کے لیے اٹھاتی ہیں۔ چھوٹی بہن پراٹھے بناتی ہے۔ میرے گاؤں کی مسجدیں ابھی بھی آباد ہیں۔ وہی رونقیں موجود ہیں۔ قسمت کا مارا میں پردیسی ٹھہرا' لاہور میں جاب ہے اور سحری کے وقت چھوٹی بہن کال کر کے اٹھاتی ہے اور یوں میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور دوسرے دوستوں کو بھی اٹھاتا ہوں۔ البتہ ماں جی کے ہاتھوں کی چائے پینے کے لیے ترس رہا ہوں۔ اس ڈائری نے تو بہت کچھ

یاد دلوا دیا۔ ویل ڈن جی! گاؤں کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ جھونپڑوں سے محلات تک' نواز شریف کی سوانح عمری نہیں پڑھی۔ نیکی رائیگاں نہیں' ممتاز احمد کی پڑھی' خوب ویل ڈن۔ بے شک نیکی کا صلہ اللہ تعالیٰ کی ذات دیتی ہے۔ میری ماں جی یونہی تو نہیں کہتی کہ بیٹا! نیکی کر کے دریا میں ڈالتا جا۔ صلہ جانے' خدا جانے' وقت کی قلت کے باعث باقی تحریریں ابھی نہیں پڑھیں۔ عید قریب ہے۔ مکمل پڑھتا اور پھر تبصرہ کرتا تو لیٹ ہو جاتا' سو معذرت۔ برا نہ مانیے گا۔ اگلی دفعہ مکمل تبصرے کے ساتھ شامل حال ہوں گا۔ (تمہارا خط دلچسپ ہے' ہمیں انتظار رہے گا۔) سچی کہانیاں کے تمام سلسلے دل کو بھا گئے ہیں۔ انشاء اللہ' ریگولر پڑھ کر سیر حاصل تبصرہ بھی کروں گا۔ چھوٹی سی گزارش ہے کہ میں اپنی تین کہانیاں بنام ''خواہشوں کی منزل' جسے چاہا تھا'' اور ''تیرے انتظار میں'' ای میل کر چکا ہوں۔ کمپوزنگ کا شوق ہے' سو کمپوز کر کے ای میل کر دی تھیں۔ آپ صرف اتنا بتا دیجیے گا کہ اشاعت کے قابل ہیں کہ نہیں؟ کیا آپ کو مل گئی ہیں؟ اپنی تصویر احوال کے ساتھ نہیں بھیج رہا کیونکہ ارجنٹ موجود نہیں ہے۔ ہاں البتہ ای میل کر رہا ہوں۔ کہانیوں کی اشاعت سے ضرور آگاہ کیجیے اور کیا میں احوال اور باقی سلسلوں کے لیے خود کمپوزنگ کر کے میل کر سکتا ہوں یا بذریعہ ڈاک ہی سینڈ کروں؟ امید ہے' رہنمائی کریں گے۔ (اگر تمہارے لیے آسانی ہے تو کمپوز کر دیں ورنہ بہ ذریعہ ڈاک بھیج سکتے ہیں۔) باقی اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو ترقی کی تمام تر منزلیں طے کروائے۔ تمام اسٹاف اور مدیر کو لمبی عمر' صحت کی بادشاہی ہمیشہ قائم رہے۔ (آمین! ثم آمین!)''

✉ رانا محمد شاہد کی بورے والا سے آمد۔ ''اگست کا شمارہ عید کی پیشگی مبارک باد کے ساتھ ملا۔ ویسے ایک دلہن کے لیے نئے گھر جانا بھی عید کی طرح ہی ہوتا ہے۔ ٹائٹل والی حسینہ بھی شاید کچھ اپنے نئے گھر کو ذہن میں رکھ کر دھیمی سی مسکان لیے ہوئے ہے۔ اداریے میں آپ نے روزے سے دور ہوتی کیفیت اور روزے کی اصل روح کو نہ سمجھنے والوں کی حقیقت کو بیان کیا۔ ویسے افطار پارٹیوں پر اہتمام دیکھ کر اور کھانے کی زیاں دیکھ کر کتنی شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ روزہ تو اپنے سے غریب و نادار لوگوں کی کیفیت کو سمجھنے کا نام بھی ہے پھر اسلام کا درسِ سادگی کہاں چلا جاتا ہے؟ جہاں تک آپ نے موروثی بیماریوں کا ذکر کیا تو اس کے لیے اتنا ہی عرض کریں گے کہ ہم چند روپوں کی خاطر معمولی جھگڑے کی وجہ سے رکشا ڈرائیور کے پانی کے چھینٹے اڑانے پر اور ایک بہن دوسری بہن کو موبائل سم کارڈ کی وجہ سے قتل کر دیتے ہیں لیکن ہم لوگ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ بھی ارکان خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں گویا کہ ان ارکان پر عمل ہی سب کچھ ہے' باقی جو مرضی' کرتے پھریں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی تو ساری زندگی محبت' برداشت اور رواداری کا نمونہ تھی۔ انسانیت کا تو سب سے بڑا معیار ہی خوش اخلاقی و برداشت ہے۔ سوچیے ذرا' کیا یہ دونوں چیزیں ہمارے معاشرے سے مفقود نہیں ہوتی جا رہیں؟ احوال کے شروع میں آپ نے سیاست دانوں کی کرپشن کا ذکر کیا۔ میرے خیال میں پاکستانی سیاست دانوں کے لیے اس سے زیادہ شرم کا مقام کیا ہو گا کہ گزشتہ مہینے کے ایک سروے میں بتایا گیا کہ پاکستان دنیا کا 34 واں کرپٹ ترین ملک ہے جبکہ اس سروے میں بھارت کی پوزیشن 87 ویں ہے گویا کہ ہم بھارت سے تین گنا زیادہ بدعنوان ہیں۔ عبدالعزیز جی آ! ان چھوٹے جادوگردں اور عاملوں نے ہمارے معاشرے خصوصاً نوجوان بچیوں کے ساتھ جو کیا ہے' اس کے بعد انہیں نشانِ عبرت بنا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دوسرا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں چونکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ شعور کی بھی کمی ہے اس لیے بہت سی سادہ فہم لڑکیاں آسانی سے ان کے شکنجے میں آ جاتی ہیں۔ مریم شاہ بخاری نے دیویا بھارتی کے بارے میں جو لکھا' اس کا ایک دوسرا پہلو تو یہ بھی ہے کہ اگر مجھے دیویا بھارتی کی فلم دیکھنی ہو تو وہ بھی شوق سے دیکھوں گا۔ اگر کبھی اپنی کسی پسندیدہ اداکارہ کو قریب سے دیکھ لوں تو آٹوگراف سے بھی نہیں چوکوں گا۔ ہاں' عام حالات میں ان اداکاروں کو' کنجر' بھی کہوں گا اور اچھا بھی نہیں سمجھوں گا۔ کیا یہ عجیب اور افسوس ناک پہلو نہیں؟ ثمینہ ناز! میرے خیال میں مشرقی حسن کا نمونہ جولائی سے زیادہ اگست کا ٹائٹل تھا۔ ٹائٹل سے یاد آیا' آج کل آپ سرورق کی ماڈل کا نام نہیں دے رہے۔ شہید کی ڈائری میں رمضان المبارک کی سعادتوں و سوغاتوں کا خوب ذکر تھا۔ ویسے یہ خوشی کی بات ہے کہ اس دفعہ پورے ملک میں رمضان المبارک ایک ساتھ شروع ہوا تو امید ہے کہ انشاء اللہ' عید بھی سارا ملک اکٹھے ہی منائے گا۔ دعا ہے کہ یہی یکجہتی ہم سب لوگوں کو ایک قوم کی طرح بنا دے۔ اس دفعہ تیسری مرتبہ وزیراعظم منتخب ہو کر منفرد اعزاز حاصل کرنے والے میاں نواز شریف کی روداد سے راجہ محمود صاحب آگاہ کر رہے تھے۔ میاں نواز شریف کی زندگی جدوجہد سے بھرپور ہے' اسی جدوجہد کو کام میں لا کر وہ مشکل میں پھنسے عوام کے مسائل حل کریں تو بات بنے۔ محمد اقبال زمان صاحب کو اطلاع دے رہے ہیں کہ سچی کہانیاں تو ریگولر بورے والا آتا ہے مگر دوشیزہ نہیں۔ اگست کی مناسبت سے ''آزادی کی قیمت'' زبردست کہانی تھی۔ باقی لکھنے والوں کی تحریریں بھی اچھی تھیں۔ ''میری بہن' میری دشمن'' کہانی کا عنوان پڑھا تو چند دن پہلے کی نیوز یاد آ گئی جس میں ایک بہن نے دوسری بہن کو موبائل سم کارڈ کی وجہ سے قتل کر دیا۔ برداشت' رواداری اور وضع داری ختم ہونے لگے تو رشتوں کی پہچان کہاں رہتی ہے۔ اس دفعہ عمر خطاب نے بالی ووڈ کے سپر اسٹار شاہ رخ خان کی روداد بیان کی۔ پاکستانی اداکار ندیم' وحید مراد اور محمد علی اور بھارتی راجیش کھنہ اور نصیرالدین شاہ کی روداد کا بھی انتظار رہے گا۔ (تم جلد ہی ان کی کہانیاں بھی پڑھ سکو گے۔)''

✉ ثمر سے مور شاہد حسین کا اظہاریہ۔ ''انکل سلیم فاروقی! السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو خوشی' صحت' سلامتی' کامیابی اور کامرانی سے نوازے۔ (آمین!) آپ سے فون پر بات کرنے کا اعزاز ملا ہے' بہت خوشی ہوئی' دل کرتا ہے' ہر مہینے میں دو سے تین بار آپ سے باتیں کروں لیکن خیال آتا ہے کہ آپ بہت مصروف ہوں گے۔ (تم چار سے پانچ بار کر سکتے ہو شاہد!) انکل! ہے نا' اب بات کریں پرچے کی۔ سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ آپ کے لکھے اداریے ''دکھاوا'' نے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ خدا سب کو توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!) پھر محفلِ دوستاں کی طرف چھلانگ لگائی جہاں کچھ نئے دوست حاضر تھے۔ ویل کم! لیکن پرانے دوستوں کی شدت سے کمی محسوس ہوئی۔ خلیل جبار' ممتاز احمد' صدام حسین غازی' بشیر احمد بھٹی' محمد اسماعیل' آنٹی نصرت سرفراز' شفق شیکی' صفیہ سلطانہ' تحسین جونیجو' سدرہ انور علی' صائمہ سحر! آپ سدا خوش' سلامت' شاد و آباد رہیں۔ (آمین!) اف' ہمارا نام بھی انہی گناہ گاروں کی لسٹ میں شامل تھا۔ انکل عبدالعزیز جی! خدا کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ آپ کی بیٹی کو شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ (آمین!) انکل سلیم اختر! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ انکل! انتظار کتنا جان لیوا ہوتا ہے' یہ وہی جانتے ہیں جنہوں نے انتظار کیا ہو۔ ہم تو 22 جولائی سے صبح شام بک اسٹال کا چکر لگاتے تھے' آخر 27 کی دوپہر کو بھائی نے پرچہ لا کر دیا' تب سکھ کا سانس لیا۔ اوہ' میں بھی کیا لکھنے لگا ہوں۔ پیارے انکل! جنوری' جون میں ایک ایک اور جولائی میں دو کہانیاں بھیجی تھیں۔ امید ہے' آپ کو مل گئی ہوں گی۔ کیسی ہیں اور کب باری آئے گی؟ پلیز' پلیز' پلیز' بتا دیجیے گا۔ اب بغیر تبصرے کے اجازت چاہوں گا۔ انشاء اللہ' زندگی رہی تو اگلی بار مکمل تبصرہ کریں گے۔ آپ اپنا بہت بہت خیال رکھیں اور سارے دعاؤں میں یاد رکھیں۔ (تمہاری کہانیاں مل گئی ہیں۔ اب تک وہ عید اور رمضان المبارک کی مصروفیت کی وجہ سے پڑھی نہیں گئی ہیں۔ پڑھ کر جلد

ہی آگاہ کریں گے۔ خوش رہو!)

✉ سرگودھا سے ممتاز احمد کا اظہاریہ۔ ''محترم سلیم فاروقی! السلام علیکم! یقیناً سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کرام نے ماہِ صیام کی برکتوں رحمتوں کی بارش کو خوب سمیٹا ہوگا۔ اللہ رب العزت تمام مسلمانوں کی اس ماہ کی برکت عبادت اور دُعاؤں کی گونجتی صداؤں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ (آمین!) ماہِ اگست کا اعزازی شمارہ 26 جولائی کو موصول ہوا اور اُسی دن میری سالگرہ تھی اور یہ دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میری اپنی کہانی ''نیکی رائیگاں نہیں جاتی'' میری خیال آرائی اور آپ کی ڈائری کے لیے میں میرے حسنِ انتخاب کو سچی کہانیاں کے قیمتی صفحات میں جگہ دی گئی اتنی زیادہ جگہ دینے پر بہت شکریہ یوں لگا کہ آپ نے میری سالگرہ کا تحفہ دیا ہے۔ مجموعی طور پر تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ شہید کی ڈائری میں رمضان المبارک کے حوالے سے بہت ہی خوبصورت اور رُوحانی منظر پیش کیا گیا۔ نگہت انور کی ''چھپر چھاؤں'' بہت عمدہ کہانی تھی۔ جویریا سلیم کی ''آزادی کی قیمت'' ایک دلخراش کہانی تھی۔ محمد اقبال زمان کی ''مجھے قرار آجائے'' ایک عبرت انگیز اور سبق آموز کہانی تھی۔ فرزانہ نگہت کی ''دردِ دل کے وسیلے'' نے غمگین کردیا۔ موبائل کہانی ''میری بہن میری دشمن'' ایک ناقابلِ یقین کہانی تھی۔ ''بولتا دل تو قیامت ہوتی'' پڑھ کر دل دکھی ہوگیا۔ ملک صفدر عباس اعوان کی ''چودھویں کا چاند'' حیرت زدہ کردینے والی کہانی تھی۔ ام عادل کی ''قدرت کا انتقام'' نصرت سرفراز کی ''خوشیاں ماتم میں ڈھل گئیں'' تمثیلہ زاہد کی ''وہم نہیں حقیقت'' محمد اسلم آزاد کی ''میں نصیبوں والی ہوں'' شکیلہ انجم طارق کی ''اللہ پر بھروسا'' اور آصف شفیق کی ''پراسرار ڈاک بنگلا'' اچھی کہانیاں تھیں۔ میمونہ واحد کی اعترافی کہانی ''راہ کی دھول'' بہت بہترین کہانی تھی۔ خیال آرائی میں عبدالعزیز جی آ کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ اب اس پیغام کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ تمہارا اچھا وقت دنیا کو بتاتا ہے کہ تم کون ہو اور تمہارا برا وقت تمہیں بتاتا ہے کہ دنیا کیا ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضر ہوں گا اگر زندگی نے اجازت دی تو! اللہ سب کا نگہبان ہو!''

✉ کراچی سے افشاں علی کا اظہاریہ۔ ''انکل سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ کا رمضان المبارک بھی اچھا گزرا ہوگا اور عید بھی! (افشاں! عید کیسی گزری یہ تو تمہیں ''احوال'' کے ابتدائی حصے سے معلوم ہوجائے گا اور روزے اس کا احوال تم گزشتہ ماہ کے اداریے میں پڑھ چکی ہو۔) انکل! یہاں کوئی ولی عہد بنا ہوا ہے کوئی کنگ کوئی کوئین کیا یہ عہدے کسی ٹھیلے پر بک رہے ہیں؟ (ہمیں بھی ایسا ہی لگ رہا ہے افشاں!) انکل! میرے پاپا بتاتے ہیں کہ بہت پہلے ہمارے محلے میں ایک بوڑھا آدمی ہوا کرتا تھا جس نے انگریزوں کے دور میں آرمی میں جاب کی تھی۔ وہ کسی وجہ سے پاگل ہوگیا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد سب سے یہی کہتا تھا کہ میں جرنل رومیل ہوں میں جرنل رومیل ہوں۔ لوگ اس کی باتوں پر ہنستے تھے تو وہ ناراض ہوجاتا تھا۔ اب مظہر عباس صاحب بھی کہیں ناراض نہ ہوجائیں۔ وقت چونکہ قلیل ہے اس لیے پرچے پر تبصرہ نہیں کررہی ہوں۔ آیندہ ماہ دیکھوں گی کہ کون ملکہ ہے اور کون بادشاہ۔ (چیلنج کررہی ہو افشاں!)

اب تک یعنی 13 راگست تک ہمیں یہی خطوط موصول ہوئے۔ اس کے بعد آنے والے خطوط میں اگر کوئی بہت دلچسپ خط ہوا تو اُسے آیندہ پرچے میں شامل کیا جائے گا۔ اس وقت اجازت دیں۔ ملتے ہیں ایک بریک کے بعد بہ شرطِ زندگی۔

آپ سب کی دُعاؤں کا طالب
سلیم فاروقی

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو

ثمینہ خضر راجپوت

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

سرگودھا سے تحفہ خاص

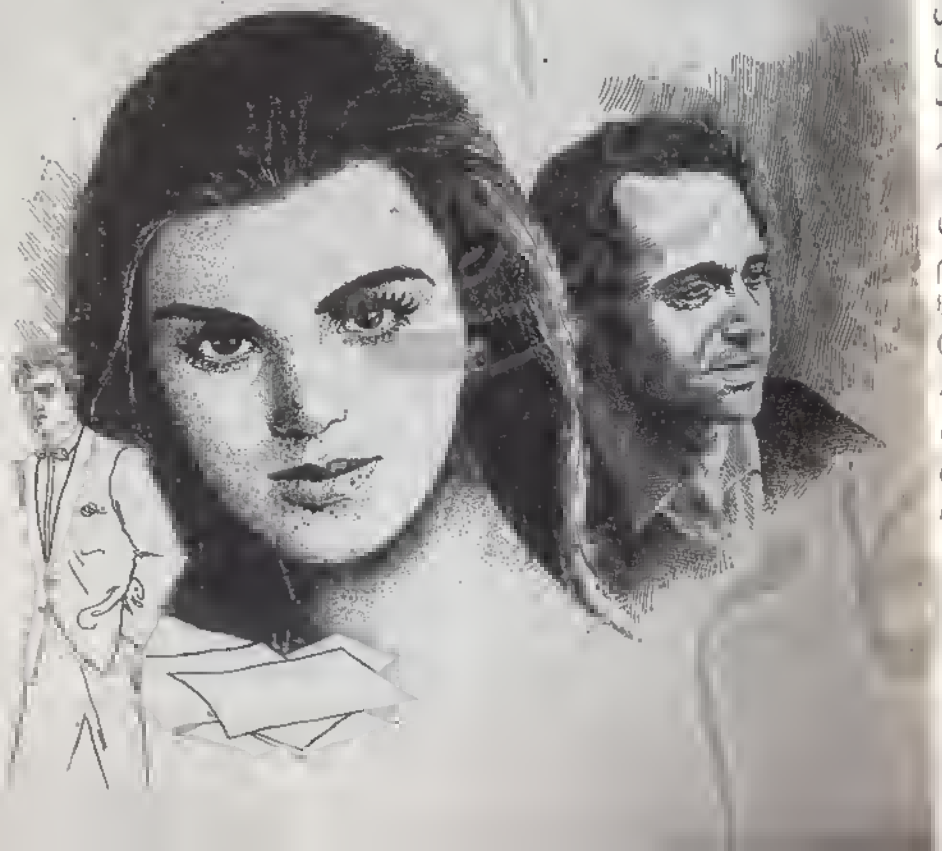

میرے دادا حیدرآباد (دکن) کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور میرے ڈیڈی شہریار خان اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ویسے تو اُن کے میرے والد صاحب کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی تھی مگر طاعون کی موذی وبا کی بدولت وہ اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ ڈیڈی چونکہ ان دنوں دکن میں نہیں تھے اس لیے بچ گئے تھے۔ میرے دادا نے اپنی اکلوتی اولاد کو سینے سے لگالیا اور قیام پاکستان سے کئی برس قبل ہی اپنی تمام جاگیر فروخت کرکے لاہور چلے آئے تھے۔ یہاں پر آکر انہوں نے دو ٹیکسٹائل ملز اور ایک شوگر مل خرید لی۔ کچھ رقم کے مختلف کمپنیوں کے شیئرز خرید لیے تاکہ مالی طور پر ہمارا رہن سہن پہلے جیسا ہوجائے۔ رہنے کے لیے چھ کنال پر بنی ہوئی کوٹھی خریدی گئی۔ کوٹھی بہت خوب صورت تھی۔ کوٹھی کے بڑے بڑے دالان، کشادہ کمرے اور بڑے سے لان نے کسی حد تک ہمیں اپنی آبائی حویلی کی یاد بھلانے پر مجبور کردیا۔

جب اچھی طرح ہمارے قدم جم گئے تو دادا جان کو اپنے اکلوتے بیٹے شہریار خان کی شادی کا خیال آیا۔ شہر کے تمام معزز گھرانوں کی لڑکیاں دیکھی جانے لگیں اور قرعۂ فال اسٹار وولن ملز کے مالک چوہدری نورزمان کی بیٹی فارینہ زمان کے نام نکلا۔ چوہدری نورزمان بھی بیٹی کے لیے اتنا اچھا رشتہ پاکر بہت خوش تھے۔ منگنی کی رسم خوب دھوم دھام سے ادا کی گئی اور اس کے فوراً بعد شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ چھ ماہ کی مسلسل تیاریوں کے بعد وہ مبارک دن آپہنچا جب شہریار خان دلہا بن کر چوہدری نورزمان کے گھر جا پہنچے اور بڑے ارمانوں اور امنگوں کے ساتھ دلہن کو گھر لے آئے۔ یہ شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی تھی کہ لوگ مدتوں اس شادی کا تذکرہ کرتے رہے۔

شادی کے کچھ روز بعد ڈیڈی، ممی کو لے کر یورپ چلے گئے۔ ڈیڈی کی عدم موجودگی میں دادا جان خود تمام بزنس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ تین ماہ بعد ڈیڈی واپس آئے اور انہوں نے پھر سے کاروبار سنبھال لیا۔ ڈیڈی اس شادی سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ دادا جان اور دادی جان بھی بیٹے، بہو کو خوش دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ شادی کے دوسرے سال جب میں پیدا ہوا تو سب کا مارے خوشی کے کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ صدقے خیرات ہوئے اور بہت دھوم دھام سے عقیقے کی رسم ادا کی گئی۔ دادا جان کی خواہش پر میرا نام عثمان علی خان رکھا گیا تھا۔ میں سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ممی، ڈیڈی، دادا جان اور دادی جان کی محبتوں تلے دن گزر رہے تھے۔ جب میں چار سال کا ہوا تو مجھے اسکول میں داخل کردیا گیا۔ میرے لیے ایک انگریز گورنس مارتھا کا بندوبست بھی کیا گیا۔ سسٹر مارتھا کار میں ہر روز میرے ساتھ اسکول جاتی اور مجھے کلاس روم میں چھوڑ کر چلی آتی۔ اسکول میں بھی شفیق اساتذہ کی رہنمائی میں، میں تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

تمام ذمے داریوں سے نمٹ کر دادا جان اور دادی جان نے حج کا قصد کیا اور ممی، ڈیڈی کو ڈھیروں نصیحتیں کرنے کے بعد خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے چلے گئے۔ ڈیڈی کی مصروفیات مزید بڑھ گئیں۔ صبح سے شام تک انہیں مصروف رہنا پڑتا۔ دادا جان کی عدم موجودگی کی وجہ سے اب تمام کاروباری ذمے داریاں ڈیڈی پر تھیں۔ زیادہ محنت نے انہیں جلد ہی تھکا دیا۔ انہیں ہر وقت ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کی ہدایت کی اور ساتھ ہی کسی صحت افزاء مقام پر جانے کا مشورہ دیا۔ ممی نے ڈاکٹر کی ہدایات پر پورا عمل کیا اور تمام کام وہ اپنے منیجر جہانگیر علی کے حوالے کرکے مجھے اور ڈیڈی کو ساتھ لے کر کشمیر چلی گئیں۔ وہاں ہمارا قیام ریسٹ ہاؤس میں تھا۔

کشمیر کے خوب صورت نظارے اپنے اندر فطرت کا تمام حسن سمیٹے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی برف باری نے تمام ماحول کو اور بھی دلکش بنادیا۔

سارا سارا دن میں اور ممی گھومتے پھرتے رہتے۔ اونچے نیچے پربت، اُن پر جمی ہوئی سفید برف، جب اُس پر سورج کی ابتدائی شعاعیں پڑتیں تو پوری وادی روپہلی ہوجاتی، یوں لگتا جیسے ساری وادی چاندی کی ہوچکی ہے۔ ہرے بھرے دلفریب نظارے، اونچے نیچے درخت، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ! یہ فطرت کے حسین نظارے ہمیں بے پناہ خوشی اور مسرت بخشتے۔ سیروتفریح اور مکمل آرام نے ڈیڈی کی صحت پر خوش گوار اثر ڈالا۔ انکل جہانگیر وقتاً فوقتاً فون پر مشورے کرتے رہتے تھے۔ ہم نے وادیٔ کشمیر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ سیروتفریح سے ڈیڈی کی صحت بھی بہتر ہوگئی تھی۔ ایک مہینے کے قیام کے بعد ہم واپس آگئے۔ ڈیڈی کی غیر حاضری میں جہانگیر علی نے تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالا تھا۔ ڈیڈی نے خوش ہوکر اُس کی تنخواہ میں اضافہ کردیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد ڈیڈی کی طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ علاج کے باوجود وہ روز بہ روز کمزور ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹر کے مشورے پر ڈیڈی کا مکمل چیک اپ کرایا گیا۔ ڈاکٹرز کی رپورٹ نے ہمارے حواس گم کردیے، یوں محسوس ہورہا تھا گویا قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو، آسمان ٹوٹ کر سر پر آگرا ہو۔ ڈیڈی کو کینسر تھا اور وہ بھی اس حد تک پھیل چکا تھا کہ اب علاج ممکن نہ تھا لیکن ممی نے ہمت نہیں ہاری اور ڈیڈی کو لے کر لندن چلی گئیں۔

میرے پاس سسٹر مارتھا تھی۔ میں کم عمر ہونے کے باوجود اتنا ذہین تھا کہ حالات کی سنگینی اور آنے والے وقت کی قیامتوں کا اندازہ کرسکتا تھا۔ ممی نے مجھے سختی سے ہدایت کردی تھی کہ دادا جان اور دادی جان کو ڈیڈی کے بارے میں علم نہ ہونے پائے۔ ویسے بھی اب وہ لوگ واپس آنے والے تھے۔ میرے لبوں پر دن رات ڈیڈی کی زندگی کی دعائیں تھیں۔ تنہائیوں نے میرے آنسو بھی خشک کردیے تھے۔

بالآخر دادا جان اور دادی جان لوٹ آئے۔ انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے صرف جہانگیر انکل کو بھیجا جارہا تھا لیکن ضد کرکے میں بھی انکل جہانگیر کے ساتھ چلا گیا۔ جیسے ہی دادا جان اور دادی جان کی شکلیں نظر آئیں، میرے آنسو بری طرح بہنے لگے۔ انہیں دیکھ کر یہ خواہش شدت سے ابھر رہی تھی کہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کردوں پھر واقعی وہ سامان کلیئر کراکر جیسے ہی باہر آئے، میں نے اُن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

میری بڑھتی ہوئی گریہ وزاری پر وہ گھبرا گئے اور اُن کے بے حد اصرار پر انکل جہانگیر نے انہیں تمام صورتِ حال بتادی۔ ڈیڈی کی شدید بیماری کا سن کر اُن کا رنگ زرد پڑگیا پھر دادا جان اور دادی جان نے وہیں سے لندن جانے کا فیصلہ کرلیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد لندن کی فلائٹ پر سیٹیں مل گئیں اور وہ لندن پرواز کرگئے۔

میں اور انکل جہانگیر گھر لوٹ آئے۔ دادا جان اور دادی جان کو گئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ ہمیں ایک ٹیلی گرام موصول ہوا، اسے پڑھ کر میرے حواس گم ہوگئے، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ڈیڈی کا آپریشن کامیاب نہیں ہوسکا تھا اور وہ ہمیں داغِ جدائی دے کر اس دنیا کو چھوڑ گئے تھے۔ جوان بیٹے کی موت کی خبر دادا جان کے لیے زہر

قاتل ثابت ہوئی۔ اُن کا دل بیٹے کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور خاموش ہوگیا۔ دادی جان شوہر اور بیٹے دونوں کی میتیں دیکھ کر سکتے کے عالم میں تھیں۔

ممی کو خدا نے بے پناہ حوصلے سے نوازا تھا۔ وہ آج شام کی فلائٹ سے شوہر اور سسر کی میتیں اور سکتے کی حالت میں زندہ درگور ساس کو لے کر پاکستان پہنچ رہی تھیں۔ ممی کے آنے سے پہلے یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ خاندان کے اور جان پہچان کے تمام لوگ جمع ہو چکے تھے۔ جس وقت ممی گھر پہنچیں' ایک قیامت کا منظر تھا۔ وہ مجھے لپٹا کر یوں رو رہی تھیں جیسے اُن کے آنسوؤں سے زمین آسمان سب بہہ جائیں گے۔

دادی جان ابھی تک سکتے کی حالت میں تھیں۔ انہیں رُلانے کی بہت کوشش کی گئی مگر بے سود..... اُن کی آنکھوں میں آنسو نہ آسکے اور دادا جان اور ڈیڈی کی تدفین کے دوسرے روز وہ بھی خاموشی سے اُسی سکتے کے عالم میں وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں۔

پے در پے اموات نے مجھے سہما کر رکھ دیا۔ گھر کے در و دیوار پر' ہر طرف مجھے موت کے فرشتے کی آہٹیں سنائی دیتیں۔ اب اس دنیا میں صرف ممی ہی میرا سہارا تھیں۔ گھر میں ہر طرف ایک سناٹا چھایا رہتا۔ تمام کاروبار انکل جہانگیر سنبھال رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ کچھ پوچھنے یا کسی چیز پر دستخط کرانے گھر آجاتے تھے۔

ممی کی عدت ختم ہو چکی تھی۔ اب انہوں نے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی اسکول جاتا تھا۔ وہاں سے واپسی پر کھانا وغیرہ کھا کر کھیلنے چلا جاتا۔ حالات اور وقت نے مجھے اپنی عمر سے کہیں زیادہ شعور اور سنجیدگی عطا کر دی تھی۔ ایک بات میں

تعاون

بھارت سے شائع ہونے والا' پنجابی سماچار' اخبار دنیا کے کئی ملکوں میں جاتا ہے جس میں افریقہ بھی شامل ہے۔ ایک مرتبہ اس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر شری گل اخبار کی سرکولیشن میں اضافے کے لیے دورہ کرتے ہوئے افریقہ بھی گئے اور اپنے عزیز کی معرفت سالانہ خریدار بناتے رہے۔ ایک روز ایک ہندوستانی سکھ ٹھیکے دار سے سالانہ ڈھائی سو روپے چندہ وصول کر کے اسے سالانہ خریدار بنایا اور ساتھ ہی یہ گزارش کی کہ اپنے کسی اور واقف کار' دوست' عزیز یا رشتے دار کو بھی سالانہ خریدار بننے پر آمادہ کر کے اسے خریدار بنوا دیں چنانچہ وہ انہیں ساتھ لے کر ایک اور سکھ دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور ساتھ ہی زور سے آواز دے کر پکارا۔

''اوئے بنل سنگھا' اوئے بنل سنگھا۔'' گھنٹی اور پکار کی آواز سن کر بنل سنگھ فوراً اوپر کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا اور پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟ بہت جلدی میں لگتے ہو؟''

شیری گل کے ساتھی سردار نے گل صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو گل جی آئے ہیں۔ 'پنجابی سماچار' کے ایڈیٹر ہیں۔ فوراً ڈھائی سو روپے لے کر نیچے آؤ اور اخبار کے سالانہ خریدار بن جاؤ۔''

بنل سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے اوپر ہی سے جواب دیا۔ ''مگر مجھے تو پنجابی پڑھنی نہیں آتی' میں پنجابی اخبار کا سالانہ خریدار بن کر کیا کروں گا؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو میرے یار' جہاں سے میں اپنا اخبار پڑھواتا ہوں' وہاں سے تمہارا اخبار بھی پڑھوا دیا کروں گا' بس تم جلدی سے ڈھائی سو روپے لے کر نیچے آجاؤ' باقی فکر میری ہے' تمہاری نہیں۔'' گل جی کے سفارشی نے کھنک سے جواب دیا۔

'باتیں سکھ متروں کی' از افتخار مجاز.
مطالعہ فرحت سپنا.

شدت سے نوٹ کر رہا تھا کہ انکل جہانگیر کا گھر آنا جانا بہت بڑھ گیا تھا۔ انکل جہانگیر جانے کیوں اب مجھے زہر لگنے لگے تھے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ انکل جہانگیر کی وجہ سے ممی نے مجھ پر توجہ کم کر دی ہے۔ میرے حصے کا سارا وقت اب وہ انکل جہانگیر کے ساتھ گزارتی تھیں۔ میرے دل میں انکل جہانگیر کے خلاف غصے اور نفرت کا لاوا بھڑک رہا تھا۔ انکل جہانگیر کو بھی شاید اس بات کا احساس ہو گیا تھا' اب وہ جب بھی آتے' میرے لیے کھلونے اور ٹافیاں وغیرہ لے کر آتے۔ میں اُن کے سامنے ہی کھلونوں کو چیخ کر توڑ دیتا اور ٹافیاں پیروں سے کچل دیتا۔ ممی میرا رویہ دیکھ کر خفیف ہو جاتیں' کبھی ڈانٹ دیتیں' کبھی دو تین تھپڑ میرے رخساروں پر جڑ دیتیں اور میں اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے دکھ سے سوچتا رہ جاتا کہ یہ وہی رخسار ہے جس پر ممی کے بے شمار بوسے ثبت ہیں۔ ممی کے تلخ رویے نے مجھے ذہنی طور پر پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اندر ہی اندر میں ٹوٹتا جا رہا تھا۔ ان تمام واقعات نے مجھے بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔ تیز بخار نے مجھے حواسوں سے دور کر دیا تھا۔ اس بخار کے عالم میں سسٹر مارتھا ہی تھیں جو میرا خیال رکھتی تھیں۔ ممی کو آفس اور انکل جہانگیر سے جو وقت ملتا' وہ میرے پاس گزارتیں۔ اس سے پہلے میں بیمار ہوتا تھا تو ممی تمام کام چھوڑ کر میرے سرہانے بیٹھی رہتی تھیں۔ جب تک میں صحت مند نہ ہو جاتا' وہ میرے پاس سے نہ ہٹتیں مگر اب کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انہیں مجھ سے محبت آج بھی تھی مگر وقت نے اُن کی محبت کو تقسیم کر دیا تھا۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ کبھی صحت یاب نہ ہوں' بیماری بڑھتی ہی جائے اور میں بھی ڈیڈی' دادا جان' دادی جان کے پاس چلا جاؤں مگر اس زندگی کو کیا کہیں' جینا نہ بھی ہو' تب بھی جینا پڑتا ہے' میں بھی ٹھیک ہو گیا۔

ممی نے میری صحت یابی کی خوشی میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔ سارے رشتے دار' دوست احباب سب کو مدعو کر دیا۔ میرے ننھیال والے بھی سب آئے ہوئے تھے اور پھر اس تقریب میں ممی نے وہ اعلان کر دیا جس کا کم از کم مجھے پہلے سے اندازہ تھا مگر یہ وقت اتنی جلدی آ جائے گا' اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

ممی نے انکل جہانگیر کو میرے ڈیڈی کی جگہ دے دی یعنی انکل جہانگیر سے شادی کر لی۔ انکل جہانگیر کے خلاف میرے دل میں نفرت دوچند ہو گئی۔ اس شخص نے مجھ سے میری شفیق ماں چھین لی تھی اور میں اس دنیا میں بے سہارا ہو گیا تھا۔

نانا جان بھی ممی کے اس فیصلے سے بہت چراغ پا ہوئے اور انہوں نے ممی سے قطع تعلق کر لیا۔

ڈیڑھ سال بعد ممی کی گود میں ثوبی آ گئی۔ ممی اور بھی مصروف ہو گئیں۔ ثوبی بہت پیاری سی بچی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ یہ میری چھوٹی سی بہن ہے۔ اسی احساس نے مجھے بے پناہ خوشی اور فخر بخشا تھا اور میں ایک پیاری سی بہن کا بڑا بھائی ہوں۔

ایک دن اسی جذبے سے مغلوب ہو کر میں ثوبی کو اٹھانے آگے بڑھا تو انکل جہانگیر نے کہا۔ ''سنبھل کر لینا' یہ کھلونا نہیں ہے۔''

میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پیچھے ہو گئے اور میں ثوبی کو گود میں لینے کی خواہش کے باوجود وہاں سے ہٹ گیا۔ اسی طرح کے کئی واقعات ہوئے جن سے انکل جہانگیر اور میرے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ ممی نے بہت کوشش کی کہ میرے اور اُن کے درمیان صلح ہو جائے مگر نہ میری نفرتیں کم ہو سکیں اور نہ وہ دشمنی سے باز آئے۔ میرے اور انکل جہانگیر کے درمیان اختلافات بڑھتے ہی جا رہے تھے اور پھر پاپا ہی کے ایما پر ممی نے مجھے حسن ابدال ہوسٹل میں داخل

کرا دیا۔ تنہا تو میں گھر پر بھی لیکن یہاں پر ایک ایک پل بھاری لگتا تھا لیکن سر رچرڈ کے پرشفقت انداز اور مسز ایمل کے ممتا بھرے سلوک نے پھر مجھ میں جینے کی امنگ پیدا کر دی۔

ممی کا فون ہر ہفتے آجاتا تھا پھر وقت کے ساتھ ساتھ فون کے درمیان وقفہ بڑھتا گیا۔ میں نے بھی انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ممی کی گود میں ثوبی کے بعد نعمان آ گیا تھا۔ کبھی کبھار ممی مجھ سے ملنے آجاتیں البتہ ہر ماہ رقم کا چیک مجھے پابندی سے مل جاتا۔

ڈیڈی کی موت سے پہلے سب کی بھرپور توجہ نے کبھی مجھے محسوس ہی نہ ہونے دیا تھا کہ تنہائی کیا ہوتی ہے۔ دن رات ممی، ڈیڈی، دادا جان، دادی جان سب کی محبتوں کی سائے تلے میں خوشگوار دن گزار رہا تھا مگر ان چھ ماہ کے اندر ہی میری زندگی نے پلٹا کھایا تھا اور میں آسمان کی بلندی سے زمین کی پستیوں میں آ گیا تھا۔ ہوسٹل میں دن تو پڑھائی اور کھیل کود میں گزر جاتا مگر راتیں جس طرح میں آنکھوں میں کاٹتا تھا، وہ کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ ممی کی گود کی گرمی مجھے بے کل کیے رکھتی۔ سونے سے پہلے وہ پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتیں۔ اب اکیلے بستر پر لیٹ کر میں سب کو یاد کر کے تڑپ تڑپ کر روتا تھا اور صبح وہی ایک ہنستا مسکراتا بچہ بن جاتا تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ میری اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو، کتنی کراہیں چھپی ہیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور تمام بچے اپنے اپنے گھروں کو جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ممی نے نوکر کو بھیج کر مجھے بھی بلوا لیا۔ شام کو جب انکل جہانگیر آفس سے آئے تو مجھے دیکھ کر ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اُن کا رویہ مجھ سے نہایت تحقیر آمیز اور جارحانہ تھا۔ بات بات پر مجھے ٹوکتے کہ قالین پر گندے جوتے لے کر کیوں چڑھے ہو؟ گملے میں سے پھول کیوں توڑا؟ وہ اپنے دونوں بچوں کی شرارتوں کا ذمے دار بھی مجھے ہی ٹھہراتے تھے۔ میں انہیں مجبوراً پاپا کہنے لگا تھا۔

ایک دفعہ ثوبی باہر سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی کہ اچانک پاؤں رپٹ جانے کی وجہ سے وہ مجھ سے آ ٹکرائی اور میں دوسری سمت گرا۔ میرا ایک ہاتھ میز پر پڑے کٹ گلاس کے بلوری گل دان پر پڑا اور وہ ایک چھناکے سے زمین پر گر کر ہزاروں ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ شیشے کا ایک ٹکڑا میری ہتھیلی میں پیوست ہو گیا تھا۔ خون سے میرا ہاتھ سرخ ہو گیا تھا۔

پاپا زہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر اُن کا ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ ”اندھے ہو، نظر نہیں آتا کیا؟ اتنا قیمتی گل دان توڑ دیا۔“ وہ غصے سے چیخ کر بولے۔

”اندھا میں نہیں ہوں، ثوبی ہے جو مجھ سے آ کر ٹکرائی تھی۔“ میں نے بھی تلخ لہجے میں سلگتے ہوئے کہا۔

”بدبخت، زبان چلاتا ہے۔“ وہ غصے میں میری طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑتے، ممی درمیان میں آ گئیں اور مجھے کمرے میں لے گئیں۔

ثوبی اور نعمان کی گورنس بھی سسز مارتھا تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کے زخم کی ڈریسنگ کی۔ کافی گہرا زخم تھا لیکن اس سے کہیں گہرے زخم میری روح پر لگے ہوئے تھے، ان کی ڈریسنگ کون کرتا؟

رات کو جب میں بستر پر لیٹا ہوا تھا، ممی میرے کمرے میں آئیں اور بے اختیار مجھے سینے سے لگا کر سسکنے لگیں۔ اُن کے گرم گرم آنسو میری گردن پر گر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا، میرے زخم، میرے دکھ، گلے، شکوے، سب کو ان آنسوؤں نے ختم کر دیا ہے۔ ممی شاید کچھ دیر اور میرے پاس بیٹھتیں مگر پاپا نے باہر سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ممی میرے ماتھے پر بوسہ دے کر چلی گئیں اور برسوں کی پیاسی رُوح اس بوسے کے لمس سے سرشار ہو گئی۔

چھٹیاں ختم ہونے تک میرے اور پاپا کے درمیان کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ میں جلد از جلد چھٹیاں ختم ہونے کی دُعائیں مانگ رہا تھا کیونکہ یہ گھر اب میرے لیے کسی جہنم سے کم نہ تھا۔ یہ میری زندگی کی آخری چھٹیاں تھیں جو میں نے اپنے گھر پر گزاری تھیں۔ اس کے بعد سال پر سال گزرتے چلے گئے، نہ ممی نے کبھی خواہش ظاہر کی اور نہ کبھی میں ہی گھر گیا، بس کبھی کبھار ممی مجھ سے ملنے آجاتیں۔

دن اسی طرح گزرتے گئے اور میں نے میٹرک کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کر لیا۔ میں نے گھر پر اس کی اطلاع نہیں دی۔ اخبارات میں میرے انٹرویو اور تصاویر شائع ہوئیں تو ممی کو اخبارات ہی کے ذریعے میری شاندار کامیابی کا علم ہوا اور وہ مٹھائی اور ڈھیر سارے گفٹ لے کر آ گئیں۔ ثوبی اور نعمان بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ ماں باپ دونوں کی بھرپور محبت نے انہیں بے پناہ اعتماد بخشا تھا۔ ان کے برعکس میں ممی کی محبتوں سے محروم، حرماں نصیب شخص تھا۔ بہ ظاہر میں بڑا مضبوط اور حوصلہ مند نظر آتا تھا لیکن میرے اندر محبت کی سوکھی ہوئی شاخ ہریالی کے لمس کے لیے ترس رہی تھی۔

میٹرک کے بعد میں نے انجینئرنگ کالج میں ایڈمیشن لیا۔ میرے مرحوم والد کے دوست انکل شیرازی کالج کے نزدیک ہی رہتے تھے۔ ممی نے اُن سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔ انکل شیرازی مجھے بے حد چاہتے تھے۔ انہیں مجھ سے اپنے دوست کی شباہت نظر آتی تھی اور مجھے ان کے وجود سے اپنے ڈیڈی کی مہک آتی تھی۔ انکل شیرازی ایک بہت بڑے زمیندار تھے، ویسے تو میں ہوسٹل میں رہتا تھا لیکن میری اکثر شامیں انہی کے گھر پر گزرتی تھیں۔

اُس روز موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ دوپہر ہی سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سرمئی بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اتنے خوب صورت موسم میں مجھے کمرے میں رہنا بالکل ناپسند تھا۔ میں تیار ہو کر نکلنے ہی والا تھا کہ چپراسی نے کسی مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔

جب میں وہاں پہنچا تو انکل شیرازی کے ہمراہ ایک خوب صورت لڑکی کو اپنا منتظر پایا۔ انکل شیرازی نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔ ”یہ میری بیٹی نازلی ہے۔“ پھر وہ نازلی کی طرف مڑے۔ ”اور نازلی، یہ میرے عزیز دوست کا بیٹا ہے عثمان علی!“

معصوم سی نازلی نے بے نیازی سے چیونگ گم چباتے ہوئے ہیلو کہا۔

نازلی کو دیکھ کر جانے کیوں یہ خواہش شدت سے ابھری کہ اس لڑکی سے دوستی کر لوں۔ انکل مجھے نازلی کی سالگرہ میں مدعو کرنے آئے تھے۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ میں سالگرہ میں ضرور آؤں گا۔

مجھے نازلی کے لیے سالگرہ کا تحفہ بھی لینا تھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا خریدوں؟ اسی کشمکش میں سالگرہ کا دن آ گیا۔ میں خالی الذہنی کی حالت میں بازار میں گھوم رہا تھا کہ اچانک میری نظر سنار کی دکان کے ایک شوکیس پہ پڑی جس کے اندر نفیس سی ایک چین میں خوب صورت سا دل جگمگا رہا تھا۔ مجھے نازلی کے لیے اس سے بہتر تحفہ نظر نہ آیا۔ میں نے وہی چین خرید کر جیب میں ڈالی۔ مقررہ وقت پر میں تیار ہو کر انکل شیرازی کے گھر جا پہنچا۔ وسیع و عریض

لان میں سالگرہ کی تیاری کی گئی۔ شہر کے بڑے بڑے افسر اور مشہور ہستیاں مدعو تھیں۔ نازلی سفید حیدرآبادی لباس میں ملبوس تھی۔ اُس کی سفید دودھ ایسی رنگت اور سبز آنکھیں خوشی سے جگمگا رہی تھیں۔ میں نے بند ڈبیا میں چین اُس کے حوالے کردی۔

''شکریہ عثمان!'' اُس کے لب دھیرے سے وا ہوئے اور میری سماعت میں جیسے رَس گھل گیا۔

نازلی اور میں غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ نازلی کی محبت نے میری محرومیوں کی بڑی حد تک تلافی کردی تھی۔ وہ جونیئر کیمبرج سے سینئر کیمبرج میں آگئی۔ ہمارے دلوں کے درمیان بھی فاصلے بہت کم ہوگئے تھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی محبتوں میں سرشار تھے۔

ساون کی پہلی بارش تھی بُوندیں ہر طرف جلترنگ بجارہی تھیں' مست ہوائیں ہر طرف مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلا رہی تھیں' ایسے میں میرا دل نازلی کے سنگ گھومنے کو مچل اٹھا۔ میں نے اپنے دوست تنویر سے اُس کی موٹر سائیکل مانگی اور نازلی کے گھر چل دیا۔ بارش اب کم ہوکر بوندا باندی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ نازلی اپنے کمرے میں بیٹھی دریچے سے بارش کا نظارہ کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کہاں کے ارادے ہیں؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''برسات کا لطف اٹھائیں گے' آجاؤ' باہر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنستی ہوئی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ صاف ستھری' سیاہ تارکول کی سڑک پر ہلکے ہلکے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے نازلی کے ساتھ سیر کا مزہ آگیا۔

ہم دونوں ہلکی ہلکی بوندا باندی میں بھیگ رہے تھے۔ تیز تیز ہوا کے جھونکے پھولوں کی خوشبو سے بھرے آرہے تھے۔ بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مست کیے دے رہی تھی۔ واپس ہونے کو میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ یوں ہی ہمیشہ گھومتے رہیں اور اس سفر سے کبھی واپسی نہ ہو۔ کافی دیر تک اسی طرح گھومتے پھرتے رہے پھر میں نازلی کو اُس کے گھر ڈراپ کرکے آگیا۔ تنویر میرا منتظر تھا۔ ''یار عثمان! بہت دیر لگا دی' موٹر سائیکل خراب تو نہیں ہوگئی تھی؟'' تنویر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں یار' موٹر سائیکل تو خراب نہیں ہوئی تھی البتہ ہواؤں میں پرواز کررہی تھی۔'' میں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

''کوئی پری چہرہ حسینہ تو تمہارے ساتھ نہیں تھی؟'' تنویر نے شرارتی انداز میں مسکرا کر کہا۔

''ہاں یار' تھی تو ایک حسینہ۔'' میں نے جواب دیا۔

تنویر میرے اس اعتراف سے اچھل پڑا۔

''ہوں..... یاروں سے اتنی پردہ داری' سیدھی طرح نام پتا بتا دو اور ساتھ ہی پورے گروپ کو ٹریٹ دو ورنہ.....'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''ورنہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ورنہ تمہاری امی جان کو اطلاع کردی جائے گی۔'' تنویر نے کہا۔

امی جان کے تذکرے پر میرے چہرے پر سنجیدگی چھاگئی۔

تنویر کو بھی شاید احساس ہوگیا تھا اس لیے وہ بھی جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ ''اچھا عثمان! اب میں چلتا ہوں' صبح کالج میں ملاقات ہوگی۔''

تنویر نے ممی کا تذکرہ کرکے میرے زخموں کو پھر سے ہرا کردیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے بھلائی ہوئی تلخ

یادیں پھر سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ممی اگر چاہتیں تو میرے اور اپنے درمیان فاصلہ کم کرسکتی تھیں لیکن انہوں نے اپنا سارا پیار' ساری چاہت ثوبی اور نعمان کے لیے وقف کردی تھی اور میرے حصے میں تنہائی' محرومی' اداسی اور ہر ماہ بھیجا ہوا بنک ڈرافٹ ہی آیا تھا۔ میرے نام بڑی بڑی رقمیں بھیجنے میں بھی شاید پاپا کی کوئی چال تھی' شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں اتنا پیسا پاکر آوارگی میں پڑ جاؤں لیکن زندگی کے ابتدائی چند سالوں کے علاوہ میں نے اتنے دکھ دیکھے تھے کہ میں ذہنی طور پر اپنی اصل عمر سے کہیں بڑا ہوگیا تھا۔ اچھے برے راستے کی مجھے بڑی پہچان ہوگئی تھی۔ زندگی کی کانٹوں بھری راہ گزر پر چلتے چلتے میرے پاؤں فگار ہوگئے تھے کہ اچانک میری زندگی میں نازلی داخل ہوگئی جس کی محبت نے میرے قدموں تلے پھولوں کی چادر بچھادی۔ نازلی نے مجھے پھر سے زندہ کردیا تھا' جینے کی امنگ میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔

تنویر نے ممی کا تذکرہ کرکے میرے زخموں پر سے کھرنڈ اتار دیے تھے۔ میرا دل شدت سے یہ چاہ رہا تھا کہ میں ممی کی ممتا بھری آغوش میں منہ چھپا کر میٹھی نیند سوجاؤں لیکن ہر خواہش پوری نہیں ہوتی ہے اور نہ ہر خواب اپنی تعبیر پاتا ہے۔ شدت سے مجھے اپنا ماضی یاد آئے جارہا تھا۔ دل اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو صدا دے رہا تھا۔ کچھ لوگ تو موت کے ہاتھوں مجھ سے دور ہوگئے تھے اور کچھ زندہ ہوتے ہوئے میرے لیے مرگئے تھے۔ مہینوں گزر جاتے تھے مگر ممی کی صورت نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اُن کی یاد دن رات میرا احصار کیے رہتی مگر وہ جب آتیں تو انہیں دیکھتے ہی میرے امنڈتے ہوئے جذبے سرد پڑ جاتے۔ میرے دل و دماغ پر برف جم جاتی اور میں بے حد رکھی انداز سے اُن سے ملتا۔ میرے اس انداز سے اُن کی آنکھوں میں شکوہ نمایاں ہوجاتا مگر میں انجان بن جاتا۔ اپنے اس رویئے سے مجھے بہت تسکین ملتی تھی۔ ممی کو دکھ دے کر شاید میں اپنی محرومیوں کا انتقام لیتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کے جانے کے بعد میں پہروں روتا رہتا تھا' کڑھتا تھا۔

نہ جانے رات کے کون سے پہر میں نیند کی آغوش میں کھوگیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو طبیعت عجیب سی مضمحل اور نڈھال ہورہی تھی' سر بھاری اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر یونہی آنکھیں موندے پڑا رہا پھر کسی کے ہاتھ کے لمس کو

افشائے راز

علامہ اقبالؒ نے ایک مرتبہ حکیم اجمل خاں کے پاس بہ طورِ مہمان قیام فرمایا۔ آدھی رات گزرنے کے بعد اچانک علامہ مرحوم کی داڑھ میں شدید درد ہوا۔ انہوں نے ملازم کو جگایا اور حکیم صاحب کے پاس بھیجا۔ حکیم صاحب مکان کے اندر اپنے کمرے میں آرام فرمارہے تھے۔ انہوں نے ملازم کے ہاتھ ایک دوا بھجوائی اور فرمایا کہ جس داڑھ میں درد ہو' یہ دوا اُس پر رکھ کر اوپر والی داڑھ سے اسے دبائیں۔ علامہ نے یہی کیا اور ان کا درد ایک دم ختم ہوگیا۔ علامہ مرحوم نے حکیم صاحب سے اُس دوا کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ کون سی دوا ہے؟ تو حکیم صاحب نے مذاقاً اُن سے فرمایا کہ یہ راز میں اتنی آسانی سے کیسے ظاہر کرسکتا ہوں پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ یہ ادرک تھی اور اس پر پسا ہوا نمک لگا تھا۔

''اطبا کے حیرت انگیز کارنامے''
مرتبہ حکیم عبدالناصر فاروقی.
مطالعہ۔ رفیق احمد نقش.

محسوس کر کے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ تنویر پریشانی کے عالم میں میرے ماتھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میں نے تنویر سے بات کرنا چاہی تو احساس ہوا کہ شدتِ بخار سے زبان بھی لڑکھڑا رہی ہے۔ تنویر نے فوراً میری حالت سے وارڈن کو آگاہ کیا۔ ڈاکٹر کو بھی وارڈن ہی نے بلوایا۔

کئی روز تک میں بخار میں پھنکتا رہا۔ تنویر نے دن رات میری خدمت کی۔ جب میں ذرا حواس میں آتا تو تنویر ہی کا چہرہ نظر آتا۔

تنویر ہی نے انکل شیرازی کو میری بیماری کی اطلاع دی۔ انکل شیرازی کے ساتھ ساتھ نازلی بھی میری تیمارداری کو آئی تھی پھر یہ انکل شیرازی تھے جو بیماری کی حالت میں مجھے اپنے گھر لے گئے اور اپنی اولاد کی طرح میری دیکھ بھال کی۔ تنویر نے میری بیماری کی اطلاع ممی کو بھی دے دی تھی جس پر انہوں نے مجھے فون کیا تھا کہ عثمان بیٹا' میں تمہارے پاپا کے ساتھ شکاگو جا رہی ہوں نعمان سے ملنے' واپسی پر تمہارے پاس آؤں گی۔'' میں نے ممی کی پوری بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

دن پَر لگا کر اڑتے گئے۔ دن مہینوں' مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ میں نے تعلیم مکمل کر لی۔ لاہور ہی کے ایک بڑے ادارے میں مجھے ملازمت مل گئی۔ گلبرگ کے علاقے میں' میں نے ایک کوٹھی خرید لی۔ تنویر بھی میرے ساتھ ہی مقیم تھا۔ دراصل اسے بھی لاہور ہی میں ملازمت مل گئی تھی۔ تنویر کے والد کا تبادلہ گلگت ہو گیا تھا لہٰذا وہ گھر والوں کے جانے کے بعد سے میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔

کوٹھی کی اینکسی میں نے ایک بیوہ عورت مسز احمد کو دے دی تھی جو اپنے معذور بیٹے کے ساتھ وہیں مقیم ہو گئیں۔ مسز احمد ایک نیک دل اور اچھی خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمیں ایک محنتی اور ایماندار ملازمہ ڈھونڈ دی تھی جو گھر کی دیکھ بھال کرتی۔ کچن کے علاوہ گھر کا تمام کام نئی ملازمہ خیرن کے سپرد تھا۔

میں انکل شیرازی اور نازلی سے ملنے اب بھی جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لوگ بھی آ جاتے تھے۔ انکل شیرازی نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور اُن کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے آبائی گاؤں حسین آباد جا کر اپنی زمینوں کو سنبھالیں گے۔

اُن کے گاؤں جانے کا تذکرہ سن کر میں تڑپ اٹھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''نازلی کی تعلیم کا کیا بنے گا؟''

''فی الحال ہوسٹل میں داخل کرا دوں گا۔'' انکل کی اس بات سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ ''اور ہاں بیٹا! نازلی کی خیر خبر لیتے رہنا۔'' انکل شیرازی نے مجھے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

''انکل' آپ بالکل فکر نہ کریں۔'' میں نے انکل شیرازی کو ہر طرح سے اطمینان دلایا۔

روزانہ میں آفس سے واپس آ کر نازلی کے پاس چلا جاتا۔ ہم آپس میں دنیا جہاں کی باتیں کرتے' آنے والے دنوں کے خوب صورت اور رنگین خواب دیکھتے' ہمارے اطراف رنگ ہی رنگ اور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

ایک سال گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور نازلی کے امتحان دیتے ہی انکل شیرازی اُسے اپنے ساتھ گاؤں لے گئے۔ میرے چاروں طرف بے چینی اور اداسی پھیل گئی۔ انکل شیرازی جاتے ہوئے مجھے گاؤں بلا کر گئے تھے لیکن آفس میں کام اتنا تھا کہ باوجود کوشش کے میرا جانا نہ ہو سکا۔ آفس سے آ کر میں بے حد بے چین اور بے کل رہتا۔

خالہ خیرن نے میری بے چینی محسوس کر کے کہا۔ ''بیٹا! ایک بات کہوں' اگر تم برا نہ مانو؟''

''ہاں ہاں خالہ! کہیں۔'' میں نے کہا۔

''عثمان بیٹا! تم شادی کر لو۔ تمہاری بے چینی اور گھر کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی۔''

''اچھا خالہ!'' میں نے کہا اور پھر خالہ کو چائے لینے کے لیے بھیج دیا اور خود سوچنے لگا کہ چند روز کے لیے ممی کے پاس سے ہو آؤں اور انہیں نازلی کے رشتے کے لیے انکل شیرازی کے گھر بھیجوں۔ بے شک ممی نے مجھے کبھی اپنا بیٹا نہیں سمجھا لیکن بہرحال انہی کو رشتہ لے کر انکل شیرازی کے گھر جانا تھا۔ اگلے ہی روز میں اپنی کار میں ڈیڈی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے کئی سال پہلے میں پاپا کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر نکلا تھا۔

ممی مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ نعمان بھی اُن دنوں یہیں تھا۔ نعمان اور ٹوبی بڑے تکلف اور پھیکے انداز میں مجھ سے ملے۔ کچھ ہی دیر بعد پاپا آفس سے آ گئے۔ مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی پھر اُن کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت بھر گئی۔ میرے سلام کا جواب دیے بغیر وہ ممی سے مخاطب ہوئے۔ ''فارینہ.....! ادھر آؤ۔'' انہوں نے تحکم سے کہا۔

ممی کسی روبوٹ کے مانند اُن کے ساتھ اندر چلی گئیں۔ جب وہ زرد ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ واپس آئیں تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ پاپا نے اُن سے کیا کہا ہوگا۔ دکھ کی کتنی ہی لہریں میرے وجود میں سرسرانے لگیں۔ میں ممی سے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر میں نے ہمت کر کے ممی کو نازلی کے بارے میں بتا دیا۔

وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئیں۔ ''ٹھیک ہے بیٹا! میں چند روز بعد خود شیرازی کے گھر جا کر بات کروں گی اور پھر تمہیں فون پر اطلاع دے دوں گی۔''

میں کئی دن تک ممی کے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن فون نہ آیا۔ میں نے خود کئی دفعہ گھر فون کیا تو یہی جواب ملا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ آخر تنگ آ کر میں پریشانی کے عالم میں حسین آباد روانہ ہو گیا۔ سفر کی تھکن سے برا حال تھا لیکن نازلی سے ملاقات کا احساس ہر پریشانی پر غالب تھا۔

نازلی کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ انکل شیرازی اپنے فارم پر گئے ہوئے تھے۔ کتنی ہی دیر ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے نازلی کو بتا دیا کہ ممی جلد ہی اُس کے گھر آنے والی ہیں۔ یہ سن کر نازلی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد انکل شیرازی واپس آ گئے اور بڑے خلوص اور پیار سے ملے اور شکوہ کرتے رہے کہ میں اتنے دنوں بعد کیوں آیا ہوں؟ میں تو شام ہی کو واپس ہونا چاہتا تھا مگر انکل اور نازلی نے بڑے اصرار سے مجھے روک لیا کہ ہمارا فارم وغیرہ دیکھ کر جانا۔

دوسرے دن صبح میں نازلی کے ساتھ فارم پر چلا گیا۔ ہلکا ہلکا اُجالا پھیل چکا تھا۔ دیہات کی صبحیں ویسے بھی بہت سہانی ہوتی ہیں۔ نازلی کے ساتھ نے نظاروں کو اور حسین بنا دیا تھا۔ ہرے بھرے کھیت' اُن میں کام کرتی عورتیں' گاؤں کے چھوٹے چھوٹے گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں' یہ سماں ماحول کو بے حد رنگین بنا رہا تھا۔ ایسے خوب صورت نظارے ہم شہر والوں کو کہاں میسر آتے ہیں۔

دوسرے دن میں فارم وغیرہ گھوم کر دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آ گیا۔ میرے گھر پہنچتے ہی تنویر کا فون آ گیا۔ میری غیر موجودگی میں وہ گلگت چلا گیا تھا۔ فون میں نے ہی ریسیو کیا۔ فون پر تنویر ہی تھا۔

''یار عثمان! تم فوراً پہنچ جاؤ۔'' تنویر بڑی خوشی سے چہک رہا تھا۔

''مگر بات کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

"یار بات یہ ہے کہ میری منگنی ہو رہی ہے۔"

"اوہو مبارک ہو مگر ہماری ہونے والی بھابی کا حدود اربعہ کیا ہے؟" میں نے بڑی خوشی سے پوچھا۔

"باقی باتیں یہاں آ کر ہوں گی تم فوراً چھٹی لے کر آ جاؤ۔"

میں نے تنویر سے فوراً پہنچنے کا وعدہ کر لیا اور دوسرے ہی دن گلگت پرواز کر گیا۔ تنویر مجھے ایئرپورٹ لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ تنویر کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں تو منگنی میں شرکت کے فوراً بعد واپس آنا چاہتا تھا مگر تنویر نے روک لیا کہ دو دن بعد وہ بھی میرے ہمراہ جائے گا۔

میں واپس آیا تو خالہ خیرن نے ڈھیر ساری ڈاک میرے سامنے رکھ دی' خطوط کے ساتھ ایک کارڈ بھی تھا۔ سب سے پہلے میں نے کارڈ کھول کر پڑھا۔

سنہرے کارڈ پر لکھے ہوئے سیاہ حروف زہر بن کر میری رگوں میں اتر گئے۔ میں غصے سے پاگل ہو کر باہر کی جانب دوڑا۔ تنویر میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے مجھے روک کر کچھ دریافت کرنا چاہا لیکن میں دوڑ کر کار میں بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کر کے پوری قوت سے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ کار نے ایک جھٹکا کھایا اور کوٹھی سے باہر نکل گئی۔ تنویر بھاگ کر باہر آیا لیکن عالمِ دیوانگی میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور میں گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں تو الاؤ سے دہک رہے تھے جنہوں نے میرے سوچنے سمجھنے کی طاقت سلب کر لی تھی۔

راستے میں کئی دفعہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ نہ جانے میں کیسے صحیح سلامت انکل شیرازی کے گھر پہنچ گیا۔ میں تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں مجھے نازلی نظر آئی زرد چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ میں نے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "نازلی.....! یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم نے ایسا کیوں ہونے دیا؟ تم نے مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟"

نازلی کی آنکھوں میں کرب و درد کا طوفان تھا' چہرے پر اضطراب کا سیلاب لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "عثمان.....! مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنی ممی اور پاپا سے پوچھو۔ انہوں نے تمہاری بجائے نعمان کے لیے مجھے کیوں مانگا؟ میں تو مشرق کی بیٹی ہوں جو والدین کی رضا پر قربان ہو جاتی ہیں۔"

نازلی کی آواز مجھے کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے غور سے نازلی کو دیکھا تو اُس کے چہرے پر دکھ آمیز لمحوں کے سائے لرزاں تھے۔ اُس کی آنکھوں میں کتنے ہی خوابوں کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں تھیں۔

میرے بے حد اصرار پر اُس نے بتایا کہ تمہارے پاپا نے تمہاری بجائے نعمان کے لیے ڈیڈی سے بات کی چونکہ لوگ دیکھے بھالے تھے اس لیے ڈیڈی نے فوراً ہاں بھر لی۔ تمہارے پاپا نے فوراً انگوٹھی پہنا کر اس رشتے کو مضبوط کر لیا اور فوراً ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی تھی۔ تمہاری ممی بھی ساتھ تھیں مگر وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہیں' یوں لگ رہا تھا جیسے زبردستی انہیں ساتھ لایا گیا ہو۔

پاپا نے ایک بار پھر مجھے شکست دینے کی کوشش کی تھی اور یہ شکست میری زندگی کی تمام شکستوں پر حاوی تھی۔ میں جتنی تیزی سے حسین آباد گیا تھا' اتنی ہی تیزی سے واپس ہو گیا۔ میرا رُواں رُواں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں پاپا سے اپنا اور اپنے دکھوں کا انتقام لے سکوں پھر نہ جانے کیا ہوا' کار ایک دھماکے سے دوسری سمت سے آتی ہوئی سوزوکی ویگن سے ٹکرائی اور درد کا ایک شدید احساس میرے وجود پر محیط ہوتا چلا گیا اور میں شدتِ کرب سے بے ہوش ہو گیا۔

کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد میری آنکھ کھلی تو خود کو کسی اسپتال کے سفید براق بستر پر پایا۔ میرا جسم پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا' ہاتھ ہلانا چاہا تو پورے جسم میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ نرس مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر قریب آ گئی۔ "پلیز' آپ لیٹے رہیے' حرکت نہ کریں' ہم نے آپ کے ڈرائیونگ لائسنس سے ایڈریس لے کر آپ کے گھر اطلاع کر دی ہے۔"

میری تکلیف حد سے بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے پھر نیند کے لیے انجکشن لگا دیا اور میں ایک بار پھر اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ جب ہوش آیا تو تنویر کو سامنے پایا۔ اُس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان اُس محبت کا ثبوت تھے جو اُسے مجھ سے تھی' بالکل بھائیوں ایسی محبت۔ تنویر کے پوچھنے پر میں نے اُسے ہر بات بتا دی۔ اُسے بھی یہ باتیں سن کر بہت دُکھ ہوا۔

مجھے چوٹیں تو بہت آئی تھیں مگر اللہ کا شکر تھا کہ ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ میں ایک ہفتہ اسپتال میں رہنے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ میری ایک ٹانگ میں کافی چوٹیں آئی تھیں جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ گھر آ کر میں نے کارڈ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کارڈ نہ مل سکا' شاید خالہ خیرن نے صفائی کرتے ہوئے کہیں پھینک دیا تھا۔ میں نعمان کی شادی کی تاریخ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ایکسیڈنٹ کی اطلاع میں نے ممی کو نہیں ہونے دی تھی' تنویر کو بھی منع کر دیا تھا۔

دوسرے ہی دن میں تنویر کی مدد سے ممی کے گھر جا پہنچا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر ممی زرد پڑ گئیں۔

"کیا ہوا عثمان بیٹا.....؟" وہ رو پڑیں۔

"یہ تو بہت معمولی زخم ہیں' رُوح کے زخم تو دیکھیں جو آپ نے بچپن سے لے کر اب تک مجھے دیے ہیں اور اب یہ آخری اور سب سے گہرا وار آپ نے نازلی کو مجھ سے چھین کر کیا ہے۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی بہت تلخ ہو گیا۔

ممی خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اتنے میں پاپا اندر داخل ہوئے' وہ مجھے دیکھتے ہی خلافِ معمول بڑی خوش دلی سے بولے۔ "آہا' تو نعمان کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہو؟"

سینڈوچ

فاسٹ فوڈ کے اس زمانے میں سینڈوچ ایک بہت مقبول غذا ہے۔ یہ دو ڈشوں کے اتحاد کی بہترین غذا ہے لیکن ابتدا میں یہ ایک جواری کی غذا تھی۔

سینڈوچ انگلستان میں ایک جگہ کا نام ہے۔ یہاں کا چوتھا ارل' جان مونٹاگو (1718-1792) جوئے کا بے حد شوقین تھا اور دن رات اسی شغل میں لگا رہتا تھا۔ اُس کی بیوی نے اُس کے لیے یہ 'ٹو ان ون' روٹی ایجاد کی تھی تاکہ وہ جوا کھیلتے ہوئے کچھ کھا پی لے۔

مونٹاگو کی شخصیت کی وجہ سے یہ ڈش بہت جلد مشہور ہو گئی۔ انگلستان کے علاوہ دیگر یورپی ممالک میں بھی اس کا کھانا اور پیش کرنا فیشن میں داخل ہو گیا اور فرانسیسی زبان میں بھی لفظ 'سینڈوچ' داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر ف عبدالرحیم.

تعاون. عقیل عباس جعفری.

اُن کی مسکراہٹ میں جو طنز تھا' اُس نے مجھے جھلسا کر رکھ دیا۔ میرے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے۔ میں سلگتی ہوئی نظروں سے پاپا کو دیکھتے ہوئے باہر چلا گیا۔ تنویر کار ہی میں بیٹھا تھا۔ میں نے تنویر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر میں اپنے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کی تلافی کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ میرے اس فیصلے کی راہ میں کئی مرتبہ ممی کی آنسو بھری آنکھیں آئیں مگر میں اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔

اس موقع پر میں نے اپنے ایک عزیز دوست وڈیرے علی نواز سے مدد چاہی۔ وڈیرے علی نواز نے اپنے چار آدمی میرے ساتھ کر دیے۔ ہمیں اپنے ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ نعمان کی بارات حسین آباد چلی گئی ہے اور شام کو واپسی ہے۔

شام کا اندھیرا ہر سُو پھیل چکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو کوٹھی سے باہر چھپا دیا اور میں کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ پاپا کے کمرے میں جا کر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں نے سیف کھول لیا۔ تمام نوکروں کو معلوم تھا کہ میں پاپا کا سوتیلا بیٹا ہوں لہٰذا کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے سیف میں سے نوٹوں کی کئی گڈیاں جیب میں ڈال لیں۔ آخر یہ سب میرے ابو کی فیکٹریوں سے آنے والی رقم ہی تھی۔ مجھے باہر بارات کی آمد کا احساس ہوا تو میں جلدی سے باہر آ کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ یہاں سے دلہا کی کار بالکل سامنے تھی۔ میں آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ اُس وقت میرے اندر کا ہر جذبہ مر چکا تھا' اگر زندہ تھا تو وہ صرف انتقام کا جذبہ تھا۔

پہلے پاپا کار سے باہر آئے پھر نعمان باہر نکلا پھر اُس نے سرخ کپڑوں میں ملبوس نازلی کو سہارا دے کر باہر نکالا۔ نعمان' نازلی کو سہارا دے کر اندر لے جانے لگا' باقی لوگ پیچھے تھے۔ نازلی کو نعمان کے ساتھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا' ٹرائیگر پر میری گرفت سخت ہو گئی' قریب تھا کہ میں فائر کر دیتا' اچانک مجھے اپنے قریب ایک آہٹ محسوس ہوئی' میں پھرتی سے پلٹا مگر دیر ہو چکی تھی' بس اتنا یاد رہا کہ کسی لحیم شحیم شخص نے میرے سر پر وار کیا تھا پھر میں تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

تاریکیاں جب دور ہوئیں تو میں نے خود کو لاک اپ میں پایا۔ علی نواز کے چاروں بندے میرے ہمراہ تھے۔ میں اُن پر برس پڑا۔

"سائیں.....! ہم کیا کرتے۔" ایک نے گھگیاتے ہوئے جواب دیا۔ "جب آپ کوٹھی کے اندر گئے تھے' اُسی وقت اُن کے دس بارہ بندوں نے ہم پر بے خبری میں حملہ کر دیا۔ ہم تو ہتھیار وغیرہ رکھ کر بیٹھے تھے اور بارات کا انتظار کر رہے تھے۔ اگر ہتھیار ہمارے ہاتھ میں ہوتے تو پھر ہم دیکھتے کہ وہ کیسے ہم پر قابو پاتے ہیں۔

اور پھر تنویر جو کہ کچھ فاصلے پر جیپ لیے ہمارا انتظار کر رہا تھا' اُسی نے علی نواز کو ہمارے بارے میں بتایا۔ علی نواز ہی ہماری ضمانتوں کے لیے آیا۔ ہم پر ڈاکا ڈالنے کا الزام تھا اور میری جیب سے نکلنے والی رقم نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی۔ پاپا نے کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اُن کا بیٹا ہوں' جائیداد کا وارث ہوں۔

ممی مجھ سے ملنے لاک اپ میں آئیں۔ اُن کی آنکھوں میں درد و کرب کے کئی طوفان مچل رہے تھے لیکن آتشِ انتقام میں مجھے اُن سے بھی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ دوسری شادی نہ کرتیں تو ہرگز میرا یہ حال نہ ہوتا۔ اگر شادی کر ہی لی تھی تو مجھے اپنی مامتا سے محروم نہ کرتیں تو آج میں اس مقام پر نہ ہوتا۔

ممی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر میں اس وقت ایک وحشی تھا' ایک جنونی تھا جو اپنی محبت کا

انتقام لینا چاہتا تھا۔ میں نے ممی کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ وہ آنسو بہا کر واپس چلی گئیں۔

محرومیوں اور ناآسودگیوں کے شکار' تنہائی کی گود میں پلنے والے بچے جب بھڑک کر درندے بن جاتے ہیں تو پھر اُن کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوتی ہے۔ میں بھی درندہ بن چکا تھا' نفرت' محبت' قرب' دوری' اجنبیت' اپنائیت' شاید یہ تمام جذبے ساتھ ساتھ انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں' ایک کے کمزور پڑتے ہی دوسرا اُس پر غالب آجاتا ہے۔

علی نواز کی کوششوں سے ہماری ضمانت ہو گئی حالانکہ پاپا نے بہت کوشش کی کہ ضمانت نہ ہو سکے مگر علی نواز بھی بڑا رسوخ والا شخص تھا۔ اس کی پہنچ بھی بڑے بڑے آفیسروں تک تھی۔ مقدمہ شروع ہو چکا تھا۔ وڈیرہ علی نواز نے کیس کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ عدالت میں' میں نے یہی بیان دیا تھا کہ نعمان میرا سوتیلا بھائی ہے۔ اس کی شادی میں شرکت کے لیے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں گیا ہوا تھا۔ وہ گھر اور تمام جائیداد میرے مرحوم والد کی ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد جہانگیر سلمان نے میری ممی سے شادی کر لی۔ تمام جائیداد کی دیکھ بھال وہ اُسی طرح کرتے رہے جیسے میرے والد صاحب کی زندگی میں کرتے رہے تھے۔ میرے سوتیلے والد چونکہ میری تمام جائیداد ہتھیانے کے خواب دیکھ رہے تھے اسی لیے انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے سر پر کوئی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ یہی حشر انہوں نے میرے چاروں ساتھیوں کا کیا اور پھر پولیس طلب کر لی۔ میری جیب میں نوٹوں کی گڈیاں انہوں نے خود میری بے ہوشی کی حالت میں ڈالی ہوں گی۔

میرے اس بیان سے جہانگیر صاحب کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔ کاغذات اور مختلف گواہوں کے بیان نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ میں ہی تمام جائیداد کا وارث ہوں اور کوئی اپنے ہی گھر میں بھلا کیسے چوری کر سکتا ہے؟

جہانگیر صاحب میری اس چال پر تلملا رہے تھے مگر اب معاملہ قانون کے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

فیصلے کے دن میں تو مطمئن تھا مگر جہانگیر صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عدالت کے کمرے میں خاموشی تھی پھر جج کی آواز گونجی۔

"تمام حقائق کو دیکھتے ہوئے عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم عثمان علی بے قصور ہے لہٰذا اُسے باعزت بری کیا جاتا ہے۔"

جہانگیر کے چہرے پر سائے سے لہرانے لگے۔ اب میرے راستے کے کچھ کانٹے دور ہو گئے تھے پھر عدالتی کارروائی مکمل ہو گئی اور میں علی نواز کے ساتھ اُس کے گھر چلا گیا۔ تنویر کو میں نے اپنی رہائی کی اطلاع فون پر دے دی تھی۔

اب اگلا مرحلہ یہ تھا کہ میں اپنی جائیداد جہانگیر کے تسلط سے آزاد کرا لوں کیونکہ اب میں بہ خوبی یہ کام سنبھال سکتا تھا پھر صلاح مشورے کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ میں پہلے اُن سے بات کر لوں' اگر وہ عدالتی کارروائی کے بغیر ہی جائیداد میرے حوالے کر دیں تو بہتر ہے ورنہ پھر عدالت سے رجوع کیا جائے گا۔

پہلے جب میں اپنے ہی گھر میں آیا تھا تو چوروں کی حیثیت سے داخل ہوا تھا مگر اب انداز فاتحانہ تھا۔ پاپا سے جب جائیداد کی بات کی تو ان کے چہرے پر بے بسی اور نفرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ چند روز کے اندر اندر تمام کاغذات اور جائیداد میرے حوالے کر دیں گے۔ اس سلسلے میں کسی چارہ جوئی کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے دل میں شکر کیا کہ دوسرا مرحلہ بھی آسانی سے طے ہوگیا۔ ممی' نعمان اور نازلی میرے سامنے نہیں آئے تھے گو کہ کئی مرتبہ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی کہ ایک نظر نازلی کو دیکھ لوں لیکن پھر میں نے اس خواہش کو دبالیا۔

☆.....☆

جہانگیر صاحب نے مجھے بلایا تھا لیکن میں اپنے شکار کی مصروفیات کی وجہ سے نہ جاسکا۔ میں وڈیرہ علی نواز کے ساتھ ہرن کے شکار پر گیا ہوا تھا' فرصت پاتے ہی پاپا سے ملنے گھر آیا۔ پاپا مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ ان کا انداز اُس روز کچھ ہچکچایا ہوا تھا اور پہیلیاں بجھوانے والے انداز میں گفتگو کررہے تھے پھر وہ اپنے مطلب کی بات پر آگئے کہ نعمان طلاق دے کر نازلی کو تمہارے حوالے کردے گا۔ تم جائیداد سے دستبردار ہوجاؤ۔

یہ بھی پاپا کی کمینی فطرت ہی کا ایک پہلو تھا کہ وہ نازلی کو برباد کر کے جائیداد کو بچانا چاہتے تھے۔ نازلی کے ذریعے ایک مرتبہ پھر بساط بدل دینا چاہتے تھے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا' کیا جواب دوں؟ کیا جائیداد کے بدلے اپنی محبت کو حاصل کر لوں؟ کیا کروں؟ اچانک اندر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پاپا بھاگ کر اندر چلے گئے۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ میرے دل کو بھی عجیب وحشت سی ہورہی تھی۔ میں بھی بے ساختہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا اور شور کی سمت کا اندازہ کرتا ہوا کچن تک پہنچ گیا جہاں دو آدمی کسی کو کمبل میں لپیٹ رہے تھے۔ میں بے چین ہوکر آگے بڑھا تو جھلسا ہوا منہ نظر آیا اور میرے منہ سے چیخیں بے ساختہ نکلنے لگیں۔ وہ میری ممی تھیں۔ آگ کے تیز شعلوں نے انہیں جلا کر راکھ کردیا تھا۔ میں نے کسی کی پروا کیے بغیر ممی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور کار کی طرف دوڑا۔ انہیں آہستگی سے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ میری ساتھ والی سیٹ پر نعمان بھی آکر بیٹھ گیا اور کار تیزی سے سڑک پر بھاگنے لگی۔

گنگارام اسپتال میں ممی کو فوراً داخل کرادیا گیا۔ وہ بہت شدید جھلس گئی تھیں' سارے بال جل گئے تھے' کھال جگہ جگہ سے جل کر لٹک گئی تھی اور اندر سے سرخ گوشت نکل آیا تھا۔ ڈاکٹروں کی اَن تھک کوشش کے باوجود رات تین بجے اُن کی رُوح جسم کی قید سے آزاد ہوگئی۔ اُس روز میں نے جی بھر کر آنسوؤں کا چراغاں کیا۔ بدتوں سے آنکھوں میں جمے ہوئے آنسو قطرہ قطرہ پگھل کر بہہ گئے۔ وہ جیسی بھی تھیں' میری ماں تھیں۔ وہ شوہر اور اولاد کے درمیان بری طرح پس رہی تھیں۔ حالات نے مجھے اُن سے کبیدہ کردیا تھا مگر میرے دل سے اُن کی محبت اور عزت کم نہ ہوئی تھی۔ کاش کہ وہ پاپا سے شادی نہ کرتیں تو اس حالت میں موت کو گلے لگانے پر مجبور نہ ہوتیں اور نہ میں اس طرح زندہ درگور ہوتا۔ وہ میرے قریب نہ تھیں مگر اس دنیا میں تو تھیں۔ میرے سر پر ایک سایۂ دُعا تو تھا۔ آج مجھے لگ رہا تھا کہ میں تپتی ریت پر ننگے پاؤں کھڑا ہوں۔ کوئی سایہ' کوئی چھاؤں میرے لیے نہیں ہے۔

ممی کی موت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مجھے پاپا سے شدید نفرت ہوگئی۔ ان سے انتقام کی آگ نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں انہیں اپنے گھر' اپنے کاروبار سے نکال کر باہر کروں مگر نعمان اور ثوبی کی حالت دیکھ کر میں ضبط کیے رہا۔ ماں کے غم سے وہ دونوں بھی نڈھال تھے۔

ممی کے چہلم تک میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ چہلم کے بعد میں نے پاپا سے پھر بات کی تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''کیا تم نازلی کو اتنی جلدی

بھول گئے ہو؟'' میرے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ نازلی میری زندگی کے خزاں رسیدہ دنوں میں بہار کا نوخیز پھول بن کر داخل ہوئی تھی' بھلا میں اپنی محبت کو کیسے بھول سکتا تھا مگر حالات اُسے مجھ سے دور لے گئے تھے اور اب پھر قدرت اُسے مجھ سے قریب کررہی تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔

دو دن کی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ میں نازلی کے لیے سب کچھ چھوڑ دوں گا اور اسے اپنے گھر کی ملکہ بنالوں گا۔ روپے پیسے کی تو میرے پاس کمی نہ تھی مگر محبتوں کی ہمیشہ کمی رہی تھی۔ ڈیڈی' دادا جان' دادی جان کی محبتوں کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ختم کردیا تھا مگر ممی کی محبت پر میرا حق نہ تھا۔ پاپا نے انہیں اس قابل ہی کب چھوڑا تھا کہ وہ مجھ پر اپنی ممتا نچھاور کرتیں۔ بچپن' لڑکپن ممی کی محبت کے لیے تڑپتے سسکتے گزرا۔ جوانی میں نازلی کی محبت نے سب دکھوں کی تلافی کردی تھی۔ نازلی ہی نے اس دنیا پر' رشتوں پر' جذبوں پر میرا اعتبار زندہ کیا۔ اس کی محبت نے مجھے فراخ دلی اور وہ بلند حوصلہ عطا کیا تھا کہ میں نے ممی کی زیادتیوں کو بھی بھلا دیا تھا۔ ان کی طرف سے اپنا دل صاف کرلیا تھا مگر تقدیر کو اب بھی مجھ پر رحم نہیں آیا۔ نازلی بھی مجھ سے بچھڑ گئی۔ اب ایک بار پھر نازلی مجھے مل رہی تھی تو میں پیچھے کیوں ہٹتا؟ اور پھر اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کے لیے میں گھر جا پہنچا۔ پاپا گھر پر نہیں تھے۔ میں اِن میں بیٹھ گیا۔ میرا ذہن اب بھی مختلف سوچوں کے گرداب میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ ایک مانوس سی آہٹ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ نازلی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کا سوگوار حسن چاندنی کی طرح چمک رہا تھا' غم سے بوجھل پلکوں میں دکھوں کا ایک گہرا سمندر کروٹیں لے رہا تھا' آنکھوں میں خاموش آنسو منجمد ہورہے تھے۔ میں سحر زدہ سا ہوکر اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''نازلی.....! تم؟''

''ہاں' میں ہوں نازلی.....!'' اُس کے لب تھرتھرائے۔

''نازلی' میں سب کچھ ہار کر تمہیں جیتنے آیا ہوں۔ میں آج بھی تمہاری راہوں میں اپنی پلکیں بچھائے بیٹھا ہوں۔ میرا فیصلہ تمہارے حق میں ہے۔ میری محبت تمہاری منتظر ہے۔ اب ہمارے راستے کی تمام دیواریں گرنے والی ہیں۔''

''نہیں' نہیں.....'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''میں نہیں چاہتی عثمان' کہ میرا بیٹا بھی تمہاری طرح نفرتوں اور محرومیوں کی گود میں پل کر بڑا ہو۔ میں نعمان کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اپنے بیٹے کے سر پر سے اُس کے باپ کا سائبان کبھی نہیں ہٹاؤں گی ورنہ..... ورنہ..... ایک اور عثمان علی جنم لے گا۔'' وہ وحشت کے عالم میں بول رہی تھی اور اس کی باتیں میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ میری نظر اچانک اس کی گود پہ گئی جہاں ایک ننھا سا بچہ انگوٹھا چوس رہا تھا جسے میں پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔ نازلی روتی ہوئی پلٹ کر واپس چلی گئی تھی جہاں نعمان اس کا منتظر تھا۔

میں واپس اپنی ملازمت پر آچکا ہوں۔ تمام جائیداد میں نے نازلی کے بچے کے نام کردی ہے۔ نازلی کا دانش مندانہ فیصلہ مجھے پسند آیا تھا۔ بعض دفعہ فیصلے دل سے نہیں' دماغ سے کرنا پڑتے ہیں۔ جس کرب' جس اذیت میں' میں پل کر بڑا ہوا تھا' میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس اذیت سے کوئی اور دوچار ہو۔

میں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ نازلی کی محبت کے چراغ میری تمام زندگی کے لیے بہت ہیں اور یہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔

.....☆☆.....

سربلند کہانیاں

شہید کی ڈائری

منزہ سہام

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نا مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ

ماہِ ستمبر میرے لیے سب سے اہم ماہ ہے۔اسی مہینے میں، میں اپنے پاک وطن پر قربان ہوگیا تھا۔65ء کی جنگ میں جب پاک فوج نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔یہ کہنے میں مجھے عار نہیں کہ یہ جنگ فوج نے اور پاکستانی عوام نے مل کر لڑی تھی۔کیا جذبہ تھا اگر بس چلتا تو لوگ اپنی فوج اور اپنے وطن پر اپنی جانیں قربان کر دیتے۔جس کے پاس جو تھا، وہ وطن پر قربان کر رہا تھا۔خواتین اپنے کبھرو جوانوں کے لیے کھانے پکا پکا کر بھیجتی تھیں، کپڑے، جوتے، ضرورت کی دیگر اشیاء عوام نے اپنی ذمے داری بنالی تھی اور اسی محبت اور اسی جذبے نے سرحد پر فوج کو طاقت دی۔وہ جانتے تھے کہ قوم اُن کی کامیابی کے لیے دُعا گو ہے اور قوم کو مان تھا کہ اُن کے محافظ اپنی جانوں کا نذرانہ دے دیں گے مگر وطن پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔اسی یقین اور اعتماد نے کامیابی کا تاج عطا کیا مگر میں اب دیکھتا ہوں کہ یہ یقین کہیں کھو گیا ہے۔جذبے سرد ہوگئے ہیں۔مرکز جدا ہو رہے ہیں۔پہلے مرکز ایک تھا اس لیے منزل بھی ایک تھی۔لوگ بدل گئے ہیں یا شاید حالات نے ایسا ہونے پر مجبور کردیا ہے۔درسی کتابوں سے شہداء غائب کر دیئے گئے۔سال میں ایک بار صرف 6 ستمبر کو انہیں یاد کر کے اب لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنا فرض پورا کردیا۔انہیں تو آپ کے خون میں شامل ہونا چاہیے کیونکہ جس پاک وطن کی آزاد فضاؤں میں آپ سانسیں لیتے ہیں، وہ اُنہی کی مرہونِ منت ہیں۔اپنے شہیدوں کو سال میں ایک بار نہیں بلکہ دن میں بار بار یاد کیجیے اور شکریہ ادا کیجیے کہ انہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر پاک وطن سے کیا ہوا وعدہ نبھایا۔

شہید وطن

سلسلہ خاص

آتشِ جنوں

سلیم فاروقی

سوپھول تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ قسط نمبر 18

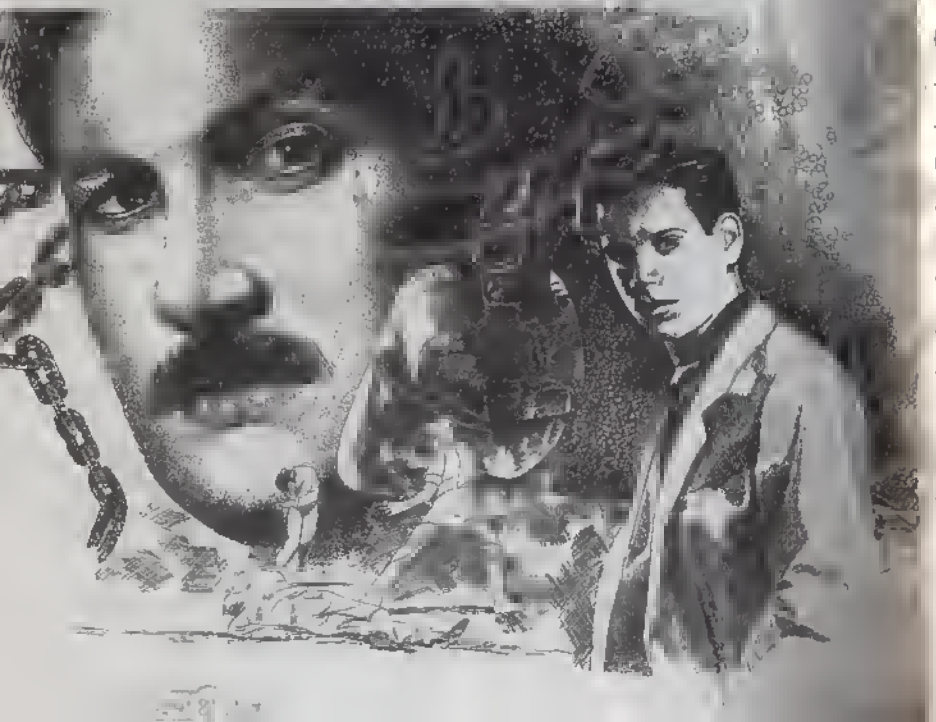

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت مند اور اپنی عزت دانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے۔۔۔ ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں' اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس' عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان' بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے۔۔۔ عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں۔۔۔

راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آ جاتا ہے' اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور' مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دو بیٹیوں کو اغوا کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا' عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مُردہ تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران' تیمور اور نادیہ اپنے دشمن بابر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے' عذر کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری طرف مشہدی تھا۔ نادیہ' عمران کو بتاتی ہے' اسے علم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ مشہدی کا دوبارہ فون آتا ہے اور نادیہ کو جاب آفر کرتا ہے۔ نادیہ انکار کر دیتی ہے۔ جان محمد کا فون آتا ہے اور وہ عمران کو بتاتا ہے کہ وہ اب مشہدی کے ساتھ نہیں ہے۔ نادیہ اور عمران ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ تیمور' ہاشم خان کو گولی مار دیتا ہے۔ عدنان کی امریکہ روانگی کے انتظامات مکمل ہو جاتے ہیں مگر روانگی کے وقت اُسے روک لیا جاتا ہے کہ اُس کے پاس آتش گیر مادہ ہے۔ یہ اطلاع غلط ہوتی ہے لیکن عدنان کی فلائٹ بس ہو جاتی ہے۔ تیمور' عمران کو بتاتا ہے کہ یہ غنی بلوچ کی سازش تھی۔ گھر آتے ہیں تو نادیہ' عمران کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن تیمور' عمران کو لے کر لی مارکیٹ میں موجود مشہور بادشاہ ہوٹل جاتا ہے اور کاؤنٹر پر جا کر غلام رسول کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔

غلام رسول مچھلی والے سے ملاقات کے دوران وہ انہیں کسی خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اپنے خاص آدمی کے ذریعے روانہ کرتا ہے جہاں اُن کا ایک گینگ سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ لوگ انہیں مار بھگاتے ہیں' راستے میں اُن کا ایک جعلی پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہوتا ہے اور پھر کہانی میں ایک نئے کردار غنی بلوچ کا اضافہ ہوتا ہے۔

عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست دردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں دردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی لڑکی کا فون آیا تھا' فون نمبر کی انکوائری پر معلوم ہوتا ہے' وہ نمبر اسٹیشن کے قریب کسی پی سی او کا ہے۔ عمران اور نادیہ کینٹ اسٹیشن پہنچتے ہیں جہاں نادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغوا کاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

عمران اور تیمور' شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ' حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور' حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

''ارے یار' تم تو ایک دم جذباتی ہو گئے؟'' میں نے کہا۔ ''بس بات ختم تو ہو گئی۔''

''جی ہاں بھیا! بات تو ختم ہو گئی' جب میں ان سے کوئی بات ہی نہیں کروں گا تو کوئی ایسی بات بھی نہیں ہو گی جو ان کی طبع نازک کو ناگوار گزرے۔'' تیمور حد سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

''تیمور.....!'' ہاشم نے کہا۔ ''میں تو تمہیں بہت ذہین اور سلجھا ہوا لڑکا سمجھتا تھا۔ تم تو بالکل بچے ہو۔''

''میں کہاں کا ذہین اور سلجھا ہوا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں تو انتہائی گھٹیا' خبیث اور کمینہ آدمی ہوں..... مجھے خواتین سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''اوئے یار' تم تو واقعی شہنشاہِ جذبات ہو رہے ہو۔'' میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور باقاعدہ رونے لگا۔ ''میں واقعی قابلِ نفرت ہوں.....'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''راستے کا پتھر ہوں' جس کا دل چاہے' ٹھوکر مار دی۔ میں محبت کو ترستا رہا ہوں بھیا.....!'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے محبت ملی تو میں نے آپ کو اپنے سگے بھائی سے بڑھ کر احترام دیا۔ میں نادیہ سے یہ سوچ کر مذاق کر لیتا تھا کہ اکثر میں اپنی بہن کو بھی اسی طرح تنگ کیا کرتا تھا لیکن آج ثابت ہو گیا کہ بہن واقعی بہن ہوتی ہے۔ کسی کو بہن سمجھ لینے سے وہ لڑکی بہن نہیں بن جاتی پھر ان سے یہ تو پوچھیں کہ میں نے ان سے کون سا ایسا سنگین مذاق کیا ہے جو یہ بات بات پر مجھے لعن طعن کرتی رہتی ہیں؟''

''اچھا بس۔'' میں نے محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم بڑے بڑے سورماؤں کے آگے چٹان بن کر کھڑے ہو جاتے ہو اور اس وقت عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہے ہو؟''

اچانک نادیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے تیمور کا سر اپنی باہوں میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں بھی تو تمہیں ہمیشہ بڑا بھائی سمجھ کر تنگ کرتی تھی۔ تم میری باتوں کا اتنا برا مانو گے' اس کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کون کہتا ہے کہ رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں؟ میں ان لوگوں کو گواہ بنا کر کہہ رہی ہوں کہ میں تمہیں اپنے سگے بھائیوں سے زیادہ چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنا دل چیر کر تو تمہیں نہیں دکھا سکتی؟'' پھر وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور بولی۔ ''اگر میری کسی بات سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے' تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو پلیز' مجھے معاف کردو۔'' نادیہ نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

تیمور نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور انہیں اپنی آنکھوں سے لگالیا۔

''اس چکر میں تیمور کی کافی ٹھنڈی ہوگئی۔'' ہاشم نے کہا۔ ''چلو اس کے لیے دوسری کافی لے کر آؤ اور اس دفعہ صرف ایک ہی ریوڑی لانا۔'' اس کی بات پر نادیہ کے ساتھ ساتھ تیمور کو بھی ہنسی آ گئی۔

•.....•.....•.....•

دوسری صبح میری آنکھ کھلی تو تیمور کمرے میں موجود تھا۔ میں باتھ روم کی طرف جانے لگا تو وہ بولا۔

''بھیا.....! ایک اور اہم خبر ہے لیکن پہلے آپ تیار ہو کر باہر آئیں پھر آپ کو سناتا ہوں۔''

''ارے یار! اب مجھے اتنی دیر تک تجسس رہے گا' تم پہلے وہ خبر مجھے سنادو۔''

''غنی بلوچ ایک گینگ وار میں مارا گیا.....'' اس نے کہا۔

میں بری طرح چونک اٹھا۔ ''گینگ وار میں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''آپ پہلے فریش ہو جائیں پھر خبر پڑھ کر اور ٹی وی کی نیوز دیکھ کر آپ کو اتنی حیرت نہیں ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا ورنہ میں اس سے مزید سوال و جواب کرتا۔

میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو ہاشم' نادیہ' تیمور' عدنان سبھی لوگ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی آپ لوگ میرا انتظار مت کیا کریں' میں تو دیر سے اٹھنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ آپ لوگ ناشتا کرلیا کریں۔''

''بھیا.....! آپ ہمیشہ سویرے اٹھ کر جاگنگ کرتے تھے' ایکسرسائز کرتے تھے' آپ نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا' کیوں؟''

''ارے یار! حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے ہیں۔'' میں نے کہا اور اپنے لیے ٹوسٹ پر جیلی لگانے لگا۔

''بھیا.....! حالات تو چلتے ہی رہتے ہیں' آپ کے دوسرے تمام کام بھی تو ہو رہے ہیں تو کیا آپ صبح ایکسرسائز اور جوگنگ کے لیے وقت نہیں نکال سکتے؟''

''اچھا چلو' کل سے ہم جاگنگ کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''پرومس؟'' عدنان نے کہا۔

''پرومس!'' میں نے جواب دیا۔

وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھیا کوئی وعدہ کرلیتے ہیں تو اسے پورا بھی کرتے ہیں۔

میں تیمور کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں' تم غنی بلوچ کے بارے میں کیا بتا رہے تھے؟''

''غنی بلوچ کل ایک گینگ وار میں مارا گیا.....'' تیمور نے کہا۔ ''اخبار یا ٹی وی پر یہ خبر نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ کس گینگ سے ہوا؟ پولیس کے مطابق' سولجر بازار کے علاقے میں رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب شدید فائرنگ کی آوازیں آئیں پھر فوراً ہی فائرنگ بند ہوگئی' پولیس کو وہاں غنی بلوچ اور اس کے دو ساتھیوں کی لاشیں ملی ہیں۔ پولیس کا خیال ہے کہ غنی جرائم پیشہ شخص تھا اور کسی دوسرے گینگ سے اس کی دشمنی تھی اس لیے وہ گینگ وار میں مارا گیا.....''

''اب تم پہلا کام تو یہ کرو کہ اس کے بھائی کو فوراً کہیں دور دراز علاقے میں چھوڑ آؤ' اس کے ساتھی کو بھی اس کے ساتھ چھوڑنا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کارنامہ بھی مشہدی کا ہے۔ غنی بلوچ نے بھائی کی محبت میں آ کر میری شرط پوری کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس نے مشہدی کو مارنا چاہا ہوگا لیکن مشہدی کو مارنا اتنا آسان ہوتا تو انڈر ورلڈ پر اس کا راج نہ ہوتا۔''

ناشتا کر کے تیمور فوراً اٹھ گیا۔ ہاشم نے کہا کہ میں یہاں فضول بیٹھ کر کیا کروں گا' میں بھی تیمور کے ساتھ جا رہا ہوں۔

وہ بھی تیمور کے ساتھ چلا گیا۔

میں نے نادیہ سے کہا۔ ''تم تیمور سے وہ سیل فون تو لے آؤ جس پر میں مشہدی سے بات کرتا ہوں۔''

نادیہ فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی ورنہ تیمور نکل جاتا۔

نادیہ کے جانے کے بعد عدنان نے مجھ سے کہا۔ ''بھیا! آخر ہم کب تک اسی طرح زندگی گزارتے رہیں گے؟ میرا ایک سال تو پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے' مجھے لگ رہا ہے کہ میرا دوسرا سال بھی ضائع ہو جائے گا۔ میں بھی گھر میں پڑا پڑا بور ہو گیا ہوں' کمپیوٹر پر میں کب تک دل بہلاؤں؟'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''بھیا! اس فرصت کا ایک فائدہ ہوا ہے' میں نے ہیکنگ شروع کردی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم ہیکر بنو گے؟''

''وکی لیکس بھی تو ہیکر ہی ہے۔''

''تو وہ کون سا ایک سائبر کرائم ہے؟''

''میں جانتا ہوں بھیا!'' عدنان نے کہا۔ ''بھئی کمپیوٹر پر کھیلتے کھیلتے میں نے اتفاق سے ہیکنگ شروع کردی۔''

''یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اور آسان ہے بھی تو تم آئندہ یہ نہیں کرو گے۔''

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ ان چکروں کی وجہ سے عدنان کی تعلیم بری طرح متاثر ہو رہی ہے پھر میں نے اسے بالکل گھر تک محدود کردیا تھا۔ وہ ابھی عمر کے اس دور میں تھا کہ بھٹک بھی سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اسے اسی ہفتے امریکا روانہ کردوں گا۔

میں وہاں سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔ نادیہ' تیمور سے سیل فون لے آئی تھی۔

میں نے اس پر مشہدی کا نمبر ملایا تو اس نے دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ''ہاں عمران.....! کیا فیصلہ کیا؟''

''کس بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم وہ فائل مجھے دے رہے ہو یا نہیں؟''

''میں نے وہ فائل دینے سے کب انکار کیا ہے؟'' میں نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ بولتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے اس کی قیمت ادا کر دو اور فائل لے لو۔ بہ قول تمہارے' تم تو ہر معاملے میں لین دین کے قائل ہو۔''

''دیکھو عمران.....! میری مجبوری کو میری کمزوری مت سمجھو۔ تمہاری تو خیر' حیثیت ہی کیا ہے' میں جب چاہوں' تمہیں چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہوں۔''

''زیادہ بھونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تو مجھے چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہے تو پھر انتظار کیا کر رہا ہے؟ مجھے چیونٹی کی طرح مسل اور وہ فائل حاصل کر لے تو نے غنی بلوچ کو بھی تو چیونٹی کی طرح مسل دیا ہے.....''

''کون غنی بلوچ؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''وہی غنی بلوچ جسے کل رات تیرے کرائے کے بدمعاشوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔''

''اچھا وہ کھپیا.....'' وہ تکبر سے بولا۔ ''وہ جب تک میرے راستے میں نہیں آیا تھا' میں اسے طرح دیتا رہا۔ کل رات اس نے مجھی پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں ایسے آدمی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا جو مجھ پر ہتھیار اٹھائے.....''

''یہ ہی فطرت میری بھی ہے.....'' میں نے کہا۔ ''میں بھی ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتا جو مجھ پہ ہتھیار اٹھاتے ہیں.....''

''تو خود کو سمجھتا کیا ہے؟'' مشہدی کی کھوپڑی اچانک گھوم گئی۔ ''تیری تو بساط ہی کیا ہے' میں نے تو عبداللہ جیسے آدمی کو اس کے خون میں نہلا دیا.....''

''تم نے کبھی اس شخص کا انجام معلوم کرنے کی کوشش کی جس نے عبداللہ پر گولیاں چلائی تھیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ بابر خان کو تم لوگوں نے ہلاک کر دیا' ایسے چھوٹے موٹے مہرے تو ہوتے ہی پٹنے کے لیے ہیں۔''

''تم بھی اس بساط کے بہت حقیر سے مہرے ہو مشہدی.....!'' میں نے کہا۔ ''میں بھی جب چاہوں' تمہیں ملکِ عدم کی سیر کرا سکتا ہوں۔''

''اچھا' یہ بڑی بڑی باتیں چھوڑو' میں تمہیں اس فائل کے دس کروڑ دینے کو تیار ہوں۔''

''صرف دس کروڑ ڈالر؟'' میں نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ''تم نے اس فائل کی بہت کم قیمت لگائی ہے۔''

''چلو دس کروڑ ڈالرز ہی سہی۔'' اس نے کہا۔

''مجھے اس کے بدلے میں کوئی پیسا نہیں چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ڈولی دے دو اور وہ فائل لے لو۔ اصل میں مجھے تمہاری بیٹی بہت پسند آ گئی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ باعزت طریقے سے شادی کروں گا۔ اس کی عزت پر حرف بھی نہیں آئے گا۔''

دوسری طرف کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ میں سمجھا کہ لائن ڈراپ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو' کیا تم لائن پر موجود ہو؟''

''عمران.....! کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟ کیا تم ڈولی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں' میں اس سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہوں۔'' میں نے سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

''کیا تم اس سے شادی کرو گے؟''

''ہاں' میں اسے باعزت طور پر اپنے گھر لے کر آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میرے خاندانی حسب نسب کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''اور یہ شادی کہاں ہو گی؟''

''بھئی' یہیں پاکستان میں ہو گی۔ تم کہو گے تو کسی فائیو اسٹار ہوٹیل میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔''

''اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد تم مجھے وہ فائل دے دو گے؟''

''ڈولی کو رخصت کرانے کے بعد میں وہ فائل تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اس سے پہلے وہ فائل میرے وکیل کے پاس رہے گی۔ میں اسے ہدایت کر دوں گا کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو وہ یہ فائل ملٹری انٹیلی جنس اور آئی ایس آئی کے حوالے کر دے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم وہ فائل پڑھ چکے ہو اور اس کی اہمیت سے بھی واقف ہو؟''

''ظاہر ہے' ورنہ میں تم سے اتنا بڑا مطالبہ نہ کرتا۔''

''اچھا' تم مجھے تین دن کی مہلت دو۔'' مشہدی نے کہا۔

وہ میری اس تجویز پر واقعی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس سے گھن محسوس ہو رہی تھی' وہ ایسا شخص تھا جو اپنے مفادات کے لیے اپنی معصوم بیٹی تک کو داؤ پر لگانے کو تیار تھا۔ اس نے ایک لمحے کو بھی یہ نہ سوچا کہ میں اس کا بدترین دشمن ہوں' وہ میرے پورے گھرانے کا قاتل ہے..... میری بہن کو اغوا کر کے اپنی قید میں رکھ چکا ہے۔ میں شادی کر بھی لیتا تو اس کی بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک کیسے کر سکتا تھا؟

میں سیل فون بہت دیر تک ساتھ لیے اسی صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔

اچانک میری نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پر حزن و ملال کے گہرے سائے۔ اس نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

پہلے تو نادیہ کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اس نے مشہدی سے ہونے والی میری یک طرفہ گفتگو سن لی ہے۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''نادیہ.....! نادیہ.....! ادھر آؤ۔''

لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

میں اٹھ کر اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کی جنبش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اسے آواز دی۔ ''نادیہ ڈارلنگ.....''

اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا' وہ اس عالم میں مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت

لگی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے جان؟ کیا میری کوئی بات بری لگ گئی؟''

''تم انتہائی بے وفا اور خود غرض شخص ہو عمران.....!'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو تمہیں دل و جان سے اپنا سمجھا تھا لیکن.....''

''لیکن کیا جان؟'' میں نے پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا ہے؟''

''تمہیں وہ چڑیل ڈولی اچھی لگتی ہے' تم اس پر دل و جان سے عاشق ہو گئے ہو اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟ اگر وہ تمہیں اتنی ہی پسند ہے تو تم نے مجھ سے محبت کے وعدے کیوں کیے؟''

''ارے..... ارے..... تم اس بات کو دل پر لگا بیٹھی ہو نادیہ جان! تم یقین کرو' میں نے تو آج تک اس کم بخت ڈولی کو دیکھا بھی نہیں ہے پھر اس پہ عاشق کیسے ہو سکتا ہوں؟ میں تو اس گھٹیا آدمی مشہدی کو آزما رہا تھا۔ میں نے اس فائل کے بدلے میں پہلے ڈولی کا مطالبہ کیا تھا تو وہ مشتعل ہو گیا تھا۔ میں نے آج پھر اپنا مطالبہ دہرایا اور اسے یقین دلایا کہ میں ڈولی کو شادی کر کے لے جاؤں گا۔ وہ ذلیل آدمی اس بات پر راضی ہو گیا۔ مجھے حیرت ہے کہ دنیا میں ایسے باپ بھی ہوتے ہیں جو اپنے مفادات کے لیے اپنی بیٹیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں؟''

''تو کیا وہ راضی ہو گیا؟'' نادیہ نے حیرت سے کہا۔

''مجھے اس بات کا افسوس ہے۔ اس نے ایک لمحے کو بھی یہ نہ سوچا کہ میں اس کا بدترین دشمن ہوں..... وہ میرے والدین اور بھائی کا قاتل ہے۔ میں اس کے خون کا پیاسا ہوں تو اس کی بیٹی کو کیسے خوش رکھ سکوں گا؟''

''تو یہ بات تھی؟'' نادیہ نے خجالت سے کہا۔

''تم کیا سمجھیں کہ میں اس کی بیٹی پر واقعی عاشق ہو گیا ہوں؟ اب سے دو سو سال پہلے بھی لوگ عشق کرتے تھے تو اپنے محبوب کی ایک جھلک دیکھ کر کرتے تھے' صرف نام سن کر تو کوئی بھی عشق نہیں کرتا تھا۔''

''آئی ایم سوری عمران!'' نادیہ نے کہا اور میرے سینے سے لگ گئی۔ ''میں نے غصے میں تمہیں نہ جانے کیا کیا کہہ دیا' پلیز' مجھے معاف کر دو۔''

''میں نے تمہاری کسی بات کا بھی برا نہیں مانا جان.....!'' میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں وقتی طور پر ایک غلط فہمی ہو گئی تھی اور تمہارا یہ ردعمل بھی تو شدید محبت ہی کا تو نتیجہ ہے۔''

اچانک تیمور کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر نادیہ تڑپ کر میری آغوش سے نکل گئی۔ تیمور نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔ ''بھیا.....! یہاں اتنا اندھیرا کیوں ہے؟ رات ہو گئی یا مجھے نظر نہیں آ رہا ہے؟''

میں نے تکیہ اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارا اور بولا۔ ''تم ایسے موقع پر ضرور آ جاتے ہو۔''

تیمور نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ''کیسے موقع پر؟''

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ یہ وہ سیل فون تھا جو میں عام طور پر استعمال کرتا تھا۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے الجھ کر بٹن دبایا اور سیل فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے کوئی پاگلوں کی طرح ہنسا..... میں اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

اس کی آواز سن کر میں حیران رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی آواز میں دوبارہ کبھی سنوں گا۔ اس کے باوجود میں نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔ ''کون بول رہا ہے؟''

''واہ! تم ہمیں اتنی جلدی بھول گیا۔ ابھی تو ہمیں مرے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔'' وہ پھر پاگلوں کی طرح ہنسا۔ ''میں بول رہا ہوں تمہارا خادم غنی بلوچ!''

میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ آج کے اخبارات میں اس کی موت کی خبر تھی۔ وہ گینگ وار میں مارا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ بول رہا تھا۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ فائرنگ سے غنی بلوچ کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ پولیس نے اس کی جیب سے نکلنے والی اشیاء اور قومی شناختی کارڈ سے اسے پہچانا تھا۔ اس کی لاش کو اس کے ایک قریبی دوست نے غنی بلوچ کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ اب تک پولیس نے اس کی ڈیڈ باڈی ورثا کے حوالے کر دی ہو گی۔ اب وہی غنی بلوچ مجھ سے فون پر مخاطب تھا۔ اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ غنی بلوچ نے اپنی موت کا ڈراما کیا تھا اور کسی اور کی لاش کو غنی بلوچ بنا دیا تھا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے واجہ؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''یار مجھے تو اب تم سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے بچپن ہی سے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے۔ اب اگر تم بھوت بن ہی گئے ہو تو پھر مجھ سے بات کرنے کی بجائے مشہدی سے بات کرو۔ اب تو تمہارے لیے اسے مارنا بہت آسان ہے۔''

''تم مذاق بھی کر لیتے ہو واجہ؟ ویسے تمہاری قدر میرے دل میں بڑھ گئی ہے۔''

''میں نے ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دے دیا کہ تم میری قدر کرنے لگے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے ہمارے بھائی کو چھوڑ کر ہم پہ احسان کیا ہے' تمہاری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو وہ جھنجھلا کر ہمارے بھائی کو ہلاک کر دیتا۔''

''یار میری دشمنی تم سے ہے' تمہارے بھائی سے نہیں۔ میں اسے کیوں ہلاک کرتا پھر میری دی ہوئی ڈیڈ لائن تو کل ہی پوری ہو گئی تھی۔ اس وقت تک تمہاری موت کی خبر نہیں آئی تھی۔ میں اگر تمہارے بھائی کو ہلاک کرنا چاہتا تو اسی وقت کر دیتا لیکن میں اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے صرف پریشر ڈالنے کے لیے تم سے یہ کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم مشہدی کو ہلاک نہیں کر سکتے اور اگر ایسی کوئی کوشش کرو گے تو خود ہی نقصان میں رہو گے۔ دیکھ لو' وہی ہوا۔ اپنی دانست میں مشہدی نے تمہیں ہلاک کر دیا اور وہ اس پر بہت خوش تھا۔ جانتے ہو' وہ کیا کہہ رہا تھا' غنی بلوچ جیسے لوگ تو میرے لیے کیڑے مکوڑے کی طرح ہوتے ہیں' میں جب چاہوں' انہیں مسل سکتا ہوں۔''

''اس نے ایسا بولا؟'' غنی نے کہا۔

''وہ تو اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا لیکن چھوڑو اس بات کو۔ تم اگر بلوچ ہو تو اپنا وعدہ پورا کرو اور مشہدی کو ٹھکانے لگا دو۔''

''واجہ' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم سے ایک ملاقات ہو جائے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اگر یہ تمہاری کوئی چال ہے تو پھر اس ملاقات کو بھول جاؤ۔''

''کوئی چال نہیں ہے۔'' غنی جلدی سے بولا۔ ''میں تم سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں کوئی شبہ ہے تو وقت اور جگہ تم اپنی مرضی سے طے کرلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد تمہیں بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ غنی بلوچ ابھی مرا نہیں ہے؟'' ہاشم میری یکطرفہ گفتگو سے اندازہ لگا کر بولا۔

''کارٹون اتنی آسانی سے نہیں مرتا۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں تو بچپن سے یہ ہی دیکھتا آیا ہوں۔''

ہم لوگ وہاں سے لاؤنج میں آ بیٹھے۔ نادیہ اُس وقت وہاں آنے سے کترا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں کترا رہی ہے پھر تیمور جانتا تھا۔ وہ کم بخت بھی عین موقع پر نہ جانے کہاں سے نازل ہوجاتا تھا۔

''یار عمران!'' ہاشم نے کہا۔ ''نادیہ پر کھانے وغیرہ کا بہت بوجھ ہے پھر وہ گھر کی صفائی بھی کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم گھر میں دو چار ملازم رکھ لیں۔''

''ملازم!'' میں نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ ہم کس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں اور کس قسم کے حالات سے دوچار ہیں پھر ملازم تو گھر کے بھیدی ہوتے ہیں' وہ کسی بھی وقت ہمیں پھنسوا سکتے ہیں' ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں بک سکتے ہیں۔''

''اس دنیا میں اعتبار کے آدمی بھی تو ہوتے ہیں۔'' ہاشم نے کہا۔

''مثلاً ایسا کوئی آدمی ہے تمہاری نظر میں جس پر اعتبار کیا جائے؟''

''ایسے کئی آدمی ہیں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''دو تین تو تمہارے ملازمین ہی ہوں گے؟'' اس نے کہا۔ ''بلکہ زیادہ ہی ہوں گے۔ ان میں سبھی قابلِ اعتبار ہوں گے۔''

''ہاں' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''نادیہ کو واقعی بہت تکلیف ہے۔ گھر میں کھانا پکانے کا کام ہی اچھا خاصا ہوتا ہے۔''

''میرے پاس تمام ملازمین کے سیل نمبرز ہیں۔ میں انہیں آج ہی بلالوں گا۔ وہ اگر کہیں اور کام بھی کررہے ہوں گے تو وہاں سے چھوڑ کر آجائیں گے۔''

پھر میں نے انہیں مشہدی کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اُس وقت نادیہ بھی کافی لے کر آگئی تھی لیکن وہ تیمور سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ تیمور نے بھی اسے مزید چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔

''مشہدی اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر تیار ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہاں' وہ بہت سنجیدہ تھا۔'' میں نے کہا۔

''عمران!'' ہاشم نے کہا۔ ''مشہدی بہت حرام زادہ ہے۔ وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی تم سے کردے گا۔ وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی بیٹی یہاں کبھی خوش نہیں رہے گی۔ کوئی فرشتہ ہی اس کی بیٹی کو خوش رکھ سکے ورنہ کوئی ایسا انسان جس کی فیملی کے ساتھ اس نے بدترین ظلم کیا ہو چاہتے ہوئے بھی اس کی بیٹی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ میں اسے ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ یہ بھی اس کی کوئی چال ہوسکتی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اس پہلو پر میں نے بھی غور کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''مشہدی جیسا ڈان اتنی آسانی سے اپنی بیٹی کو اپنے دشمن کے حوالے کیسے کرسکتا ہے؟''

''اس فائل میں آخر ہے کیا؟'' ہاشم نے پوچھا۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ''یقین جانو' میں نے ابھی تک وہ فائل نہیں پڑھی۔ تیمور نے پڑھی ہو تو اور بات ہے۔''

''میں نے تو وہ فوٹو گرافس والی فائلیں علیحدہ کرکے تمام کاغذات بریف کیس میں بھر دیئے تھے۔''

''تم پہلا کام یہ کرو کہ وہ فائل یہاں لے آؤ تاکہ ہاشم کو بھی معلوم ہو کہ اس میں ہے کیا؟ وہ ریڈ کلر کی فائل فولڈر ہے اور اس کا نمبر شاید زیرو زیرو ایٹ سیون ہے۔'' میں نے کہا۔

تیمور اُسی وقت وہاں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''اور وہ غنی بلوچ کیا کہہ رہا تھا؟'' ہاشم نے پوچھا۔ ''وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ آپ سے کوئی ڈیل کرنا ہے۔ اگر آپ کو یہ شبہ ہے کہ یہ آپ کے خلاف کوئی چال ہے تو وقت اور جگہ کا تعین آپ کرلیں۔''

تیمور فائل لے کر واپس آگیا۔

میں نے فائل اُس کے ہاتھ سے لے لی اور اُس کی ورق گردانی شروع کردی۔ میں جیسے جیسے اُس فائل کے کاغذات کا مطالعہ کررہا تھا' میرا دورانِ خون بڑھتا جارہا تھا۔

مشہدی نے چند سال پہلے امریکا کی ایک بدنام زمانہ ایجنسی سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے اسے پاکستان میں اس تنظیم کے ساتھ مل کر ایسے حالات پیدا کرنا تھا جن کی وجہ سے حکومت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔ حکومت کو نقصان پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے۔ اس معاہدے میں بھارت کی ''را'' بھی ایک فریق تھی۔ اس کے نیچے نہ صرف مشہدی کے سائن تھے بلکہ امریکن ایجنسی کے سربراہ سائمن ڈیوڈ اور ''را'' کے ایک افسر ارجن گپتا کے بھی دستخط تھے۔ ان کے عزائم بہت خوفناک تھے۔ انہیں پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پہلے مرحلے میں وہ بلوچستان میں انتشار پھیلا کر وہاں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے کہ بلوچستان خدانخواستہ پاکستان سے علیحدہ ہوجائے۔ ان کے ایجنڈے میں بلوچستان کے باغی عناصر اور قوم پرستوں کی بھرپور مدد شامل تھی۔ اس کے لیے فنڈنگ یہودی لابی کررہی تھی اور بھارت بھی پیش پیش تھا۔ دوسرے مرحلے میں وہ لوگ سندھ میں تعصب کی آگ بھڑکا کے سندھی قوم پرستوں کی بھرپور انداز میں مدد کرتے۔ اس کے لیے بھی فنڈنگ وہی لوگ کررہے تھے۔

وہ کراچی کو سندھ سے کاٹ کر سنگاپور کی طرز پر فری پورٹ بنانا چاہتے تھے پھر وہ مرحلہ وار قبائلی علاقوں میں دہشت پھیلاتے۔ وہاں کے حالات تو ان کے لیے یوں بھی سازگار تھے۔ امریکا پہلے ہی وہاں مصروفِ عمل تھا۔ وہ پاکستان دشمن افغانوں سے مل کر ایسی صورتِ حال پیدا کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان آرمی کی پوری توجہ شمالی مغربی بارڈرز پر ہوجائے۔

ان کے عزائم جان کر میرا پورا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ میں نے خاموشی سے وہ فائل ہاشم کی طرف بڑھا دی۔

تھوڑی دیر بعد اس کا بھی یہ ہی حال ہوا۔

پھر تیمور نے اس کا مطالعہ کیا تو اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں مشہدی کو جرائم پیشہ اور کمینہ تو سمجھتا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا ولدالحرام ہے۔ وہ تو انسان کہلانے کا مستحق

بھی نہیں ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ وہ پاکستانی نہیں ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "اس لیے اسے پاکستان سے محبت کیوں ہونے لگی۔ بلوچستان کی صورت میں اسے گریٹر بلوچستان مل جائے گا۔"

اس سے تو ایران کو بھی نقصان ہوگا۔ اس کے پاس بلوچستان کا جو جغرافیائی حصہ ہے، وہ بھی گریٹر بلوچستان میں آجائے گا اور ایران کو بھی اپنے خاصے بڑے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

"اس معاہدے پر کوئی تاریخ بھی ہوگی؟" ہاشم نے کہا۔

"ہاں اس پر 2001ء کی تاریخ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے بعد ہی نائن الیون کا واقعہ پیش آیا تھا اور پاکستان اس میں فرنٹ لائن اسٹیٹ کے طور پر سامنے آیا تھا۔ شاید اس لیے اُن لوگوں نے وقتی طور پر اپنے اس غلیظ منصوبے کو ملتوی کر دیا تھا۔"

"اب سب سے پہلے تو ہمیں آرمی انٹیلی جنس اور آئی ایس آئی کے علم میں یہ بات لانا ہوگی۔" ہاشم نے کہا۔ "اس کے بعد ان کے عزائم کو خاک میں ملانا ہوگا۔ ہمیں اپنی قوت بھی بڑھانا ہوگی۔ یہ لوگ سندھ اور بلوچستان میں سرگرم ہیں۔ وہ وہاں کے بھولے بھالے عوام کو گمراہ کرنے اور ان میں احساسِ محرومی پیدا کرنے میں مصروف ہوں گے۔ دنیا بھر میں ان کا طریقۂ واردات یہ ہی ہوتا ہے۔ وہ پہلے ملک کے اُس طبقے پر حملہ کرتے ہیں جو حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے احساسِ محرومی کا شکار ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی یہ ہی ہوا تھا اور دنیا کے بیشتر ملکوں میں یہ ہی کھیل جاری ہے۔"

"لیکن ہاشم بھائی.....!" تیمور نے کہا۔ "ہم اکیلے ان کے خلاف کہاں تک اور کب تک لڑ سکتے ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ ہمیں بھی اپنی قوت بڑھانا ہوگی اور خاموشی سے ان لوگوں کو، ان آدمیوں کو چن چن کر ختم کرنا ہوگا جو اس مذموم منصوبے کے روح رواں ہیں۔"

"اس کے لیے تو ہمیں سب سے پہلے مشہدی ہی کو نشانہ بنانا ہوگا۔ اسے نشانہ بنانا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیں فنڈز کی ضرورت پڑے گی تو ہم ان ہی لوگوں کا پیسا چھین کر ان ہی لوگوں کے خلاف استعمال کریں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم پہلی فرصت میں عدنان کو امریکا بھجوا دو۔ وہ یہاں رہا تو ذہنی مریض بن جائے گا۔"

"تیمور.....! پہلے تو تم ان کاغذات کی دو چار فوٹو کاپیز اور دو تین مائیکرو فلمز بنالو۔ میں پہلی فرصت میں آرمی کے چیف آف اسٹاف، آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر اور ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر سے رابطہ کرتا ہوں۔ اگر ان لوگوں نے میری رپورٹ کو سیریس لیا تو وہ خود بھی ان لوگوں کے خلاف میدانِ عمل میں آجائیں گے اور ہمارا کام آدھے سے بھی کم رہ جائے گا۔"

"میں ان کاغذات کی فوٹو کاپی تو کرالوں گا لیکن مائیکرو فلم....."

"تم ایسا کرو، پہلے ان ڈاکیومنٹس کی کم سے کم دس دس فوٹو کاپیز بنوا کر لے آؤ۔" ہاشم نے کہا۔ "مائیکرو فلم میں اپنے ایک جاننے والے سے بنوالوں گا۔"

تیمور جانے لگا تو میں نے کہا۔ "ٹھہرو، تم اکیلے مت جاؤ، ہاشم کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

تیمور نے رک کر استفسار طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ بہت ہی حساس نوعیت کے کاغذات ہیں اور تم جانتے ہو کہ مشہدی ان کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اگر یہ کاغذات آرمی والوں کے حوالے کر دیئے گئے اور اس کا جرم ثابت ہو گیا تو وہ سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچے گا۔ ممکن ہے اس کی تمام جائیداد اور بینک بیلنس بھی حقِ سرکار ضبط ہو جائے۔"

"ہاں تیمور.....!" ہاشم نے کہا۔ "تم اکیلے مت جاؤ۔ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" ہاشم نے اپنے ہتھیار چیک کیے اور تیمور کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ تیمور نے وہ فائل پرانے سے ایک خاکی لفافے میں ڈال لی تھی تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس میں کوئی اہم چیز ہے۔

ان کے جانے کے بعد نادیہ نے مجھ سے کہا۔ "عمران.....! اگر ان کاغذات میں اتنا کچھ ہے تو کیا عجب کہ اس فائل کے لیے مشہدی واقعی اپنی بیٹی کی بھینٹ چڑھانے کو تیار ہو؟"

"لیکن اس سے یہ بھینٹ قبول ہی کون کر رہا ہے۔ ایک کیا، وہ اپنی دس بیٹیاں بھی داؤ پر لگا دے تو میں ان دستاویزات کا سودا نہیں کروں گا۔ یہ میرے وطن کی امانت ہیں۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" نادیہ نے کہا۔ "ان لوگوں نے یہ ایگری منٹ 2001ء میں کیا ہے تو اس پہ عمل درآمد ابھی تک کیوں نہیں کیا؟"

"عمل درآمد تو ہو رہا ہے نادیہ!" میں نے کہا۔ "بلوچستان کی صورتِ حال تمہارے سامنے ہے، سندھ میں جو بے چینی پائی جاتی ہے، تم وہ بھی جانتی ہو۔ پنجاب دہشت گرد حملوں کی وجہ سے انتشار کا شکار ہے پھر یہ لوڈ شیڈنگ یہ مہنگائی! یہ سب کیا ہے؟"

"لوڈ شیڈنگ میں ان لوگوں کا کیا عمل دخل؟" نادیہ نے حیرت سے کہا۔

"بھئی، رینٹل پاور والے حکومت سے اربوں روپے لے کر کھا گئے۔ کون جان سکتا ہے کہ ان میں اس نسادی گروپ کے آدمی نہیں تھے۔ ممکن ہے، اپنے لوگوں کے ذریعے انہوں نے رینٹل پاور میں بھی ہاتھ ڈال دیا ہو۔ مجھے ابھی صرف شبہ ہے لیکن قرائن سے تو یہ ہی ظاہر ہے۔ اگر وہ لوگ فیئر ہوتے تو لوگوں کو اتنی مشکلات پیش کیوں آتیں؟"

"یہ تو ان لوگوں کا قصور ہے جو بجلی کے ذمے دار تھے۔"

"نادیہ، تم نے وہ شعر سنا ہے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

کچھ تو ہمارے سیاست دان اور رہنما پہلے ہی سست ہیں، عوام کے مفاد کی بجائے اپنا مفاد سوچتے ہیں، سونے پہ سہاگا یہ کہ انہیں رینٹل پاور کی شکل میں پیسا کمانے کا آسان طریقہ ہاتھ آ گیا۔"

"تم تو ملکی سیاست اور عمومی صورتِ حال پر بہت گہری نظر رکھتے ہو۔" نادیہ نے ہنس کر کہا۔

"ہم جیسے لوگ نظر رکھتے ہیں، اس کے باوجود یہ سیاست دان عوام کی دولت بے دریغ لٹاتے ہیں۔"

"اچھا چھوڑو اس بحث کو، میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاؤں؟"

"یار میں اتنی کافی نہیں پیتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں دن میں صرف تین چار مگ کافی کے پیتا ہوں۔"

"تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟" نادیہ منہ بنا کر بولی۔

''اب تم نے تذکرہ چھیڑ ہی دیا ہے تو جاؤ' کافی لے ہی آؤ۔ ہاں' ایک بات اور سن لو' آج رات سے شاید میرے پرانے ملازم یہاں آ جائیں۔ تمہیں اب گھر کا کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا' سوائے میرے لیے کافی بنانے کے۔''

نادیہ کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ ان کاغذات کو کس کے حوالے کروں؟ کیا میں براہِ راست چیف آف آرمی اسٹاف سے ملوں یا پھر صدرِ پاکستان سے؟ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر پر بھی مجھے پورا اعتبار تھا۔ اس کے علاوہ نہ مجھے پولیس پر اعتبار تھا' نہ کسی سیاست دان پر پھر مجھے غنی بلوچ کا خیال آیا۔ وہ اس جنگ میں میرے ساتھ شریک ہو سکتا تھا۔ وہ اتنا گھٹیا اور کمینہ آدمی نہیں تھا جتنا مشہدی تھا۔ میں نے سوچا کہ تیمور کی واپسی پر ہاشم اور تیمور سے مشورہ کروں گا کہ مجھے غنی بلوچ سے کب اور کہاں ملنا چاہیے۔ یہ تو خیر طے تھا کہ میں اس سے ملاقات کروں گا۔

نادیہ کافی لے کر آئی' تب بھی میں ان ہی خیالات میں گم تھا۔

اس نے کافی کا مگ مجھے دیا تو میں چونک اٹھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''اب ڈارون صاحب کیا غور و خوض فرما رہے ہیں؟''

''ڈارون؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تمہیں اس وقت ڈارون ہی کیوں یاد آیا؟''

''بس یوں ہی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''نادیہ! سگمنڈ فرائیڈ کہتا ہے کہ کوئی بھی خیال بس یوں ہی نہیں آتا' اس کے پیچھے بھی کچھ نہ کچھ عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔''

''اچھا بابا' ہوتے ہوں گے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''شاید ہاشم بھائی اور تیمور آ گئے؟''

''اب تم تیمور سے کیوں گھبرا رہی ہو؟ اس وقت تو میرے اور تمہارے درمیان چار پانچ فٹ کا فاصلہ ہے۔''

''تم بھی تیمور سے کم نہیں ہو۔'' نادیہ نے مسکرا کر کہا اور شرم سے سرخ چہرہ لیے باہر نکل گئی۔

تیمور اور ہاشم نے ان ڈاکیومنٹس کی بہت صاف ستھری اور بہترین فوٹو کاپیز بنوائی تھیں۔ ہاشم نے ان ڈاکیومنٹس کی تین مائیکرو فلمز بھی بنوالی تھیں۔ وہ لوگ واپسی میں فولڈر بھی لیتے آئے تھے پھر انہوں نے خود ہی ان کاپیز کو فولڈرز میں لگا دیا۔ ان کاغذات کی اور بنگل کاپی کو ہاشم نے بہت حفاظت سے لاکر میں رکھ دیا تھا۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر ہم لوگوں نے شام کی چائے پی۔ اُس وقت تک میرے دو پرانے ملازمین پہنچ گئے۔ نیاز چاچا ہمارے بہت پرانے ملازم تھے۔ انہوں نے مجھے گودوں میں کھلایا تھا لیکن اُن کی صحت اب بھی قابلِ رشک تھی۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیٹی کلثوم بھی تھی۔ وہ بہت اچھی کک تھی۔ ہر قسم کے کھانے بنانے میں ماہر تھی۔ نیاز چاچا اوپر کے کام کرتے تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر چوکیدار رحمان گل' مالی اسماعیل' ڈرائیور فیصل جان اور اُس کی بیوی بخت آور بھی پہنچ گئی۔ اُن کے آنے کی وجہ سے ہمارے بنگلے میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔

نیاز چاچا نے کہا۔ ''عمران بیٹا! یہ بنگلا بھی اچھا ہے لیکن ہمارے پرانے بنگلے کی تو بات ہی اور تھی۔''

''فکر مت کریں چاچا!'' تیمور نے کہا۔ ''وہ بنگلا پھر بن رہا ہے اور بالکل اُسی طرح بن رہا ہے۔ دو تین مہینے میں ہم پھر اپنے اُسی بنگلے میں چلے جائیں گے۔''

اُسی وقت نادیہ کسی کام سے لاؤنج میں آئی تو نیاز چاچا اور مالی بابا نے اُسے میری بیوی سمجھ کر خوب دُعائیں دیں۔ نیاز چاچا نے کہا۔ ''بیٹی! اللہ تمہارے قدم بھاگوان ثابت کرے۔ دودھوں نہاؤ' پُوتوں پھلو۔'' پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''عمران بیٹا! تم نے خاموشی سے شادی بھی کر لی اور ہمیں اطلاع تک نہیں دی؟''

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ نیاز چاچا نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔

انہوں نے جیب سے سو روپے کا ایک مڑا تڑا نوٹ نکالا اور نادیہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا! میں غریب آدمی ہوں' یہ پیسے تمہارے لیے کچھ بھی نہیں ہوں گے لیکن میری خوشی کی خاطر انہیں رکھ لو۔ ہم لوگ بہو کا منہ دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔ رکھ لو بیٹا!''

نادیہ نے شرم سے سرخ پڑتے ہوئے چہرے سے میری طرف دیکھا پھر کانپتے ہاتھوں سے وہ نوٹ لے لیا۔

مالی بابا نے بھی دیکھا دیکھی اپنی دھوتی کی ڈب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور نادیہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''لو بیٹا! اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ ویسے ہمارے عمران بابا لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں میں ایک ہیں۔''

نادیہ نے پھر میری طرف دیکھا کہ میں اس سلسلے میں کچھ کہوں گا لیکن میں خاموش رہا۔

تیمور نے یہ صورتِ حال دیکھ کر نعرہ لگایا۔ ''اے میرے یا مولا! میں کیہڑے پاسے جاواں!'' یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

میں لاؤنج میں پہنچا تو ہاشم اور تیمور بھی وہیں آ گئے۔ میں نے ہاشم سے کہا۔ ''ہاشم! میں غنی بلوچ سے آج ہی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ وقت اور جگہ کا تعین تم کرو۔''

''اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''تم اسے آٹھ بجے شیرٹن کے کسی ریسٹورنٹ میں بلا لو۔ میں کسی ریسٹورنٹ کا نام اس لیے نہیں لے رہا کہ ہم اسے جس ریسٹورنٹ میں بلائیں گے' اس میں ملاقات نہیں کریں گے بلکہ کسی دوسرے ریسٹورنٹ میں ملیں گے۔ پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع اسے اُس وقت دی جائے گی جب وہ شیرٹن پہنچ کر ہمارے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں داخل ہو چکا ہوگا۔ میں اور تیمور دور رہ کر آپ کو گور دیں گے اور اردگرد نگاہ رکھیں گے۔ ممکن ہے' اس کے کچھ آدمی بھی وہاں موجود ہوں۔ ان کی وہاں موجودگی کے چانس پوائنٹ ون پرسنٹ ہیں لیکن ہم پوائنٹ ون پرسنٹ کا رسک بھی کیوں لیں؟''

''بھیا! ہم نادیہ کو بھی تو لے جا سکتے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہ بے چاری بھی گھر میں بند رہ رہ کر اکتا گئی ہے۔''

''ہم کسی پکنک یا پارٹی میں نہیں جا رہے ہیں تیمور!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس سے پہلے نادیہ کی وجہ سے اچھا خاصا تماشا ہو چکا ہے۔ اسے پھر کسی موقع پر باہر کی سیر کرا دیں گے۔ تم اسے اِس وقت کیوں لے جانا چاہتے ہو؟''

''میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی تھی۔ گھر میں اب اس کی ذمے داری بنتی ہے۔ ہر ملازم اپنے اپنے کام میں معروف ہو گیا ہے اس لیے.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

•.....•.....•.....•

میں ہوٹل شیرٹن کے کسی ریسٹورنٹ میں پہنچنے کی بجائے سیونتھ فلور کے ایک کمرے میں بیٹھا تھا۔ یہ بھی ہاشم ہی کا مشورہ تھا۔ ریسٹورنٹ یا ہال کے مقابلے میں کمرے کی نگرانی کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے اور کسی بھی چال کی

صورت میں اس کے کامیاب ہونے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں۔

ہاشم شیرٹن کے داخلی دروازے پر تھا۔ تیمور اس ریسٹورنٹ میں موجود تھا جس کے بارے میں غنی بلوچ کو گیا تھا۔

میں سیونتھ فلور کے روم نمبر 708 میں موجود تھا اور ہر طرح سے مسلح تھا۔ ہاشم اور تیمور کا پلان یہ تھا کہ جب بلوچ کمرے میں آجائے گا تو ہاشم بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو جائے گا۔ تیمور فلور کے کوریڈور رہ کر نگرانی کرے گا کہ غنی بلوچ کا کوئی آدمی تو وہاں نہیں آیا ہے؟

میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ غنی بلوچ نے جو وقت دیا تھا اس کے مطابق تین منٹ زیادہ ہو چکے تھے۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجی۔ میں نے اسکرین پر نظر دوڑائی وہ تیمور کی کال تھی۔ میں نے فوراً ریسیو کر لی۔ ''ہاں تیمور؟'' میں نے پوچھا۔

''غنی بلوچ ریسٹورنٹ میں داخل ہو چکا ہے۔'' تیمور نے کہا۔

میں نے لائن کاٹ کر فوراً غنی بلوچ کا نمبر ملایا۔

''ہاں ولجہ! کدھر ہو تم؟''

''میں اسی ہوٹل کے روم نمبر سیون زیرو ایٹ میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سیونتھ فلور!''

''ولجہ! تمہیں ابھی تک غنی بلوچ پر اعتبار نہیں ہوا۔''

''تم سیدھے اوپر چلے آؤ۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کر ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا پھر ہاشم کا نمبر ملایا۔ اس نے کہا کہ مجھے تیمور نے بتا دیا ہے۔ میں اوپر آ رہا ہوں۔

چند منٹ بعد میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ چہرے پر نیگروز کی طرح ہلکی ہلکی داڑھی تھی اور پیروں لانگ شوز تھے۔ مجھے اس کی جیکٹ کے ابھار سے معلوم ہو گیا کہ اس نے بغلی ہولسٹر لگا رکھا ہے۔ مجھے حیرت کہ وہ ہوٹل کے انٹرنس پر واقع ہیکنز سے کیسے نکلا؟ ہیکنز تو فوراً بتا دیتا ہے کہ گزرنے والا مسلح ہے۔ بہر حال کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ میں خود بھی دو دو ریوالور لے کر آیا تھا لیکن میں نے یہ کام تنہا نہیں کیا تھا اس تیمور اور ہاشم نے میری معاونت کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ غنی بلوچ بھی اکیلا نہیں ہے یا پھر اس ہوٹل اس کے ایسے ہمدرد موجود ہیں جو ہتھیار اندر لانے میں اس کی مدد کر سکتے ہیں۔

''آؤ غنی بلوچ.....!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''تم تو وقت کے بہت پابند ہو۔''

''میں چار منٹ لیٹ ہوں ولجہ!'' اس نے ہنس کر کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اکیلے آنا اس کے باوجود تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا؟'' میں نے کہا۔

''میں تو بالکل اکیلا آیا ہوں ولجہ!''

''میرے آدمی اس ہوٹل کے نیچے اب بھی موجود ہیں غنی!'' میں نے اسے مرعوب کرنے کو کہا۔ ''ان نظروں میں تمہاری ایک ایک حرکت ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''تم مسلح ہو کر کیوں آئے ہو؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''میں مسلح ہو کر خاص طور پر یہاں کے لیے نہیں آیا ہوں ولجہ! آپ بھی جانتے ہو کہ مجھے ہر وقت ہتھیار کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہ مشہدی کتا میرے پیچھے ہے۔''

''لیکن تم اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ہتھیار لے کر کیسے داخل ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے آپ داخل ہوئے ہو؟'' اس نے ہنس کر کہا پھر بولا۔ ''ولجہ.....! کیا ساری بات کھڑے کھڑے ہی کرو گے یا مجھے بیٹھنے کو بھی کہو گے؟''

''آؤ بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ ''دراصل مجھے اپنے ایک خاص آدمی کا انتظار ہے۔ وہ آ جائے تو پھر بات چیت شروع کرتے ہیں۔''

''ولجہ.....! اب تمہاری طرف سے وعدے کا خلاف ورزی ہوا ہے۔'' اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

''کیسا وعدہ؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے تم سے کب وعدہ کیا تھا کہ میں تنہائی میں تم سے ملوں گا؟''

''چلو ٹھیک ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''مجھے آپ پر اعتبار ہے۔''

''یہ بتاؤ کیا پیو گے؟'' میں نے کہا۔ ''وہسکی کے علاوہ میں تمہیں ہر چیز پلا بھی سکتا ہوں اور کھلا بھی سکتا ہوں۔''

''کوئی کولڈ ڈرنک منگا لو ولجہ!'' غنی بلوچ نے کہا۔ ''میرا حلق خشک ہو رہا ہے اور کام کے وقت میں ویسے بھی وہسکی یا کوئی بھی نشہ نہیں لیتا۔''

''اچھا کرتے ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

پھر فریج سے کولڈ ڈرنک کی دو یخ بوتلیں نکالیں اور انہیں کھول کر گلاسوں میں انڈیلنے لگا تو غنی بلوچ نے کہا۔ ''گلاس ملاس کا تکلف چھوڑو ولجہ! ہم لوگ تو بوتل سے پینے کا عادی ہے۔'' میں نے اس کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی اور اپنی بوتل گلاس میں انڈیل لی۔

ابھی میں نے ایک ہی سپ لیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے گلاس رکھ کر دروازہ کھولا۔ میں سمجھا کہ ہاشم ہو گا لیکن ہاشم کی بجائے دو آدمی مجھے دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔

''کیا بدتمیزی ہے؟'' میں جھنجلا کر بولا۔ ''تم لوگ ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟''

جواب دینے کی بجائے ان میں سے ایک نے جیب سے ریوالور نکال لیا اور درشت لہجے میں بولا۔

''ہم لوگ موت کے فرشتے ہیں.....'' ریوالور بردار قلمی بدمعاشوں والے انداز میں بولا۔ ''اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔''

میں نے گردن خفیف سے انداز میں گھما کر غنی بلوچ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ غنی بلوچ اپنی جگہ پر نہیں تھا نہ صرف وہ موجود نہیں تھا بلکہ اس کی بوتل بھی غائب تھی۔

''اچھا تو تم موت کے فرشتے ہو؟'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ''ویسے موت کے فرشتے بھی اب خاصے ماڈرن ہو گئے ہیں۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ پہن کر آتے ہیں اور ریوالور رکھتے ہیں۔''

''ابھی ساری شوخی ہوا ہو جائے گی۔'' ریوالور بردار ریوالور لہرا کر بولا۔ ''ہم پورا بندوبست کر کے آئے ہیں۔''

اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اُن دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میرے لیے

اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے ریوالور بردار کی کنپٹی پر زوردار پنچ رسید کر دیا' دوسرے آدمی نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن میری راؤنڈ کک اس کے سینے پر پڑی۔ وہ بھی اپنے ساتھی کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ اس دوران میں غنی بلوچ بیڈ کے پیچھے سے جمپ لگا کر باہر نکل چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''واجہ......! تم تو بجلی کی مانند حرکت کرتا ہے۔ تم نے ہمیں خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ تم تو اپنے بھائی سے بھی اچھا فائٹر ہے۔''

''یہ لوگ کون ہیں غنی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ لوگ......'' غنی نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے ان لوگ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' دروازے پر اس مرتبہ زوردار دستک ہوئی۔

ان لوگوں نے اندر آنے کے بعد دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک کو لات سے ایک طرف دھکیلا کیونکہ وہ دروازے کے عین درمیان میں پڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ہاشم پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا پھر اس کی نظر ان بے ہوش آدمیوں پر پڑی جو دروازے کے سامنے ہی پڑے تھے۔ اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنا ریوالور نکال لیا اور جھپٹ کر کمرے میں آ گیا پھر بولا۔ ''عمران! سب خیریت تو ہے؟''

''ہاں' خیریت ہی ہو گئی۔ اگر تم دروازے پر دستک نہ دیتے تو شاید خیریت نہ ہوتی۔''

ہاشم نے اچانک غنی بلوچ پہ ریوالور تان لیا اور بولا۔ ''اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور منہ دیوار کی طرف کرو۔''

غنی بلوچ نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر بادل ناخواستہ اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔

ہاشم نے آگے بڑھ کر غنی بلوچ کی تلاشی لینا چاہی لیکن اس نے اپنی ایڑی سے ہاشم کو بیک کک ماری جو اس کے سینے پر لگی۔ ہاشم اچھل کر کچھ فاصلے پر جا گرا۔ غنی بلوچ بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور اپنا ریوالور کھولنا چاہتا تھا کہ ہاشم نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اپنے ہاتھ قابو میں رکھو غنی بلوچ' ورنہ میں لیٹے لیٹے بھی فائر کر سکتا ہوں۔''

غنی بلوچ نے اپنا ہاتھ اوپر کر لیا اور مجھ سے شکایتی انداز میں بولا۔ ''یہ سب کیا ہے واجہ؟ میں آپ پر اعتبار کر کے ادھر آیا تھا۔ آپ کا آدمی میرے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے؟''

''یہ دونوں کون ہیں غنی بلوچ؟'' ہاشم نے پوچھا۔ ''تم سے تو اکیلا آنے کو کہا گیا تھا۔''

''میں تو خود نہیں جانتا کہ یہ لوگ کون ہیں؟'' غنی بلوچ نے کہا۔ ''یہ لوگ اچانک ہی آیا تھا۔ ان لوگ نے جب عمران واجہ کو دھکا دیا تو ہم اپنا کولڈ ڈرنک کی بوتل لے کر جمپ لگا کے بیڈ کی دوسری طرف چلا گیا اور وہاں سے چھپ کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ اگر آپ نہیں آتا تو ہم ان لوگ کو چھوڑتے نہیں' ویسے تو عمران واجہ نے ان پر قابو پا ہی لیا تھا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ہاشم!'' میں نے کہا۔ ''یہ دونوں اگر اس کے ساتھی ہوتے تو غنی کو بیڈ کے پیچھے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ تو ان لوگوں کی مدد کرتا۔''

''پھر یہ کون لوگ ہیں؟'' ہاشم الجھ کر بولا۔

''یہ تو ہوش میں آنے کے بعد یہ لوگ خود ہی بتائیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں اور ادھر کیوں آئے ہیں؟'' پھر غنی بلوچ چونک کر بولا۔ ''واجہ......! ہمارا بات مانو تو ادھر سے نکل چلو۔ ہم کو ادھر خطرے کا بُو آ رہا ہے۔''

اس کی بات دل کو لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں بھی خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ لوگ تنہا نہیں ہوں گے' ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوٹل کے باہر یا اندر موجود ہوں گے۔

''ہاشم......! ان دونوں کو اٹھا کر باتھ روم میں ڈالو اور یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کاؤنٹر پر دو دن کا ایڈوانس کرایہ ادا کیا ہے۔ چیک آؤٹ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یوں بھی میں نے ہوٹل کے ریکارڈ میں اپنا نام غلط لکھوایا ہے۔ ہاں' جانے سے پہلے ان دونوں کی کھوپڑیاں ایک مرتبہ پھر سہلا دینا۔''

پھر میں نے تیمور کو ٹیلی فون کیا۔ ''تیمور......! تم گاڑی سے مین گیٹ پر پہنچو' ہم لوگ ہوٹل سے باہر آ رہے ہیں اور اپنے اردگرد نظر رکھنا۔'' یہ کہہ کر میں نے غنی سے کہا۔ ''تم جلدی سے اپنی کولڈ ڈرنک ختم کر لو۔''

غنی مسکرا کر بولا۔ ''واجہ......! اب تو کولڈ ڈرنک کسی دوسری جگہ جا کر پئیں گے۔ یہ تو گرم ہو گئی۔''

اُس وقت تک ہاشم ان لوگوں کو باتھ روم میں منتقل کر چکا تھا۔ ان دونوں کے ریوالورز اس نے ناکارہ کر دیئے تھے۔ ان کے میگزین نکال کر انہیں فلیش ٹینک میں ڈال دیا تھا اور ان کی جیبوں کی تلاشی لے کر جیبوں کی ہر چیز نکال لی تھی۔ ان کے سیل فون بھی ہاشم نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔

ہم تینوں ہوٹل سے یوں نکلے کہ سب سے آگے میں تھا۔ میرے پیچھے غنی تھا اور اس کے پیچھے ہاشم تھا۔

ہوٹل سے مین گیٹ سے نکلتے ہی ہمیں تیمور نظر آیا۔ وہ اپنی لینڈ کروزر میں وہاں کھڑا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور اس نے کوئی بات کیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔

''تیمور......!'' میں نے کہا۔ ''ذرا اپنے عقب کا بھی دھیان رکھنا۔ ممکن ہے' ہمارا تعاقب کیا جائے؟''

''میں پوری طرح دھیان رکھ رہا ہوں بھیا!'' تیمور نے کہا۔ ''اس وقت تک مجھے کوئی مشتبہ گاڑی نظر تو نہیں آ گئی۔ میں مزید تسلی کے لیے گاڑی کو مزید دو چار چکر دیتا ہوں۔ کوئی گاڑی اگر تعاقب میں ہو گی تو معلوم ہو جائے گا۔''

اس نے گاڑی خاصی رفتار سے دوڑانا شروع کر دی۔

ہاشم' تیمور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ غنی میرے ساتھ عقبی نشست پر تھا۔ غنی نے آہستہ سے پوچھا۔ ''واجہ......! یہ لڑکا تیمور ہے نا! جو ڈرائیونگ کر رہا ہے؟''

''ہاں......!'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''میں نے اسے ایک دو مرتبہ ارسلان صاحب کے ساتھ دیکھا تھا' بہت ہی جی دار لڑکا تھا' بلا کا نشانے باز اور آخری دم تک مقابلہ کرنے والوں میں سے ہے۔'' غنی بلوچ نے کہا۔

''تم نے اسے ایکشن میں کب دیکھ لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دو سال پرانی بات ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر مجھ سے بولا۔ ''بجائے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے' ہم کسی درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔''

''تیمور......!'' میں نے کہا۔ ''میدان صاف ہے یا......''

''میدان بالکل صاف ہے بھیا!'' تیمور نے کہا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ گاڑی ہوٹل جبیس کی طرف لے لو۔ ہم وہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔''

تیمور نے گاڑی کا رخ گھمایا۔ ہم لوگ بیس منٹ کے اندر اندر ہوٹل جبیس پہنچ گئے۔

ہوٹیل کے ہال میں کونے کی ایک میز منتخب کرنے کے بعد ہم وہاں بیٹھ گئے۔ جب تک ویٹر نے کولڈ ڈرنکس اور کافی سرو کی' غنی بلوچ خاموش رہا۔

ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔ ''دیکھو واجہ.....! مشہدی تمہارا بھی دشمن ہے اور ہمارا بھی دشمن ہے۔ لوگ اکیلے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مل کر کام کریں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''اس بات کی کیا گارنٹی ہے غنی بلوچ' کہ ہمیں ڈبل کراس نہیں کرو گے؟''

''میں بھی تو آپ پر اعتبار کر رہا ہوں' آپ سے کوئی گارنٹی نہیں مانگ رہا۔ اگر آپ گارنٹی ہی چاہتے ہو تو ہمارے چھوٹے بھائی کو گارنٹی کے طور پر اپنے پاس رکھو۔ ہم کو دنیا میں سب سے زیادہ پیارا وہی ہے۔''

''لیکن غنی!'' میں نے کہا۔ ''کراچی میں بلکہ ملک میں اور دوسرے طاقت ور گینگ بھی ہیں جن کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہو پھر ہم ہی کیوں؟ ہمارا تو کوئی گینگ بھی نہیں ہے۔''

''یہ جتنے بھی کرمنل گروپ ہیں واجہ! یہ سب اپنی غرض کے بندے ہیں۔ وقت پڑنے پر یہ اپنے سگے بھائی کی پیٹھ میں بھی چھرا گھونپ سکتے ہیں۔ آپ لوگ پروفیشنل نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کے لیے' ایک کاز کے لیے مشہدی سے لڑ رہا ہے۔ عبداللہ بھی ایک کاز کے لیے مشہدی کے مقابلے پر تھا' بس اس لیے آپ پر اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

میں نے ہاشم کی طرف دیکھا پھر تیمور کی طرف دیکھا۔ غنی بلوچ ذہین آدمی تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''واجہ! اگر تم اپنے آدمیوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہو تو آرام سے مشورہ کرو۔ میں تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔''

''ارے نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

وہ میرے منع کرنے کے باوجود وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے ہاشم سے پوچھا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟ کیا ہمیں غنی بلوچ کی باتوں پر اعتبار کر لینا چاہیے یا اسے ابھی مزید انتظار کرنے کو کہنا چاہیے؟ یا پھر اس سے صاف انکار کر دینا چاہیے؟''

''عمران! میرے خیال میں اس کے ساتھ کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مجھے تو یہ آدمی قابلِ اعتبار لگ رہا ہے۔ یہ جیسا اندر سے ہے' ویسا ہی باہر سے بھی ہے۔''

میں نے تیمور کی طرف دیکھا۔

''بھیا! میں بھی ہاشم بھائی کی بات سے متفق ہوں۔ جو آدمی اپنے بھائی کو بطور یرغمال ہمارے پاس رکھنے کو تیار ہو' وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اسے بھی کسی مضبوط سہارے کی تلاش ہے اور ہم بھی کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں جو کسی کڑے وقت میں ہمارے کام آ سکے۔ غنی بلوچ کافی عرصے سے اس دھندے میں ہے' وہ اس دھندے کی باریکیاں سمجھتا ہے جبکہ ہم اسلحہ اور منشیات کی اسمگلنگ کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہیں پھر غنی بلوچ ایک طرح سے پانی کا کیڑا ہے' وہ سمندر کے چپے چپے سے واقف ہے۔ اس کا بچپن اسی سمندر کی لہروں سے لڑتے اور مچھلیاں پکڑتے گزرا ہے۔ آپ کو یاد نہیں کہ وارثی صاحب نے اس کے بارے میں کیا کہا تھا؟''

''گویا تم دونوں کی رائے بھی یہ ہے کہ ہمیں غنی بلوچ سے ہاتھ ملا لینا چاہیے۔'' میں مسکرا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے

جو بچوں کی رائے' سو وہ میری رائے۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میں کوئی بھی کام مشاورت کے بغیر نہیں کرتا۔'' پھر میں تیمور سے بولا۔ ''تیمور! اب ہمیں اپنی سیکورٹی کی ضرورت بھی پڑے گی۔ اب مشہدی پوری قوت سے ہمارے مقابلے پر آئے گا اور ضروری نہیں کہ اگر اسے اب تک ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں ہوا تو اب بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس کتنے ایسے آدمی ہیں جن پر ہم اعتبار کر سکتے ہیں؟''

تیمور نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔ ''میرے پاس سات ایسے بہترین آدمی ہیں جو کسی بھی طور اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈوز سے کم نہیں ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ندیم بھی شامل ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے بلکہ بہترین سرجن بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہترین کمانڈو بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے' کل تم اپنے آدمیوں کو بنگلے پر بلا لو۔'' پھر میں ہاشم سے مخاطب ہوا۔ ''ہاشم! تمہارے رابطے میں ایسے کتنے آدمی ہیں؟''

''آدمی تو بہت ہیں عمران!'' ہاشم نے کہا۔ ''لیکن میں بہت محتاط رہ کر کام کرنے کا عادی ہوں۔ میرے رابطے میں اس وقت صرف چار آدمی ایسے ہیں جن پر ہم آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتے ہیں۔ وہ چار آدمی بھی بس پر بھاری ہیں۔''

''کیا خیال ہے' غنی بلوچ کو اپنے موجودہ پتے سے آگاہ کر دیا جائے؟'' تیمور نے کہا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی تو میں اسے مزید آزماؤں گا پھر ہمارا بنگلا بن کر تیار ہو جائے گا۔ ہمیں ایک نہ ایک دن تو وہاں شفٹ ہونا ہی ہے۔ ہم جب نئے بنگلے میں شفٹ ہوں گے تو سب کو اس ٹھکانے کا علم ہو جائے گا۔''

''لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا' ہمارے پاس کم از کم دو ٹھکانے ایسے ہونا چاہئیں جنہیں ہم ضرورت کے وقت استعمال کر سکیں۔''

اس وقت مجھے غنی بلوچ سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا اور وہ انتہائی بھونڈے انداز میں سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''غنی! جب تم سگریٹ نہیں پیتے ہو تو پھر خود پر یہ جبر کیوں کر رہے ہو؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے تمہیں سزا کے طور پر سگریٹ پینے کا حکم دیا ہو۔''

غنی بھی میری بات پر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''واجہ! میں وقت گزاری کے لیے ہوٹیل سے باہر نکل گیا تھا۔ میں نے سوچا' ٹائم پاس کرنے کے لیے سگریٹ ہی پی لوں۔ میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ اور لائٹر خرید لیا پھر کافی دیر تک میں وہیں فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا۔ آخر میں نے پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ نکال ہی لیا اور اسے پیتا ہوا اندر آ گیا۔''

''ویسے تو تمہارے جانے کی کوئی خاص ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے ساتھ مل کر کام کریں گے۔''

''تو پھر میں اپنے بھائی کو کب بھیجوں یا آپ کا کوئی آدمی اسے لے جائے گا؟''

''کیوں' تمہارے بھائی کا ہم کیا کریں گے؟'' میں نے کہا۔

''آپ اسے اپنے ساتھ رکھو' وہ آپ کے ساتھ رہے گا تو.....''

''بس کرو غنی.....!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جس طرح تم نے ہم پر اعتبار کیا ہے' اسی طرح ہم بھی

تم پر اعتبار کر رہے ہیں۔"

"تو واجہ پھر ملاؤ ہاتھ۔" غنی بلوچ نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ جوابی طور پر میں نے بھی گرفت سخت کر لی۔

پھر اس نے ہاشم اور تیمور کے ساتھ انتہائی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "عمران واجہ! ابھی میں نے لوگ کو اپنا دوست بول دیا ہے۔ اب کبھی آزمالینا' جہاں تمہارا پسینا گرے گا' وہاں غنی بلوچ کا خون گرے گا بلوچ زبان کا دھنی ہے۔"

"تم ہمیں بھی ایسا ہی پاؤ گے غنی!" میں نے کہا۔

"اس خوشی میں کچھ کھانا پینا ہو جائے؟" غنی نے کہا۔

"یار' کھانا تو ہم اب اکٹھے ساتھ کھائیں گے۔ اس وقت تو میں کیک منگا رہا ہوں۔ کیک کھا کر منہ میٹھا کرو۔" میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ویٹر کو اشارہ کیا اور جب وہ میری طرف آیا تو میں نے کیک لانے کو کہا۔

پھر میں نے غنی سے پوچھا۔ "یار یہ تو بتاؤ' تم نے اپنی موت کا ڈراما کیوں رچایا؟ کیا مشہدی اتنا بے وقوف ہے کہ اس نے تمہاری موت پر یقین کر لیا ہوگا؟"

"ہاں' اس نے یقین کر لیا ہے۔" غنی بلوچ نے کہا۔

اُس دن کافی دیر سے مشہدی کی تلاش میں تھا۔ میرے کچھ آدمی مشہدی کے آدمیوں سے ملے ہوئے تھے۔ وہی مجھے خبریں پہنچا رہے تھے کہ مشہدی اس وقت کہاں ہے؟ اپنے بھائی کی وجہ سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس میں ہر قیمت پر مشہدی کو ختم کر دوں گا۔ مجھ پہ جنون سا طاری تھا۔ اسی وقت میرے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ مشہدی اپنے کسی بیمار ساتھی کو دیکھنے سولجر بازار جا رہا ہے۔ سولجر بازار تو ایک طرح سے میرا گھر ہے۔ میں نے اسے وہیں گھیرنے کا پلان بنایا۔ جب مشہدی وہاں پہنچا تو میں نے اپنے ایک آدمی آتو کو بھیجا اور اس سے کہا کہ جب مشہدی اس مکان میں داخل ہو جائے تو مجھے اطلاع دے دینا۔ آتو اپنے تین آدمیوں کے ساتھ گیا لیکن مشہدی پورا شیطان ہے' اسے کہیں سے سن گن مل گئی کہ میں اسے قتل کرنے کے ارادے سے آ رہا ہوں۔ اس نے اپنے ساتھی کو دیکھنے کی بجائے اس کے گھر پہ اپنے کچھ مسلح ساتھیوں کو چھوڑا اور خود وہاں سے نکل گیا۔ آتو جب وہاں پہنچا تو مشہدی کے آدمیوں نے اسے پہچانے بغیر اس پر فائر کھول دیا۔ میرے آدمیوں نے بھی جوابی فائرنگ کی لیکن مشہدی کے کتوں نے اتنی اچانک فائرنگ کی تھی کہ آتو کا نہ صرف جسم بلکہ چہرہ بھی گولیوں سے برسٹ سے ناقابلِ شناخت ہو گیا۔ جب تک میں وہاں پہنچا' وہ کتے اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ مجھے آتو کی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ اس نے بے شمار دفعہ میرے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔

پھر اچانک مجھے ایک خیال آیا' آتو کا قد و قامت اور جسامت تقریباً میری طرح تھی۔ میں نے اس کی جیب سے اس کی تمام چیزیں نکالیں اور اپنا قومی شناختی کارڈ' اپنا پرس اور وہ تمام چیزیں اس کی جیب میں ڈال دیں جس سے یہ لگے کہ وہ لاش میری ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پہنی ہوئی سونے کی زنجیر بھی اس کے ہاتھ میں ڈال دی اور وہاں سے واپس آ گیا۔ میں نے اپنے ایک خاص آدمی سے کہہ دیا تھا کہ وہ نہ صرف خود میری لاش شناخت

کرے بلکہ میری ماسی کو بھی یہ ہی بتائے کہ وہ لاش غنی ہی کی ہے۔ ماسی بے چاری کو آنکھوں سے بھی کم نظر آتا ہے پھر آتو کے جسم پر کپڑے بھی اس قسم کے تھے جیسے میں استعمال کرتا ہوں۔ سب سے بڑی نشانی سونے کی وہ زنجیر تھی جو میں ہمیشہ اپنے ہاتھ میں پہنے رہتا تھا پھر پولیس نے بھی اس لاش کو میری لاش تسلیم کر لیا۔ ایسے کیسوں میں پولیس عموماً دوبارہ چھان بین نہیں کرتی۔ گینگ وارز تو ہوتی رہتی ہیں' اس میں دونوں طرف کے لوگ بھی مارے جاتے ہیں۔ پولیس بس ضابطے کی کارروائی کرتی ہے اور لاش ورثا کے حوالے کر دیتی ہے۔

اس دوران میں ویٹر کیک لے آیا تھا۔ ہم لوگوں نے کیک کاٹا اور اسے کھانے بھی جا رہے تھے۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سترہ تاریخ کو مشہدی کا ایک بڑا کنسائنمنٹ آ رہا ہے' اس میں لاکھوں ڈالر کا اسمگل شدہ اسلحہ ہوگا۔ میں اس کا وہ جہاز کراچی پہنچنے سے پہلے کھلے سمندر میں غرق کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"لیکن کیسے؟" تیمور نے پوچھا۔ "تم منوں وزنی جہاز کیا اپنی اس کھلونا نما بوٹ سے تباہ کرو گے یا پھر کسی آبدوز کے ذریعے اسے غرق کرو گے؟"

"واجہ! میں چھ سال کی عمر سے سمندر کی لہروں سے کھیل رہا ہوں۔" غنی بلوچ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ کراچی سے تقریباً تیس' چالیس ناٹ (بحری میل) کے فاصلے پر باہر سے آنے والے جہاز رک جاتے ہیں اور پورٹ پر آنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کی باری کبھی تو دو دن ہی میں آ جاتی ہے اور کبھی دس دن بھی لگ جاتے ہیں۔ میں اس عرصے میں اپنا کام دکھا دوں گا۔"

"اس سلسلے میں ہماری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دینا۔ لاکھوں ڈالر کا یہ نقصان مشہدی ٹھنڈے پیٹوں ہضم نہیں کر سکے گا۔"

"آپ میں سے بوٹ ماہرانہ انداز میں کون چلا سکتا ہے؟" غنی بلوچ نے پوچھا۔

"میں ہر قسم کی بوٹ اور اسٹیمر چلاتا رہا ہوں۔" ہاشم نے کہا۔ "میں ایک زمانے میں مشہدی کے بہت قریب تھا۔"

غنی بلوچ نے غور سے ہاشم کی شکل دیکھی پھر پرجوش لہجے میں بولا۔ "ارے..... آپ وہ ہاشم خان ہو..... میں نے آپ کو چھ سات سال پہلے مشہدی کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں کافی دیر سے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟ مشہدی کی طرف میرا دھیان اس لیے نہیں گیا کہ مشہدی کا کوئی ساتھی واجہ عمران کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ تو صاحب' بہت ماہر ہو۔ میں نے آپ کے بارے میں لوگوں سے بھی سنا ہے اور ایک دفعہ خود بھی دیکھا ہے جب آپ نے ایک لائٹ اسٹیمر کے ذریعے کوسٹ گارڈز کی ایک لانچ کو ذاج دیا تھا۔ بس تو پھر میں اپنے مشن میں آپ ہی کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا۔ "غنی بلوچ! تم بہت زیادہ محتاط رہنا۔ اگر مشہدی کو معلوم ہو گیا کہ تم ابھی زندہ ہو تو وہ پھر تمہارے پیچھے لگ جائے گا۔ ہو سکے تو اپنے حلیے میں کچھ تبدیلی کر لو۔"

"حلیہ تو واجہ! ہم نے بدل لیا ہے۔" غنی نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو اگر معلوم نہیں ہوتا تو کیا آپ مجھے پہچان سکتے تھے؟"

"میں نے تمہیں صرف ایک مرتبہ ناصر کے ہوڑے پر دیکھا تھا اور دوسری مرتبہ پولیس کی تحویل میں لیکن میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں پہلے سے تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ بہر حال اب تم اپنا نام

بھی بدل لو اپنے پرانے ساتھیوں سے رابطہ بھی ختم کردو۔ ان میں سے کوئی بھی مشہدی کو تمہاری موت کے بارے میں بتا سکتا ہے۔"

"واجبہ! میں نے اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میرے زندہ ہونے کا علم صرف ایک آدمی کو ہے' اس کا نام ہے کریم بلوچ! وہ میرا بچپن کا دوست ہے' وہ مر جائے گا لیکن میرے بارے میں کسی کو نہیں بتائے گا۔ میرے دوسرے ساتھی تو اب تک میری موت کا سوگ منا رہے ہیں۔"

"تمہارے بھائی کو بھی تو معلوم ہوگا کہ تم ابھی زندہ ہو؟" تیمور نے پوچھا۔

"کریم نے اسے بھی اب تک کچھ نہیں بتایا ہے۔ وہ مجھ سے شدید محبت کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے' وہ خوشی میں آکر دوسرے لوگوں کو میرے بارے میں بتا دے۔ میں ایک دن خود ہی اسے اپنے بارے میں بتاؤں گا اور کچھ ہدایت کروں گا کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہونے پائے کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ میرے کسی دوست کو بھی نہیں' نہ کسی رشتے دار کو۔"

"ہاں' تم اپنا نام بھی بدل لو۔" میں نے کہا۔

"واجبہ' تم بھی ٹھیک کہتا ہے۔" غنی نے کہا۔ "آج سے میرا نام ہے ندیم بلوچ! اب آپ لوگ مجھے ندیم بلوچ کے نام ہی سے پکارو گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس نام سے میرا قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بن جائے۔"

• ..... • ..... • ..... •

ہم لوگ گھر پہنچے تو مین گیٹ پر باوردی اور چاق و چوبند چوکیدار کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

اس نے اندر ہی سے پوچھا۔ "جی صاحب! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

اس کی بات سن کر ہاشم خان عقبی نشست سے اتر کر باہر آ گیا۔

اسے دیکھ کر چوکیدار نے ادب سے سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔

اس نے چوکیدار سے کہا۔ "بے وقوف' یہ اس بنگلے کے مالک عمران صاحب ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ ان کے بھائی تیمور ہیں۔" اس نے تیمور کا تعارف کرایا۔

"سوری سر.....!" وہ جلدی سے بولا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اصل میں آپ کو پہچانا نہیں تھا میں اس لیے....."

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرا نام سرفراز خان ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہیں یہاں ملازم کس نے رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب.....! وہ مجھے خان صاحب نے ملازم رکھا ہے۔"

"خان صاحب!" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "کون خان صاحب؟" پھر مجھے خیال آیا کہ ہاشم نے اس تعارف ہم سے کرایا تھا۔ وہ ہاشم ہی کو خان صاحب کہہ رہا تھا۔

"اچھا' اچھا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ہاشم خان صاحب نے ملازمت دی ہے؟"

"جی ہاں سر.....!" اس نے جواب دیا۔

"سرفراز خان!" تیمور نے کہا۔ "تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟"

"جی سر.....!" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں میٹرک پاس ہوں۔"

"اچھا' ٹھیک ہے اپنی ڈیوٹی اسی طرح محنت سے کرتے رہو۔" میں نے تیمور کو گاڑی اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ ہاشم تو ہمارا تعارف کرانے کے بعد پیدل ہی اندر کی طرف چلا گیا تھا۔

"تم نے اسے کب سے ملازم رکھ لیا؟" میں نے لاؤنج میں پہنچ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے ہاشم سے پوچھا۔

"غلطی میری ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ میں نے ایک چوکیدار کا بندوبست کیا ہے۔ انتہائی محنتی اور قابلِ اعتبار آدمی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے' کبھی مالکان کی کرید میں نہیں رہتا۔ اصل میں یہ پہلے میرے ایک بہت اچھے دوست کے پاس چوکیدار تھا۔ وہ اپنی فیملی سمیت پرسوں امریکا شفٹ ہوگیا تو اس نے سرفراز خان کو میرے حوالے کردیا۔"

"ارے یار' میں اتنی صفائی نہیں مانگ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم نے اگر کسی کو ملازم رکھا ہے تو دیکھ بھال کر ہی رکھا ہوگا۔"

اسی وقت نادیہ آ گئی اور بولی۔ "آپ لوگوں کو دوسروں کا بھی کچھ خیال ہے؟"

"کون دوسرے؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "دوسرے تو میرے ساتھ ہی تھے۔ ہاں' یہ کہو کہ آپ لوگوں کو "دوسری" کا بھی کچھ خیال ہے تو ٹھیک ہوگا۔" پھر میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تم یقیناً کھانے کی بات کرو گی؟"

"تو کیا آپ لوگ کھانا باہر سے کھا کر آئے ہیں؟" نادیہ نے پوچھا۔

"نہیں' نہیں' تمہارے بغیر ہم کھانا کھا سکتے ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "جلدی سے کھانا منگواؤ۔ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے بھی دوڑ دوڑ کر ہلکان ہوگئے ہیں۔" میں نے نادیہ کو خوش کرنے کو کہا ورنہ اُس وقت کھانے کی بالکل خواہش نہیں تھی۔ ہم لوگوں نے کھانا شروع کیا تو بھوک نہ ہونے کے باوجود کھاتے ہی رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ آج کھانا کلثوم نے پکایا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ میں نے نادیہ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کلثوم کا بنایا ہوا کھانا زیادہ لذیذ ہے۔

کھانے کے بعد تیمور نے مجھ سے کہا۔ "بھیا! میں نے عدنان کی روانگی کا بندوبست کردیا ہے۔ پرسوں اُس کی فلائٹ ہے۔"

"اور تم یہ بات مجھے اب بتا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آپ کو بتانے کا موقع ہی کب ملا ہے۔ میں نے آج ہی تو اس کی سیٹ کنفرم کرائی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو بتا دوں گا لیکن پھر پے در پے ایسے کام نکلتے رہے کہ میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ وہ تو مجھے ابھی یاد آیا جب میں نے عدنان کو کھانے کی میز پر دیکھا۔"

"یار! عدنان ضد کرے گا کہ میں بھی اُس کے ساتھ امریکا جاؤں۔ میں فوری طور پر کراچی سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ اب اسے سمجھانا بھی ایک مرحلہ ہے۔"

"یہ کام آپ نادیہ بھابھی..... میرا مطلب ہے کہ نادیہ باجی پر چھوڑ دیں۔ عدنان اس دوران میں اُن کے ساتھ بہت اٹیچ ہوگیا ہے۔ وہ اُسے سمجھائیں گی تو سمجھ جائے گا۔ آپ تو اُس کی ضدیں پوری کرنے کے عادی ہیں۔ وہ آپ سے تو کبھی نہیں مانے گا۔"

''ویسے یار یہ بہت اچھا ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''میں خود بھی عدنان کی وجہ سے بہت فکرمند تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ذہنی مریض ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے ایک بچہ نہ اسکول جائے گا' نہ گھر سے باہر کھیلنے جائے گا' نہ اس کا کوئی دوست اس سے ملنے آئے گا' نہ اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہوگی تو وہ ذہنی مریض تو ہو ہی جائے گا۔ یہ تو اس کے لیے ایک قید تھی۔ ویسے بھی اُس کا چلے جانا ہی بہتر ہے' نہ جانے یہاں آیندہ کیا حالات ہوں؟''

نادیہ وہاں آئی تو تیمور اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''بھیا! اب میں سونے جا رہا ہوں۔ کوئی ضروری کام رہ گیا ہو تو وہ بھی بتا دیں۔''

''ہاں یار ایک بہت ضروری کام رہ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ذرا میرے پیر دبا دو۔''

''لیجیے یہ بھی کوئی کام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ میرے پیروں کی طرف بیٹھ گیا اور انہیں دبانے لگا۔

''ارے ارے' کیا کر رہے ہو یار؟'' میں نے کہا۔ ''میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

وہ ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نوٹ کر رہا تھا کہ جب صرف میں اور نادیہ ہوتے تھے تو وہ ہمیں بات کرنے کا موقع دینے کے لیے فوراً کسی نہ کسی بہانے سے اٹھ جاتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے نادیہ کو عدنان کی روانگی کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''نادیہ! اب تم ہی اُسے سمجھا سکتی ہو۔ وہ مجھے بھی امریکا ساتھ لے جانے کی ضد کرے گا لیکن تم جانتی ہو کہ میں اس وقت پاکستان سے باہر نہیں جا سکتا۔''

''کیوں؟'' نادیہ مسکرائی۔ ''کیا ای سی ایل (ECL) میں تمہارا بھی نام آ گیا ہے؟''

''مجھے ابھی وہ اہم فائل آری اور آئی ایس آئی کے کسی ذمے دار آفیسر تک پہنچانا ہے۔ کوشش تو میں یہ جا کر کروں گا کہ وہ فائل بھی براہِ راست صدرِ پاکستان اور چیف آف آرمی اسٹاف تک پہنچاؤں۔ ان حالات میں میرا امریکا جانا کیسے ممکن ہوگا؟''

''بس اتنی سی بات؟'' نادیہ مسکرا کر بولی۔ ''میں تو اُسے لمحوں میں راضی کر لوں گی۔''

''ہاں بھئی' وہ اپنی بھابی کی بات نہیں مانے گا تو کس کی بات مانے گا؟''

نادیہ نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی۔ ''یہ تیمور بھی بہت خبیث ہے.....''

''کیوں بھئی' اب اُس نے کیا کر دیا؟''

''اُس نے عدنان کو بھی سکھایا ہے۔''

''کیا سکھایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی..... کہ..... وہ..... مجھے..... بھابی کہے۔'' نادیہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

''نادیہ! تیمور تم سے تو مذاق کر سکتا ہے لیکن کسی اور کے سامنے تمہاری بے عزتی نہیں کر سکتا پھر وہ عدنان سے ایسی بات کیسے کر سکتا ہے؟ عدنان نے خود ہی فیصلہ کر لیا ہوگا کہ وہ تمہیں اپنی بھابی بنائے گا۔''

''ویسے تم بھی تیمور سے کم نہیں ہو۔'' نادیہ نے جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

•.....•.....•.....•

میں' تیمور اور نادیہ ایک مرتبہ پھر جناح ٹرمینل پر موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ہاشم کو بھی وہاں دیکھا لیکن وہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھا اور عقابی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ عدنان بہت اداس تھا' وہ بار بار یہ ہی کہہ

رہا تھا کہ بھیا! آپ نے وعدہ خلافی کی ہے۔ آپ نے تو میرے ساتھ امریکا جانے کا وعدہ کیا تھا؟''

''میں بہت جلد وہاں آؤں گا چندا!'' میں نے اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ تمہارے بھیا آج کل کن پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔''

''مجھے اسی کی تو زیادہ پریشانی ہے۔'' عدنان نے کہا۔

پھر امریکا کی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر عدنان کا پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ چیک کیا' اس کے ٹریولر چیکس دیکھے اور اسے سینے سے لگا لیا۔ ''جاؤ بیٹا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد میں امریکا آؤں گا پھر ہم خوب جی بھر کے گھومیں گے' امریکا' کینیڈا' یورپ! میں تمہیں ہر جگہ کی سیر کراؤں گا۔''

''بھیا! مجھ سے ایک وعدہ کریں۔''

''کیسا وعدہ چندا؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے آپ وعدہ کریں کہ میری بات مان لیں گے۔''

''میں نے آج تک تمہاری کوئی بات ٹالی ہے؟'' میں نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''جب آپ امریکا آئیں تو نادیہ باجی کو بھی ضرور ساتھ لائیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے دھوپ میں بارش ہو رہی ہو۔ وہ آنسو بہاتے بہاتے ایک دم مسکرانے لگا تھا۔

''ارے' بس اتنی سی بات!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نادیہ کو بھی ضرور ساتھ لے کر آؤں گا۔''

''لیکن نادیہ باجی کی حیثیت سے نہیں بلکہ نادیہ بھابی کی حیثیت سے۔'' اس نے کہا۔

نادیہ یوں دوسری طرف دیکھنے لگی جیسے اُس نے عدنان کی بات سنی ہی نہ ہو۔ ''بھیا! پلیز' وعدہ کریں۔''

''چلو' تم بھی کیا یاد کرو گے' میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا لیکن تم ایک دفعہ نادیہ سے پوچھ تو لو۔ وہ بھی تمہاری بھابی بننے پر آمادہ ہیں یا نہیں؟''

عدنان' نادیہ سے لپٹ گیا اور بولا۔ ''میں نے غلط تو نہیں کہا نادیہ..... بھابی! آپ میری بھابی بنیں گی نا؟''

''عدنان.....!'' نادیہ نے شرم سے سرخ چہرے کے ساتھ کہا۔ ''چلو اب جاؤ' دیر ہو رہی ہے۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''آپ میری بات کا جواب دیں' یس آر نو؟'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کا جواب لیے بغیر نہیں جاؤں گا' یس..... یا..... نو؟''

نادیہ نے پیار سے اُس کے سر پہ ایک چپت لگائی اور آہستہ سے بولی۔ ''یس.....!''

''گڈ بھابی.....!'' عدنان نے کہا اور ڈپارچر لاؤنج میں چلا گیا۔ تیمور نے اپنے کسی جاننے والے سے کہہ دیا تھا کہ وہ عدنان کا امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کرا دے۔

•.....•.....•.....•

یہ پُرتجسس' سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

.....☆☆.....

انوکھی آپ بیتیاں

میرا جرم بتا دو

نورالزماں صدیقی

ہم اسیروں کی بھی اِک عمر بسر ہوتی ہے
نہ تو موت آتی ہے ہمدم نہ سحر ہوتی ہے

راولپنڈی سے ایک انوکھی آپ بیتی

کہانیاں تو آپ نے بہت پڑھی ہوں گی لیکن جو کہانی میں آپ کو سنا رہا ہوں' وہ اس اعتبار سے عجیب اور ناقابلِ فہم ہے کہ جن حالات اور واقعات سے اس کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے' اُن میں تقدیر کی ستم ظریفیوں کی جھلک تو واضح طور پر نظر آتی ہے لیکن ان کا کوئی معقول جواز کہیں نہیں ملتا اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ کھوٹی قسمت لے کر اس دنیا میں آتے ہیں' وہ چاہے لاکھ تدبیریں آزمائیں' اپنی تقدیر بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور شاید میرا شمار بھی انہی بدقسمت لوگوں میں ہوتا ہے۔

میں ہندوستان کے صوبے یوپی کے ایک گاؤں آنڈاری میں پیدا ہوا۔ میرے دادا بہت بڑے زمیندار تھے۔ سنا ہے کہ سولہ گاؤں ان کی ملکیت میں تھے۔ دروازے پر ہاتھی بندھا ہوا تھا جو صرف میرے دادا اور اُن کے بھائیوں کے استعمال میں رہتا تھا۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ میری پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ دادا نے میرا نام نورالزماں رکھا۔ میں آٹھ بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ بچپن ہی سے میں جسمانی طور پر کچھ کمزور تھا' اکثر رات کو سوتے میں پیشاب کر دیتا۔ اس پر خوب مار پڑتی۔ اکثر سردی کی راتوں میں ننگا کر کے صحن میں کھڑا کر دیا جاتا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی کسی نے مجھے پیار سے بلایا ہو۔ اکثر میرے حصے میں ڈانٹ ڈپٹ اور مار ہی آتی۔ معمولی معمولی شرارتوں پر میرا کھانا بند کر دیا جاتا۔

گاؤں میں ویسے بھی تعلیم کا رواج کچھ کم تھا۔ میں نے قرآنِ پاک گھر میں ہی ختم کیا تو مجھے مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں صرف درجہ دوم تک پڑھائی ہوتی تھی پھر دوسرے گاؤں میں تیسری سے چھٹی تک اسکول تھا۔ اُس زمانے میں درجہ چہارم کا امتحان بورڈ سے ہوتا تھا۔ میں پورے بورڈ میں اول آیا۔ اس کے بعد بغیر کوئی وجہ بتائے میری پڑھائی چھڑا دی گئی۔ میری کسی نے نہ سنی اور جب میں نے تعلیم جاری رکھنے پر اصرار کیا تو جواب میں جھڑکیاں ہی ملیں۔ اب میں سارا دن گھر میں پڑا رہتا یا کھیل کود میں وقت گزارتا۔ نہ جانے کیوں شروع ہی سے والدہ مجھ سے ناراض رہتی تھیں۔ معمولی معمولی باتوں پر مجھے روئی کی طرح دھن کر رکھ دیتیں اور والد صاحب سے بھی خوب نمک مرچ لگا کر شکایت کرتیں پھر جو مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ میں تھوڑی بہت کسر رہ جاتی' وہ والد صاحب پوری کر دیتے۔ دوسرے بہن بھائی میرے مقابلے میں کہیں زیادہ شرارتیں کرتے لیکن انہیں کوئی کچھ نہ کہتا۔ والد صاحب غصے کے کچھ تیز تھے اس لیے میں ہی اکثر و بیشتر اُن کے غصے کا نشانہ بنتا۔

ایک دن کسی معمولی سی بات پر میری خوب پٹائی ہوئی اور والد صاحب نے غصے میں آ کر حکم صادر کر دیا کہ شہر جا کر دکان پر بیڑی بنانا سیکھو۔ شہر ہمارے گاؤں سے چار میل دور تھا۔ صبح سے شام تک بیڑی کے کارخانے میں کام کرنا اور روزانہ آٹھ میل پیدل سفر کرنا' گویا مشقت کا دور شروع ہو گیا۔ انہی دنوں والد صاحب بیمار ہو گئے۔ چھوٹے چچا انہیں علاج کی غرض سے شاہ گنج لے گئے اور مجھے بھی تیمارداری کے لیے ساتھ جانا پڑا۔ سچ پوچھیے تو یہ تیمارداری بھی ایک عذاب سے کم نہ تھی۔ بعض اوقات ساری ساری رات جاگنا پڑتا اور اگر گھڑی بھر کو بھی آنکھ لگ گئی تو شامت ہی آ جاتی۔ بہرحال وہ وقت بھی گزر گیا اور ہم پھر کھیل کود میں لگ گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے زمینداروں کے حالات بھی تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ زمینداریاں تقریباً ختم ہو چکی تھیں اور ہمارے کئی رشتے دار ملازمت کرنے لگے تھے۔ گاؤں کے

کسی سیانے کے کہنے پر والد صاحب نے مجھے شہر لے جاکر چھٹی جماعت میں داخل کرادیا اور پرنسپل سے کہہ کر فیس بھی معاف کرادی جو صرف نو آنے تھی۔ اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول پیدل آتا جاتا تھا اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنا پڑتا۔ کھانے کو ایک پیسا بھی نہ ملتا چنانچہ میں نے گھر سے پیسے چرانے شروع کردیے۔ جب کبھی پکڑا گیا تو خوب مار لگی۔ ایک دفعہ پیسے چرانے پر اتنی مار پڑی کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو سارا جسم پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ خون دیکھ کر میں رونے لگا جس پر والد صاحب نے تھوڑی سی مشق اور کر ڈالی۔ میں اس امید پر مار کھاتا رہا کہ شاید آج میری تکلیفوں کا خاتمہ ہوجائے گا اور آئندہ والد صاحب کو یہ زحمت نہ اٹھانا پڑے گی لیکن میں ایک بار پھر لوٹ پوٹ کر کھڑا ہوگیا۔

والدین کے اس رویے نے مجھے اپنے بہن بھائیوں اور دوسرے رشتے داروں کی نظروں میں بھی گرادیا تھا۔ خاندان کا ہر فرد مجھے ذلیل کرنے پر آمادہ رہتا اور موقع بے موقع میری جھوٹی شکایتیں کرکے پٹائی کا تماشا دیکھا جاتا۔ ویسے بھی پٹائی کے لیے معمولی بہانا کافی ہوتا تھا۔ ایک دن اسکول سے چھٹی ہوئی تو دل مچل اٹھا کہ ٹرین سے گھر جانا چاہیے۔ دوپہر کا وقت تھا' بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ٹرین آئی اور میں لپک کر زنانہ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ یہی سوچ کر کہ ایک ہی اسٹیشن کی تو بات ہے۔ جب ٹرین گاؤں کے اسٹیشن پر رکنے والی تھی تو میں گھبرا کر جلدی سے چلتی ٹرین سے کود پڑا کیونکہ بغیر ٹکٹ تھا اور اسٹیشن پر ٹکٹ بابو چیکنگ کررہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں قلابازی کھاتا ہوا دور جاگرا اور میرا بستہ لڑھکتا ہوا ٹرین کی پٹری پر آگیا۔ سب کتابیں کٹ پھٹ کر بیکار ہوگئیں۔ مجھے بھی کافی چوٹیں آئیں۔ گھٹنا تو بری طرح زخمی تھا۔ اس کے علاوہ سر اور ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ ٹوٹا پھوٹا بستہ اور ہاتھ میں لے کر گھر پہنچا۔ وہاں جو خاطر ہوئی اس کا تصور کرکے آج بھی جھرجھری سی آجاتی ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچی ورنہ اُس روز خاتمہ یقینی تھا۔

انہی دنوں ہمارے گاؤں میں طاعون کی وبا پھیلی۔ کئی لوگ اس وبا کا شکار ہوکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہاں بھی بدقسمتی نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ کچھ دنوں کے لیے سب لوگ گاؤں چھوڑ دیں۔ ہم لوگ بھی گاؤں سے باہر ایک باغ میں جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے مگر پورا خاندان میری وجہ سے خائف تھا۔ اس بیماری میں بھی والد صاحب کو مجھ پر ترس نہ آیا اور دوسرے ہی دن مجھے شہر لے جاکر میرے سر پر کوئی پندرہ سیر سامان لاد دیا۔ شدید تکلیف اور تھکن کے باعث مجھ سے ایک قدم بھی چلنا دوبھر ہورہا تھا۔ راستے بھر روتا پیٹتا اور جگہ جگہ بیٹھ کر جب گھر پہنچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ پانی پینے کی غرض سے مٹکے تک پہنچا ہی تھا کہ والد صاحب نے آواز دے کر بلا لیا اور دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا حال بتایا تو بجائے ہمدردی کرنے کے' میری طرف لپکے اور چمٹا اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ تکلیف کی شدت سے میں تڑپ گیا مگر منہ سے اُف تک نہ کی ورنہ مزید پٹائی ہوتی۔

ان حالات سے میں اتنا دل برداشتہ ہوچکا تھا کہ ہر وقت گھر سے بھاگنے اور اپنی زندگی ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ کئی بار خودکشی کا خیال آیا مگر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کردیا کہ حرام موت مرنے سے بہتر ہے کہ تھوڑا سا انتظار کرلیا جائے' ممکن ہے' قدرت کوئی وسیلہ پیدا کردے۔ انہی دنوں میرے

والد کے خالہ زاد بھائی جو ڈھاکا پولیس میں ملازم تھے' گاؤں آئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور اُن کی خوشامد کی کہ وہ مجھے کسی طرح اس جہنم سے نجات دلادیں۔ وہ بھی میرے والد کے غصے سے بہت ڈرتے تھے اس لیے پہلے تو انکار کرتے رہے پھر راضی ہوگئے اور کہنے لگے کہ جاتے وقت چپکے سے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور مجھے اپنے ساتھ ڈھاکا لے گئے۔ یہاں بھی تقدیر نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔

چچا نے اپنی جان یوں چھڑائی کہ مجھے ایک بنگالی کے ہوٹل میں ملازمت دلوادی۔ دن بھر ہوٹل کا کام کرنا اور شام کو گھر جاکر ان کی بیوی اور بہنوں کے احکامات کی تعمیل کرنا پڑتی۔ رات کو بدبودار مچھلی اور چاول کھانے کو ملتے جنہیں حلق سے اتارنا بھی میرے لیے محال تھا۔

یہ سلسلہ تین روز جاری رہا۔ اب مجھے گھر چھوڑنے کا افسوس ہورہا تھا۔ بچا روز شام کو ملنے آتے تھے۔ میں نے ایک بار پھر گھر جانے کی ضد کی تو انہوں نے ایک روپیا دیا اور گاڑی کا وقت بتاکر چلے گئے۔ میں نے تھوڑا سا گڑ اور چاول خریدے اور زنانہ ڈبے میں چھپ کر کسی نہ کسی طرح تیسرے دن گھر پہنچ ہی گیا۔ راستے میں جو تکلیفیں اٹھائیں' وہ بیان سے باہر ہیں۔ سارے راستے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے الزام میں پکڑا نہ جاؤں۔

محرومیوں اور بدنصیبی نے میرے پورے وجود کو کچھ اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ جتنا میں اس کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرتا' اتنی ہی گرفت اور مضبوط ہوجاتی۔ میں تقدیر کے ہر وار کو اوپر والے کی مرضی جان کر برداشت کرتا جارہا تھا مگر کبھی کبھی احساس کی کوئی چنگاری سلگ اٹھتی تو زخموں کے بند بھی کھل جاتے' تب ضبط کا یارانہ رہتا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

بقرعید آئی تو احساس کے تازیانوں کی شدت اور سوا ہوگئی۔ سب بہن بھائیوں کے نئے کپڑے اور جوتے آئے مگر میرا کسی کو خیال نہ آیا۔ ایک ایک کا منہ دیکھتا اور سوچتا کہ یا اللہ! کیا میں ان لوگوں کا اپنا نہیں ہوں؟ میرے ساتھ یہ امتیاز کیوں برتا جاتا ہے؟ بولنے کی ہمت نہ تھی لہٰذا پرانا پاجامہ اور آدھی آستینوں کی قمیص پہن کر نماز پڑھنے چلا گیا۔ واپس آکر ایک ایک کو سلام کیا مگر کسی نے عیدی کے نام پر پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ گاؤں میں قصابوں' کنجڑوں اور جولاہوں کے بچے بھی دکانوں اور ٹھیلوں سے اپنی پسند کی چیزیں اور کھلونے خرید رہے تھے اور میں اپنی کوٹھری میں پڑا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ یکایک شور اٹھا کہ ہندوؤں نے حملہ کردیا ہے۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ ہندو تعداد میں زیادہ تھے مگر مسلمانوں نے بھی بے جگری سے مقابلہ کیا' مجبوراً انہیں پسپا ہونا پڑا۔ کچھ سمجھ دار لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرادیا مگر اس واقعے کے بعد میں ہندوؤں کی نظروں میں آگیا کیونکہ میں نے اس لڑائی میں اپنی عمر اور ہمت سے بڑھ کر بہادری دکھائی تھی اور کئی ہندوؤں کو زخمی کردیا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار والد صاحب میرے معاملے میں کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے کیونکہ ہندو میری جان کے دشمن ہورہے تھے' چنانچہ والد صاحب نے پندرہ روپے میری ہتھیلی پر رکھے اور رات کی تاریکی میں مجھے پاکستان کے لیے روانہ کردیا۔ پندرہ روپے میں بلیا سے کراچی تک کا سفر جس طرح میں نے طے کیا' وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے علاوہ پتی ریت پر میلوں پیدل چلا' فاقے کیے' تب کہیں منزل تک پہنچنے کی صورت پیدا ہوئی۔

ناظم آباد میں بڑی بہن رہتی تھیں۔ مجھے اچانک

کالی چائے

چائے چین کے رہنے والوں کی اختراع ہے۔ چین میں قدیم زمانے سے ناشتے کے ساتھ چائے پی جاتی تھی۔ پہلے اس کی پتیوں کی رنگت سیاہ ہوا کرتی تھی۔ اس میں سیاہی مائل بھورا پن ایشیا و افریقہ کے مختلف ملکوں میں کاشت کے تجربات کی بہ دولت پیدا ہوا۔ یاد رہے کہ یہ چین میں آج بھی سیاہ رنگ کی پتیوں کی شکل میں پیدا ہوتی ہے اور 'بلیک ٹی' کہلاتی ہے۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار سترہویں صدی کے اوائل میں چائے مغربی ممالک میں لائے۔ اُس سے پہلے اہلِ مغرب ناشتے میں بیئر یا چاکولیٹ پیا کرتے تھے۔ 1645ء میں چائے پینے کا رواج انگلستان بھر میں ہوگیا۔ فرق اتنا آیا کہ چین میں 'چا' اُس پانی کو کہتے ہیں جس میں چائے کی پتیاں اُبالی جاتی ہیں۔ مغرب میں پتیوں کو 'چائے' کہنے لگے۔ چین اور جاپان میں چائے بغیر شکر اور دودھ کے پی جاتی ہے۔ اس میں دودھ اور شکر ملانے کا رواج ہندوستان پہنچ کر ہوا۔

"رسومِ اقوام" از علی عباس جلال پوری
تعاون۔ محمد خان شنواری۔

اپنے سامنے دیکھ کر بڑی حیران ہوئیں۔ شام کو بہنوئی صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ دن بڑے آرام سے گزر گئے۔ میری شامت نے ایک بار پھر مجھے دھکا دیا اور میں بہنوئی صاحب سے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھا لیکن انہوں نے میری مدد کرنے سے صاف انکار کردیا۔ میں نے ملازمت کے لیے کہا تو بولے کہ تم ابھی بہت چھوٹے ہو' کچھ دنوں کے بعد کسی سے کہہ کر مزدوری پر لگوا دوں گا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے' نہ تو انہوں نے پڑھانے کی حامی بھری اور نہ ہی میرے لیے کسی کام کا بندوبست کیا۔ دراصل اس میں بھی بہن بہنوئی کا مفاد وابستہ تھا۔ انہیں مفت کا ملازم مل گیا تھا جو صبح سے شام تک گھر اور بازار کے سب کام کیا کرتا پھر انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ مجھے اپنی غلامی سے آزاد کرتے۔

ایک روز بہن نے کسی کام کے لیے کہا۔ میں ویسے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا لہٰذا صاف انکار کردیا۔ شام کو بہنوئی صاحب تشریف لائے تو بہن نے خوب نمک مرچ لگا کر شکایت کی۔ انہوں نے اسی وقت اپنے گھر سے نکلنے کا حکم صادر کردیا۔ میں بھوکا پیاسا گھومتا ہوا اباجی کے اسپتال کے پیچھے ایک زیرِ تعمیر مسجد میں چلا گیا اور عشاء کی نماز پڑھ کر وہیں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ مولوی صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے انکوائری شروع کردی۔ بڑی مشکل سے انہیں مطمئن کیا۔

صبح اٹھتے ہی مسجد سے چل پڑا اور دن بھر شہر کی سڑکیں ناپتا رہا' کہیں کام نہ بنا۔ میونسپلٹی کے نلکے نہ ہوتے تو شاید پانی بھی نصیب نہ ہوتا۔ اسی طرح تین دن گزر گئے اور ایک دانہ بھی منہ میں نہ گیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب میری موت بھوک سے واقع ہوگی اور میں زندگی کے عذاب سے نجات پالوں گا لیکن یہ محض میری سوچ تھی جبکہ میرا عمل اس کے برعکس تھا۔ مولوی صاحب کے حجرے میں روشنی دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور گرتا پڑتا اُن کے دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ مولوی صاحب اُس وقت کھانا کھا رہے تھے' انہوں نے جو میری حالت دیکھی تو گھبرا گئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں تین دن سے بھوکا ہوں تو بچا کھچا کھانا میرے سامنے رکھ کر باہر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد کسی گھر سے تین روٹیاں اور سالن لے کر واپس لوٹے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں یہ تین روٹیاں بھی چٹ کر گیا اور ابھی پانی کا گلاس بھی خالی نہ ہوا تھا کہ میں وہیں حجرے میں گر کر بے ہوش ہوگیا۔

ہوش آیا تو بیس پچیس آدمی میرے اردگرد کھڑے تھے۔ وہ سب میرے بارے میں جاننا چاہتے تھے لیکن مولوی صاحب نے کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دیا اور مجھے لے کر بہن کے گھر چل دیے۔ مولوی صاحب کے ڈانٹنے ڈپٹنے سے بہن' بہنوئی کافی شرمندہ ہوئے اور میں ایک بار پھر ان کے گھر میں غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔ میں تہیہ کرچکا تھا کہ اپنے طور پر کام کی تلاش جاری رکھوں گا۔ بالآخر مجھے ایک راشن شاپ پر آٹا تولنے کا کام مل گیا۔ کچھ دنوں بعد مالک نے ۴۵/روپے تنخواہ مقرر کردی۔ اس دوران میں میرے بڑے بھائی بھی کراچی آچکے تھے۔ انہوں نے فردوس کالونی میں ایک بڑا کمرا کرائے پر لے لیا۔ دور شتے دار بھی تھے۔ مجھے بھی انہوں نے اپنے پاس بلالیا۔

ایک سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ راشن شاپ کا کام بھی چھوٹ گیا۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا......

چونکہ اب میں اپنے حصے کا خرچ ادا کرنے کے قابل نہ رہا تھا اس لیے یہاں بھی میری حیثیت ملازموں جیسی ہوگئی۔ بازار سے سودا لانا' تینوں وقت کھانا پکانا اور گھر کے بقیہ کام میرے ذمے لگتے گئے۔

کچھ دنوں بعد اخبار میں سیلز مینوں کی جگہ نکلی' وہاں پہنچا تو انہوں نے ضمانت کے طور پر دو سو روپے طلب کیے اور ۱۲۵/روپے تنخواہ مقرر کرنے کے علاوہ کمیشن دینے کا بھی وعدہ کیا۔ اٹھائیس دن کام کیا تھا کہ مالک اچانک غائب ہوگیا' سب لوگ اپنا کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مقدر نے یہاں بھی اپنا کام کر دکھایا اور مجھے یقین ہوگیا کہ میری زندگی میں سوائے ٹھوکروں اور دھکوں کے کچھ نہیں۔

دن گزرتے رہے لیکن میری زندگی کے شب و روز کی یکسانیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ چند دن کے لیے کام ملتا تو کئی کئی مہینے بیکاری کی نذر ہوجاتے۔ باوجود کوشش کے میں اپنی تعلیم کا سلسلہ بحال کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اب ہم گولیمار میں کرائے کے ایک کمرے میں رہ رہے تھے۔ بھائی صاحب جب کام سے واپس آتے تو انہیں ہر چیز تیار ملتی۔ وہ کھانا کھاتے ہی اپنی پڑھائی میں مشغول ہوجاتے۔ میرے بارے میں سوچنے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ انہی دنوں ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دن بھائی صاحب ملازمت سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ والدہ صاحبہ مع تین چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کراچی پہنچ رہی ہیں۔ یہاں اپنے رہنے کو ٹھکانا مشکل سے نصیب ہوا تھا' والدہ کو کہاں رکھتے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ برابر والی خالی زمین جو مسجد کی ملکیت ہے' اس پر دو کمرے بنوا لیے جائیں۔ مسجد کی انتظامیہ اس پر رضامند ہوگئی۔ بھائی صاحب نے بہن کو بھی راضی کرلیا کہ جب تک کمرے نہیں بن جاتے' والدہ وغیرہ انہی کے یہاں رہیں گے۔

والدہ کے آنے کے بعد میں نے کام حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ مزید تیز کردی۔ بالآخر مجھے شپ یارڈ میں ہیلپر کی جگہ مل گئی۔ صرف ۱۸/روپے ہفتے کے ملتے تھے۔ اسی میں کھانا پینا' کمرے کا کرایہ سب کچھ کرنا ہوتا تھا۔ ویلڈنگ کا کام سیکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں تکلیف ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کردیا حالانکہ یہی سوچ کر ویلڈنگ کا کام سیکھنا چاہا تھا کہ ویلڈر کو اچھے پیسے ملتے ہیں لیکن شاید اپنی قسمت میں پیسوں کا منہ دیکھنا

شہر کو چھوڑ کے بھول گیا وہ
کتنی مدت کتنے لوگوں سے یارانہ ہوتا تھا
پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں جب
صدق محبت کے جذبے سے
خلقت بھی سرشار سی
جذبوں میں اخلاص کی خوشبو
سوچوں میں بے لوث سی خدمت
لالچ ذہن کے دروازے پر
دستک بھی نہ دے پایا تھا
اور ریاکاری کی خواہش
سینوں میں پنپ نہ سکتی تھی
کہاں گئے انمول وہ لمحے
کہاں کھوئی اخلاص کی خوشبو
کیوں سوئے ہیں وہ پیار کے جذبے
سچائی کا سورج جھوٹ کی رات کے پردے میں سویا ہے
اب تو ریاکاری کا موسم جاگ رہا ہے

آزاد نظم

چوہدری قمر جہاں علی پوری ملتان

ہی نہ تھا۔ ویلڈر تو کیا بنتے' کچھ دنوں بعد ہیلپری سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے۔ کام نہ ہونے سے بہت سے ہیلپر فاضل ہو گئے تھے اور اُن میں میرا نام سرفہرست ہی تھا۔

ایک بار پھر بیکاری اور پریشانی اپنے میکے واپس آ گئی تھی اور کسی صورت پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ میں زندگی اور موت دونوں سے مایوس ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ برے وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں تو اچھا وقت کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ عزیز رشتے دار بجائے مدد کرنے کے مذاق اڑاتے ہیں لیکن میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جاؤں گا لیکن ان میں سے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا۔

کچھ دن کے ٹی سی میں کنڈیکٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ مجھے تین ہفتے کی ٹریننگ دی گئی اور اس کے بعد میں تقریباً ایک سال تک مختلف روٹس پر کنڈیکٹر کی ڈیوٹی کرتا رہا۔ ایک روز چیکر صاحب گاڑی میں تشریف لائے اور آتے ہی چائے پانی کے پیسے مانگنے لگے۔ میں ان کنڈیکٹروں میں سے نہیں تھا جو مسافروں سے پیسے لے کر ٹکٹ نہ دیں اور پیسے اپنی جیبوں میں ڈال لیں لہٰذا میں نے معذرت کر لی مگر وہ چیکر یہی سمجھے کہ میں پیسے نہ دینے کے سو بہانے تراش رہا ہوں' سس نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ میری ایمانداری ہی میرا جرم بن گئی۔ ہر وہ واقعہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا جو مجھے بے ایمانی' جھوٹ' دغابازی اور برے کاموں کی ترغیب دیتا تاکہ میں سیدھے راستے سے بھٹک جاؤں اور ناجائز طریقوں سے روزی کماؤں۔ کئی بار میں نے سوچا کہ جب ساری دنیا ہی حلال' حرام کے فرق کو بھولتی جا رہی ہے تو میں آخر کب تک اس چکر میں گرفتار رہوں لیکن کوئی غیبی طاقت مجھے اپنے ارادوں پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرتی رہی اور میں تمام تر مصائب اور تکالیف کے باجود رزقِ حلال کی تلاش میں سرگرداں رہا۔

ایک بار پھر نیکی کا فرشتہ مجھ پر مہربان ہوا اور مجھے ایک انشورنس کمپنی میں بیمہ ایجنٹ کا کام مل گیا۔ جو لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں' وہی جان سکتے ہیں کہ کسی بھی بیمہ ایجنٹ کے لیے شروع کے دن کتنے کٹھن ہوتے ہیں۔ ابتدا میں محنت زیادہ تھی اور پیسے بہت کم۔ کبھی دو تین مہینے میں پانچ دس ہزار کی پالیسی فروخت ہو جاتی تو چار پیسے کمیشن کے مل جاتے۔ میرے حالات ایسے نہ تھے کہ میں اچھے دنوں کی آس میں طویل منصوبہ بندی کرتا۔ مجھے تو فوری طور پر ایسا کام چاہیے تھا جس میں باقاعدہ آمدنی ہو سکے' چنانچہ میں نے کچھ ہی دنوں بعد ایک رنگ والے کے ساتھ تین روپے روز پر مزدوری شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد میں پکا کاریگر بن چکا تھا اور

اب روزانہ کام کرنے لگا۔ تقریباً پانچ سال تک میں یہ کام کرتا رہا۔

اس دوران میں ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا کہ میرا ایک جاننے والا عیسائی سرور مسیح اکثر و بیشتر مجھ سے ہمدردی کیا کرتا تھا۔ اُس کی باتوں میں اتنی مٹھاس تھی کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ویسے بھی زندگی میں کبھی دو بول ہمدردی کے نصیب نہ ہوئے تھے۔ سرور مسیح میری زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا جو باقاعدگی سے دو تین گھنٹے روز میری صحبت میں گزارتا اور میرا حوصلہ بڑھاتا۔ ایک دن وہ مجھے چرچ لے گیا اور فادر سے میرے حالات بیان کیے۔ پادری' سرور مسیح سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے بڑی توجہ سے میرے حالات سنے اور چکنی چپڑی باتیں کر کے مجھے وہیں چرچ میں روک لیا۔ میرے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک ہونے لگا۔ تینوں وقت کا کھانا مجھے کمرے ہی میں مل جاتا اور ہر ہفتے پادری مجھے کچھ جیب خرچ بھی عنایت کرنے لگا۔

میں مفت کی روٹیاں توڑنے کا عادی نہ تھا لہٰذا یہ نوالے بہ مشکل میرے حلق سے اترے۔ میں جب بھی پادری صاحب سے کسی کام کے لیے کہتا' وہ ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے کہ تم نے اتنے دکھ اٹھائے ہیں' اب چند روز سکھ کا مزا بھی لے لو۔ وہ جب بھی آتے' میرے لیے چند کتابیں بھی ضرور ساتھ لاتے۔ مجھے مطالعے کا شوق ہمیشہ سے تھا اس لیے ان کی دی ہوئی کتابیں بھی بڑی خوشی سے پڑھتا۔ پادری صاحب سمجھے کہ میں ان کے جال میں پھنس گیا ہوں' چنانچہ ایک دن انہوں نے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی جسے سن کر میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور انہیں خوب کھری کھری سنائیں۔ اب میں ایک لمحے کے لیے بھی وہاں رکنے کا روادار نہ تھا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی طبیعت کسی طرح نہ سنبھلی تو میں ایک دن مفتی محمد شفیع مرحوم کے پاس چلا گیا اور انہیں تمام واقعہ سنایا۔ انہوں نے مجھے توبہ استغفار کرنے کا مشورہ دیا اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ میں دن رات توبہ کرتا رہا اور صدقِ دل سے عہد کیا کہ بھوکا مر جاؤں گا لیکن خدا کے بتائے ہوئے راستے سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہ ہٹوں گا۔

میرے بڑے بھائی صاحب ایک سرکاری کارپوریشن میں اچھے عہدے پر فائز تھے اور اُن دنوں کوئٹہ میں تعینات تھے۔ انہوں نے خط لکھا کہ کوئٹہ آ جاؤ' میں تمہیں اکاؤنٹس کلرک لگوا دوں گا۔ مجھے انگریزی' اُردو اچھی خاصی آتی تھی لہٰذا بغیر سفارش دکھائے مجھے نوکری مل گئی اور ایک سال بعد ہی میں یوڈی سی ہو گیا۔ چپکے چپکے پرائیویٹ میٹرک کی تیاری بھی شروع کر دی۔ دو سال پلک جھپکتے گزر گئے اور میں نے میٹرک کر لیا لیکن خوشی مجھے کبھی راس نہ آئی تھی پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے خواب کی تعبیر ملنے پر میں دو چار دن بھی خوش ہو جاتا۔ میٹرک کا رزلٹ آنے کے دوسرے دن ہی بھائی صاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ اُن کی جگہ دوسرا افسر آ گیا اور لوگوں نے اس کے خوب کان بھرے۔ اس نے بھی پورے دفتر میں مجھے ہی نشانہ بنایا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو مجھ سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ طلب کر بیٹھا۔ میرے پاس سرٹیفکیٹ ہوتا' تب بھی اس کا مطالبہ پورا نہ ہوتا کیونکہ میں دو سال سے نوکری کر رہا تھا اور میٹرک میں نے حال ہی میں کیا تھا۔ پہلے تو میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا لہٰذا یہ نوکری بھی چھوڑنا پڑی اور میں کراچی واپس آ گیا۔

کراچی آنے کے بعد میں نے پھر مزدوری

شروع کردی اور ساتھ ساتھ انٹر کی تیاری بھی کرتا رہا۔ صبح سے شام تک مزدوری کرتا اور پھر رات گئے تک پڑھتا۔ میں بہت تھک گیا تھا اور میرے لیے دونوں کام جاری رکھنا بہت مشکل تھے۔ کسی نہ کسی طرح امتحان دیا مگر صرف دو پرچے ہی کلیئر ہو سکے۔ سپلیمنٹری میں ایک پرچہ اور نکل گیا۔ غرض یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ کبھی سالانہ تو کبھی سپلیمنٹری اس طرح میں قسطوں میں امتحان دیتا گیا اور کسی نہ کسی طرح انٹر ہو ہی گیا۔ اب میں ہتھیار ڈالنے کے بالکل قریب تھا اور جان چکا تھا کہ اس زندگی میں تو پڑھائی اور ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انہی دنوں گھر میں میری شادی کے تذکرے ہونے لگے۔ ایک روز کام سے واپس آیا تو بڑے بھائی صاحب' بھابی صاحبہ اور میرا خالہ زاد پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ بھابی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں۔ ''بہت آزاد پھر لیے اب ہم لوگوں نے سوچا ہے کہ تمہاری شادی کردی جائے' بولو کیا کہتے ہو؟''

میں اپنی الجھنوں میں گرفتار تھا' بھابی کی یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی اس لیے چڑ کر بولا۔ ''ہمارے درمیان مذاق کا رشتہ ضرور ہے لیکن مذاق وہ ہونا چاہیے جس میں کسی کی تضحیک کا پہلو نہ ہو۔''

بھابی حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگیں اور بولیں۔ ''بھیا! ہم تمہیں کیوں ذلیل کرنے لگے۔ شادی تو ایک فرض ہے' آخر کب تک اس کی ادائیگی سے دور رہو گے؟''

''میں نے شادی سے کب انکار کیا ہے لیکن آپ لوگ کم از کم دس جگہ رشتہ لے کر جا چکی ہیں' آخر میرا رشتہ کیوں قبول نہیں ہوتا؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟ یہی نا کہ مستقل نوکری نہیں ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ رشتہ نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ میں نے بھی صبر کرلیا ہے کہ نہ مجھے مستقل نوکری ملے گی اور نہ ہی میری شادی ہوگی اس لیے آپ لوگ بھی اس خیال کو دل سے نکال دیں۔ دوسرے میرے پاس شادی کا خرچ برداشت کرنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔''

بھابی نے ایک بار پھر مجھے کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا لیکن والدہ تیار نہ ہوئیں۔ وہ ہمیشہ میری شادی کی مخالفت کیا کرتیں حالانکہ مجھ سے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں وہ اسی گھر میں کر چکی تھیں مگر میری شادی کا نام سنتے ہی انہیں غصہ آجاتا۔ ہر لڑکی میں کیڑے نکالتیں۔ میرے ساتھ اُن کا رویہ اب تک ویسا ہی تھا۔ بچپن سے آج تک انہوں نے کبھی میری بہتری کے لیے نہ سوچا بلکہ ہمیشہ مخالفت ہی کی۔

ایک ہفتے بعد ہی مجھے بھائی صاحب نے اپنے گھر طلب کیا اور بولے۔ ''آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد تمہارا نکاح ہے۔ تم کچھ پیسوں کا بندوبست کرسکو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم سب انتظام کرلیں گے۔''

بھائی صاحب کی زبانی یہ الفاظ سن کر میں حیران رہ گیا' گویا اُن لوگوں نے سب کچھ طے کرنے کے بعد مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے دو باتوں کی فکر تھی' ایک تو یہ کہ مستقل ملازمت نہ ہونے کے سبب اپنا گزارہ ہی مشکل سے ہوتا تھا' بیوی کا بوجھ کیسے اٹھاؤں گا اور دوسرے یہ کہ شادی کے لیے میرے پاس پیسے بھی نہ تھے لیکن بھابی اور بھائی صاحب نے میری ایک نہ سنی' مجبوراً میں نے اپنا کل سرمایہ جو ساڑھے تین سو روپے پر مشتمل تھا' اُن کے حوالے کردیا اور یہ کہہ کر چلا آیا کہ آپ جانیں اور آپ کا کام۔

شادی تو ہوگئی لیکن مالی حالات میں کوئی فرق نہ آیا' ذلت اور بے عزتی مقدر میں لکھی تھی اس لیے

شادی کے بعد تین ماہ تک کوئی کام نہ ملا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ نئی دلہن کیا کیا ارمان لے کر شوہر کے گھر آتی ہے مگر اُس بے چاری کے سب ارمان خاک میں مل گئے لیکن آفریں ہے اُس عورت کی ہمت پر کہ کبھی منہ سے اُف تک نہ کی بلکہ اپنی ساری تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ ہمیشہ میری ہمت بندھائی اور خود بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو کب کی مجھے چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس چلی جاتی لیکن اُس اللہ کی بندی نے کبھی بھولے سے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ میری بیکاری اور بے روزگاری سے عاجز آگئی ہے۔

بالآخر بیوی کی دُعائیں قبول ہوئیں اور مجھے تھوڑا بہت کام ملنے لگا۔ حالات میں کچھ تبدیلی آئی لیکن دل کو ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا کہ خوشی اور اطمینان مجھے کبھی راس نہ آئے تھے۔ اسے اتفاق کہہ لیجیے کہ کافی دنوں تک کوئی بات نہ ہوئی۔ کام بھی مل جاتا اور کبھی کئی کئی دن خالی گزر جاتے۔

زندگی کی گاڑی یونہی گھسٹ رہی تھی کہ ایک بار پھر خوشیوں نے میرے دروازے پر دستک دی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا بیٹا عنایت کیا۔ خاندان والوں کے منہ لٹک گئے۔ میری والدہ نے حسب عادت جلی کٹی سنائیں۔ مبارک باد دینا تو درکنار' کسی نے بچے کے ہاتھ پر ایک روپیا تک نہ رکھا بلکہ طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ میں ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا اس لیے سنی اَن سنی کردیتا مگر بیوی ان باتوں کو برداشت نہ کرسکی اور بیمار پڑ گئی۔ کئی جگہ دکھایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا لیکن دوسرے بچے کی ولادت قریب تھی لہٰذا آپریشن ممکن نہ تھا۔ اسی حالت میں ایک دن بیوی ڈاکٹر کے پاس جارہی تھی کہ راستے

یادیں رہ جاتی ہیں

اُردو ادب کی معروف مصنفہ' ڈرامارائٹر' سماجی اور سیاسی شخصیت **فاطمہ ثریا بجیا** کی

رُودادِ حیات

کچھ کہی' کچھ اَن کہی باتیں' یادیں ایک عہد' ایک دَور کی کہانی' بجیا کی زبانی

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے صفحات پر بہت جلد پیش کی جائے گی۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

ہم بہ خوشی ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے رائٹرز کو اطلاع دے رہے ہیں کہ ادارے نے ماہ ستمبر 2013ء کے آخری ہفتے میں ''سچی کہانیاں'' کے رائٹرز کے لیے ایک عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا ہے کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

شرکت کے خواہش مند رائٹرز سے درخواست ہے کہ وہ بہ ذریعۂ ٹیلی فون ادارے سے رابطہ کرکے اپنی شرکت کو یقینی بنائیں۔ شکریہ!

110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ' کراچی۔

ٹیلی فون نمبرز: 34930470-34939823

میں رکشا الٹ گیا۔ بیوی کو کافی چوٹیں آئیں اور دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ شام کو گھر آیا تو بیوی ہاتھ پر پلاسٹر چڑھائے بیٹھی تھی۔ اُس زمانے میں ساس اور سسر نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اپنے تو سدا کے بیگانے تھے' کبھی کسی نے جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا کہ میاں' کس حال میں ہو؟

اس بار اللہ تعالیٰ نے ایک پھول سی بیٹی عطا کی۔ میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ بیٹی کی پیدائش سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔ میں نے پوری دل جمعی سے بیوی کا علاج شروع کرایا۔ سوا مہینے بعد آپریشن ہوا۔ اس طرح اللہ نے بیوی کو دوبارہ زندگی عطا کی۔

بیوی کی صحت یابی کی خوشی میں ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا لیکن سوائے بڑے بھائی اور بھابی کے' اس میں کوئی شریک نہ ہوا بلکہ حسبِ عادت باتیں بنائی گئیں۔ میرے سسرال والوں نے مشورہ دیا کہ جب کوئی تمہارا ہمدرد نہیں تو گھر والوں کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ؟ بہتر یہی ہے کہ ہمارے گھر کے قریب کوئی مکان کرائے پر لے لو تاکہ ہم لوگ تمہاری خبر گیری کرسکیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس طرح مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ہماری ساس' بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ہمارے پاس آ سکتی تھیں کیونکہ میں اپنے کام پر اور بیگم اسکول چلی جاتیں تو بچوں کو دیکھنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ اب میں اپنے تمام رشتے داروں سے الگ ہو چکا تھا اور سسرال والوں کو ہی میں نے اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا کیونکہ یہی لوگ میرے اچھے برے وقت میں کام آنے والے تھے۔

بڑے بھائی صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے ایک نیم سرکاری ادارے میں اسسٹنٹ کی جاب دلوا دی۔ دو سال تک عارضی طور پر کام کرتا رہا لیکن جب مستقل ہونے کا وقت آیا تو عہدہ کم کر دیا گیا۔ اسسٹنٹ کی بجائے یو ڈی سی بنا دیا گیا کیونکہ اسسٹنٹ کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری تھا جبکہ میں صرف انٹر تھا۔ میں نے اس پر بھی خدا کا شکر ادا کیا اور محنت سے کام کرتا رہا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن اچانک میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ میں پورے ایک سال تک دفتر نہ جا سکا' گو دفتر کی جانب سے علاج ہو رہا تھا مگر بیماری کی طوالت سے سب لوگ پریشان تھے پھر اللہ نے اپنا کرم کیا' میں آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگا۔

اب میرے حالات قدرے پُرسکون ہیں۔ میری ملازمت معمولی سہی مگر مستقل ہے۔ بیگم بھی اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہوگئی ہیں۔ اُن کی ذات نے مجھے بڑا حوصلہ اور سہارا دیا ہے۔ بہت ہی صابر' وفادار اور فرماں بردار عورت ہے۔ میری بیوی نے ہر برے وقت میں میرا ساتھ دیا اور اب بھی دے رہی ہیں۔ بچے اسکول جاتے ہیں البتہ اُن کی دیکھ بھال کا مسئلہ پھر کھڑا ہوگیا ہے کیونکہ اُن پر جان چھڑکنے والی ساس اب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کاموں سے واپس آنے کے بعد گھر کے کام میں جُت جاتے ہیں۔ کہنے کو رشتے دار بہت ہیں مگر ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔

شیر خواری سے جوانی تک میرے حصے میں دکھ ہی دکھ آئے ہیں اور اب جبکہ جوانی بھی رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے' یہ احساس میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتا ہے کہ وہ کون سا جرم مجھ سے سرزد ہوگیا ہے جس کی سزا بچپن سے آج تک بھگت رہا ہوں اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس سزا کی مدت کب ختم ہوگی؟

.....☆☆.....

رحمت کا اشارہ

آسیہ غزالہ نہاں

تو ہے اوجھل ' نظر آئے نہ سراپا تیرا
میں جو دکھتا ہوں ' ترا عکس ہوں ' سایا تیرا

کراچی سے دوسری لڑکی آپ بیتی

رُوحانیت کی دنیا بہت پراسرار ہے۔ ہر ایک کو رُوحانیت نہیں ملتی لیکن اللہ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ اگر نوازنے پر آئے تو ذرے کو آفتاب بنادے۔ کسی کی ایک ذرہ برابر نیکی اس کو پسند آجاتی ہے اور وہ اس کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پالیتا ہے۔

دراصل ساری بات نیت کی ہوتی ہے اور اعمال کا دارومدار نیت ہی پر ہے۔ وہ دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ اسے معلوم ہے اس کا کون سا بندہ کیا چاہتا ہے اور کس طرح چاہتا ہے؟

مجھ جیسی ادنیٰ بندی اس کی معبودیت کی تعریف اس کے شایانِ شان نہیں کرسکتی۔ میرے اللہ نے جس طرح مجھے نوازا ہے' میں اس کا حال بتانا چاہتی ہوں۔ یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُسی کو راہِ ہدایت پر چلاتا ہے' جس کی خواہش سیدھے راستے پر چلنے کی ہوتی ہے۔ آج میں آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔

•......•......•......•

میرا نام زیبا ہے اور میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔

ایک مرتبہ نماز کی نیت باندھ کے میں نے تلاوت شروع کی ہی تھی کہ دماغ پر فضول خیالات کی یلغار ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بالکل بھول گئی کہ میں حالتِ نماز میں ہوں۔ لب پہ تلاوت تھی اور دل میں مختلف خیالات گردش کر رہے تھے۔

'کمیٹی نکلے تو ڈرائنگ روم کا فرنیچر چینج کروں' صوفہ بہت پرانا ہوگیا ہے' آج کل کتنے خوبصورت ڈیزائن کے صوفے آرہے ہیں۔'

''اللہ توبہ! میں نماز میں کن خیالوں میں کھوگئی ہوں؟'' یہ یاد آتے ہی خود کو سرزنش کی اور پھر پوری توجہ تلاوت پر مرکوز کردی۔

دو رکعت تک تو میں نے اپنا دھیان تلاوت پر رکھا لیکن پھر آخری رکعت میں وہی فضول خیال آگیا اور میں پھر بھول گئی۔ 'بچوں کا یونیفارم پرانا ہوگیا ہے' بستہ بھی خراب ہورہا ہے' جوتے بھی ڈھیلے ہیں۔'

وہی دنیاوی خیالات...... توبہ کرکے پھر نماز کی طرف متوجہ ہوگئی مگر خیالات پھر آدھمکے۔

یہ میرے ساتھ پچھلے کئی دنوں سے ہورہا تھا۔ وُضو کرکے جائے نماز بچھائی کہ اچانک میں نماز کے لیے کھڑی ہوگئی تھی۔ کوئی ضروری کام یاد آجاتا اور سوچتی کہ ابھی نماز میں تو ٹائم ہے' چلو' پہلے یہ کام کرلوں اور کام میں اُلجھ کے نماز بھی بھول جاتی۔ جب یاد آتا تو نماز قضا ہوچکی ہوتی تھی لیکن میں نے نماز پڑھنا چھوڑی نہیں۔ قضا بھی ہوجاتی تو بعد میں پڑھ لیتی۔

آج بھی بار بار نماز میں تسلسل ٹوٹ رہا تھا۔ 'دیورانی نے کتنا اچھا فلیٹ خریدا ہے۔ کتنے فخر سے بتارہی تھی۔ ہونہہ' چار کمرے کا فلیٹ لے کر اتنا اترا رہی ہے۔ میرے میاں کی ترقی ہوجائے تو میں بھی یہ گھر بیچ کے کوئی اچھا سا بنگلا نما گھر لے لوں پھر پوچھوں کہ چھوٹے سے فلیٹ پر اتنا اکڑ رہی تھیں' اب میرا بنگلا دیکھو' جل کر رہ جائے گی!'

حالانکہ جل میں خود رہی تھی اس کے فلیٹ خریدنے کی وجہ سے۔ اس نے تو ہمیں خوش ہوکر بتایا تھا تاکہ ہم بھی خوش ہوں اور میں بظاہر تو مبارک باد دے رہی تھی مگر اندر سے حسد کررہی تھی۔

پھر ان خیالات کو ذہن سے جھٹک کر نماز کو پورا کیا اور دوسرے وقت کی نماز میں پھر وہی خیالات! 'پڑوسن کا سوٹ کتنا پیارا تھا۔ تنخواہ ملے تو میں بھی اس سے اچھا خریدوں پھر اسے دکھاؤں گی۔' ارے میں

پھر بہک گئی۔ استغفار! اور پھر نماز کی ادائیگی۔

'بہت دن ہوگئے' امی کی طرف نہیں گئی۔ وہ میری منتظر ہوں گی۔ اس اتوار کو ضرور جاؤں گی۔'

یہ سب خیالات' ساری باتیں' عین نماز کے دوران ہی میں یاد آتیں اور پھر سارے خیالات بھولنے کی کوشش کرتے ہوئے نماز کی ادائیگی شروع کرتی۔

'آخر یہ میرے ساتھ کیوں ہورہا ہے؟'

رات کو جب میں سب کام ختم کرکے بستر پر گئی اور اپنا محاسبہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں جاہل عورتوں والی خصوصیات پیدا ہورہی ہیں۔ سسرال والوں سے جلنا' ملنے جلنے والوں سے حسد کرنا' پڑوسیوں کی برابری کرنا' یہ سب بیماریاں مجھ میں پہلے تو نہیں تھیں' اب ایسا کیوں ہورہا ہے؟'' ''اے اللہ! مجھے معاف کردے۔ تو بڑا غفور الرحیم ہے۔ تو دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ تجھے معلوم ہے' میں یہ جان بوجھ کر نہیں کرتی۔ تو مجھے سیدھا' سچا اور کھرا مسلمان بنادے۔'' میں نے صدقِ دل سے دُعا کی۔

میرا تعلق ایک نجیب الطرفین سید گھرانے سے ہے۔ میرے شوہر بھی سید ہیں۔ میرا میکا اور سسرال دونوں ہی پردہ دار اور صُوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں حتیٰ کہ ہمارے گھر کے نوکر تک نماز کے پابند ہیں۔ میرے والد کا شمار کھاتے پیتے گھرانے میں ہوتا تھا۔ وہ ایک زمیندار تھے۔ دولت مند ہونے کے باوجود وہ غریبوں کے ہمدرد اور اپنے ہاریوں سے محبت کرتے تھے۔ ایمانداری اور راست بازی اُن کی خصلت تھی۔ وہ ناجائز ذرائع آمدنی کے شدید مخالف تھے۔

والد صاحب کے یہ تمام اچھے اوصاف مجھ میں بھی تھے۔ میرے دروازے سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ میرے والد کہتے تھے کہ جو کوئی بھی اللہ کے نام پر مانگے' کبھی خالی ہاتھ مت جانے دو۔ چاہے اس کی ظاہری حالت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ کیا پتا اسے اس وقت کوئی مجبوری ہو کہ اسے سوال کرنا پڑ رہا ہے۔

اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ کبھی بھی حرام کھانے کا تصور بھی مت کرنا۔ کم ہونے کے باوجود رزقِ حلال میں بہت برکت ہوتی ہے اور ضمیر بھی مطمئن رہتا ہے جبکہ ناجائز اور حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ حرام پیسا جتنی تیزی سے آتا ہے' اس سے بھی زیادہ تیزی سے خرچ ہوجاتا ہے۔

اُن کی نصیحت یہ بھی تھی کہ بے ایمانی کا کبھی سوچنا بھی مت کیونکہ ہمارے خاندان میں بے ایمانی اور رشوت پنپ نہیں سکتی۔

اُن کی کہی ہوئی باتیں بہ ظاہر تو بڑی سادہ اور عام سی تھیں جو ایک مسلم گھرانے کا خاصہ ہوتی ہیں مگر اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ واقعی یہ باتیں زندگی کے لیے کتنی ضروری ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑ دیا جائے تو زندگی کا سکون ختم ہوجاتا ہے۔ مجھے اس کا تجربہ ہورہا تھا۔ میرے اندر ایک اور شک کا ناگ سر اٹھانے لگا تھا' مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے گھر پر کسی نے کچھ کردیا ہے۔ کون ہے' کس نے کیا؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میرے شوہر ایک مالیاتی ادارے میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ معقول آمدنی تھی۔ ہمارا اپنا گھر تھا جس کی نچلی منزل کرائے پر اٹھا رکھی تھی۔ میں خود بھی ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں معلمہ کے عہدے پر فائز تھی۔ آمدورفت کے لیے اپنی کار بھی تھی۔ بچے بھی اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

غرض یہ کہ ہم اچھی اور خوشحال زندگی گزار رہے

تھے۔ میں اور میرے شوہر دونوں ہی مذہبی فرائض کی پابندی کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں سکون تھا۔ ہم لوگ لڑائی جھگڑے سے بھی دور تھے۔ چھوٹی موٹی ناراضگی تو ازدواجی زندگی کا حصہ ہوتی ہے مگر گھر میں کبھی لڑائی کی نوبت نہیں آتی تھی۔

چند دنوں سے میرے گھر میں برکت اٹھ گئی تھی۔ آمدنی میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ خرچ بھی نہیں بڑھا تھا مگر پیسا آتے ہی کیسے خرچ ہو جاتا' یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ میرے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔

میں گھر کا سودا اتنا لاتی تھی کہ مہینا گزرنے کے باوجود بچ جاتا تھا اور اب مہینا ختم ہونے سے پہلے ہی راشن ختم ہو جاتا تھا۔

اس کے ساتھ یوٹیلیٹی بلز کی ادائیگی بھی مشکل ہونے لگی۔ کبھی گیس' کبھی بجلی کا بل ادا نہیں ہو پاتا تھا۔ کبھی نیٹ اور کیبل کے بل کی ادائیگی مشکل ہو جاتی حتیٰ کہ اکثر بچوں کے اسکول کی فیس بھی ادا نہیں کر پاتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ہم میاں بیوی میں اکثر تکرار بھی رہنے لگی۔

وہ کہتے۔ ''تم فضول خرچ ہو گئی ہو؟''

میں جواب دیتی۔ ''آپ کی آمدنی میں اب گزارہ نہیں ہوتا۔''

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اب نماز میں یکسوئی نہیں رہی۔ نماز کے دوران میں دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا۔ میرے دل میں رشتے داروں' دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے لیے کینہ اور حسد پیدا ہو گیا۔

اکثر اوقات میری نماز قضا ہونے لگی مگر میں نے نماز پڑھنا چھوڑی نہیں۔ وقت گزر جاتا تو میں قضا پڑھ لیتی۔ رات کو میں توبہ استغفار کرتی اور پھر وہی ہو جاتا جس کے لیے میں توبہ کرتی۔ اس کے ساتھ میرے گھر میں بلیوں اور چوہوں نے ڈیرا ڈال دیا اور ایک عجب ناگواری بو گھر میں رہنے لگی۔ میں ایئر فریشنر سے بو ختم کرنے کی کوشش کرتی مگر اسپرے کی خوشبو اور بلی' چوہوں کی ناگوار بو مل کر ایک اور عجب بو پیدا ہونے لگی۔ میں حد درجہ پریشان تھی۔

ایک دن میں نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو بھی چوہوں اور بلیوں کی بو آتی ہے؟''

انہوں نے مجھے جو جواب دیا' اسے سن کر میں اتنی افسردہ اور شرمندہ ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ انہوں نے مجھے کہا۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے زیبا؟ تم تو نفسیاتی مریضہ ہوتی جا رہی ہو۔ مجھے تو کوئی بو نہیں آ رہی ہے۔''

اُس دن میں بہت روئی۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ ایک زمانہ میرے سلیقے اور صفائی ستھرائی کو پسند کرتا تھا' میری خوش لباسی کی لوگ تعریف کرتے تھے۔ اسٹاف کی ٹیچرز اکثر کہتیں۔ ''تم کہاں سے اتنی اچھی اچھی ساڑھیاں لیتی ہو جو تمہارے اوپر بہت جچتی ہیں؟''

میری شاگرد بچیاں بھی کہتیں کہ مس......! آپ خوشبو بہت اچھی استعمال کرتی ہیں۔

آج میرا شوہر ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی ہو۔ تمہیں اپنے جسم سے بو آ رہی ہوگی! پھر دوسرے میرے بارے میں کیا کہتے ہوں گے؟

اُس دن میں نے اپنے اسکول کی چھٹی کی۔ بچوں کے اسکول اور شوہر کے آفس جانے کے بعد پورے گھر کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کی۔ ماسی کے آنے سے پہلے ہی میں نے تمام کونے کھدروں کی صفائی کر ڈالی۔ بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کی سیٹنگ بھی بدل ڈالی۔ پردے اور کشن بھی دھو دیے۔ بیڈ پر نئی چادر بچھائی۔ خود بھی نہا دھو کر پاک و صاف لباس پہنا اور بہترین خوشبو لگا کر آیت الکرسی پڑھ کے دَم کر کے پانی خود بھی پیا اور کمروں کی دیواروں پر بھی چھڑکا۔ اس کے بعد چاروں قُل پڑھ کے لوبان کی دھونی پورے گھر میں دی۔

اُس دن مجھے گھر کی فضا ہلکی محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے ماحول میں ایک بے چینی اور بھاری پن محسوس ہوتا تھا۔

اُس دن نماز میں بھی یکسوئی رہی۔ شیطانی خیالات نے مجھے تنگ نہیں کیا۔ میں نے جن لوگوں کے لیے غلط سوچا تھا' اُن کی طرف سے استغفار کی تسبیح پڑھی اور اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگی۔

اس کے بعد میں نے ہمت کی اور تین سو تیرہ دفعہ معوذتین پڑھ کر خود پر دَم کیا۔ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گھر کا حصار کیا۔ اس کے بعد میں نے استغفار' کلمہ اور معوذتین (سورۃ فلق اور سورۃ الناس) پڑھنا اپنا معمول بنا لیا۔ یہ تسبیحات مجھے کسی نے پڑھنے کے لیے نہیں بتائی تھیں۔ میں نے خود ہی شروع کر لیں۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے حالات سنبھلنے لگے۔ ایک دن میں تنہائی میں اپنے حالات پر غور کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا تو میرے مرحوم والد کے دوست کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ میرے والد کے بہترین دوست تھے۔ ہم لوگ انہیں چچا کہتے تھے۔ وہ پیرانہ سالی کے باوجود اتنی دور سے مجھ سے ملنے آتے تھے۔

میں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اپنے شوہر کو اطلاع دینے چلی گئی۔

دمِ واپسیں

☜ ......انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی موت بڑی تاثر انگیز تھی۔ وہ اسی طرح مرا جیسے ایک بادشاہ اور شریف زادے کو مرنا چاہیے۔ اُس نے اپنے تیمارداروں اور درباریوں سے دمِ واپسیں پر کہا۔ ''مرتے مرتے میں نے بہت وقت لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے معاف فرمائیں گے۔''

☜ ......کارڈنل رشلو سے اُس کے آخری لمحوں میں پوچھا گیا۔ ''آپ اپنے دشمنوں کو معاف کرتے ہیں؟''

☜ ......اُس نے جواب دیا۔ ''میرا کوئی دشمن نہیں' سب دشمن ملک کے ہیں۔''

☜ ......مصور کورو نے دمِ واپسیں پر یہ تمنا کی کہ جنت میں بھی اُسے یہاں کی طرح تصویریں بنانے کے مواقع ملیں۔

☜ ......مشہور موسیقار شوپاں نے یہ کہا۔ ''آپ لوگ میری یاد میں موزارٹ کا نغمہ بجایئے گا۔''

☜ ......نپولین بھی اسی طرح مرا جس طرح انسانوں کے کسی پیدائشی قائد کو مرنا چاہیے۔ اُس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ''فرانس......فوج......فوج کے جرنیل۔''

☜ ......مشہور فلسفی ہیلے نے جو ایک نامور طبیب کی شہرت بھی رکھتا تھا' آخری لمحات میں اپنی نبض کا معائنہ کیا اور اپنے ایک معالج سے کہا۔ ''اچھا بھائی' رخصت' اب اس نبض کی ضربات بند ہو گئی ہیں۔''

☜ ......لیگنی مشہور ریاضی دان تھا۔ اُس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں جذر اور جذر المکعب کے بارے میں ایک مختصر اور آسان طریقہ رائج کیا تھا۔ موت کے وقت وہ بالکل بے سدھ تھا اور اپنے دوستوں کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ یکایک ایک شخص نے جھک کر اُس کے کان میں پوچھا۔ ''لیگنی! ایک سو چالیس کا جذر کیا ہے؟''

لیگنی نے جواب دیا۔ ''بارہ'' اور اُس کے بعد جان' جان آفریں کے سپرد کر دی۔

''جینے کا قرینہ'' از آندرے موروا

مترجم مختار صدیقی

تعاون محمد خان شنواری

میرے شوہر بھی اُن سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں اُن دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھ گئی۔ میں جب اُن کے لیے چائے اور دوسرے لوازمات لے کر آئی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور بڑی محبت سے خیریت دریافت کی پھر وہ اچانک بولے۔ ''بیٹا.....! یہ کریڈٹ کارڈ کا چکر چھوڑ دو اور زکوٰۃ پابندی سے دیا کرو۔''

میں اُن کی بات سن کر اچھل پڑی۔ واقعی ایک سال مجھ سے زکوٰۃ ادا کرنے میں کوتاہی ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ جب دیر ہوگئی ہے تو آرام سے دے دیں گے پھر ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی یعنی زکوٰۃ نہ دینے کا گناہ مجھ سے سرزد ہوا تھا۔

کریڈٹ کارڈ تو ہمارے منع کرنے کے باوجود ہمارے ایک جاننے والے نے بنوا دیا تھا۔ دراصل وہ بینک میں کریڈٹ کارڈ کے شعبے میں تعینات تھے اور کارڈ بنوانے پر انہیں کمیشن ملتا تھا۔ انہوں نے طرح طرح کے دلائل دے کر ہمیں کریڈٹ کارڈ بنوانے پر قائل کرلیا تھا اور جب کارڈ بن ہی گیا تو ہم دونوں میاں بیوی نے اسے استعمال بھی کیا تھا۔ اس بات کا علم ہم نے کسی کو بھی نہیں ہونے دیا تھا حتیٰ کہ بچوں کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی۔ کارڈ استعمال کرتے وقت ایسا لگتا تھا کہ ہم فری میں خرچ کررہے ہیں مگر بینک کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی ہوجاتی تو اس پر سود لگ جاتا اور یوں ادائیگی کے باوجود اٹھائیس ہزار کی رقم بڑھ کے اٹھاون ہزار ہوگئی تھی کیونکہ ایک دن بھی لیٹ ہونے کی صورت میں اس پر واجب الادا رقم سے ڈبل سود لگ جاتا تھا۔ یوں ہم دونوں اس کریڈٹ کارڈ کے چکر میں پھنس کر رہ گئے۔

تنخواہ کا ایک بڑا حصہ کریڈٹ کارڈ کی ادائیگی کی نذر ہوجاتا پھر بھی رقم بڑھتی ہی رہتی۔ اب ہم اس کو ختم کرنے کی کوشش میں تھے اس لیے اس کا استعمال چھوڑ دیا تھا۔

میں اسی سوچ میں تھی کہ مجھے گم صم دیکھ کر وہ پھر بولے۔ ''شکر کرو بیٹا! تم بڑے نقصان سے بچ گئیں۔ تمہیں بروقت ہدایت مل گئی کیونکہ تمہاری نیت اچھی تھی اور تمہارے گھر اور تمہارے معاشی حالات کو برباد کرنے کے لیے گھر میں قبرستان کی مٹی ڈالی گئی تھی لیکن تمہارے وظائف پڑھنے اور نیک عمل سے اس کے اثرات بھی ختم ہوگئے۔''

''لیکن چچا! یہ دشمنی میرے ساتھ کس نے؟''

''اس بات کو جانے دو، بس اس کے حق میں دُعائے خیر کرو کہ اللہ اسے نیک ہدایت دے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''میں اگر آپ کے سامنے نام لوں گا تو آپ بتا دیں گے کہ میرا شک صحیح ہے یا نہیں؟''

میں ان کی علمی قابلیت کی معتقد تو تھی ہی، اب روحانیت کی بھی قائل ہوگئی۔

''بیٹا! بدگمانی اور شک بھی گناہ ہے۔ کسی پر بھی بدگمانی نہ کرو۔ اگر یقین ہے تب بھی بدگمانی سے صدقہ، خیرات جیسا نیک عمل بھی ضائع ہوجاتا ہے۔ اپنی نیکیوں کو چھوٹی سی بات پر ضائع نہ کرو بلکہ چھوٹے چھوٹے نیک عمل سے اپنے لیے بہتری پیدا کرو۔ اللہ تمہاری چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی قبول کر کے بڑے سے بڑا اجر عطا فرمائے۔ (آمین!) ویسے تم جو دوسروں کے لیے استغفار کرتی ہو یہ بھی بہت اچھا اور نیک عمل ہے۔''

وہ انکشاف پر انکشاف کررہے تھے اور میں اُن کی روحانیت کی قائل ہوتی جارہی تھی۔ اپنے معمولات تو میں نے کسی کو بھی نہیں بتائے تھے۔

اس دن رات کو میں نے پھر اپنا احتساب کیا۔ کریڈٹ کارڈ کے سود میں پھنسنا اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ اُسی دن میں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اللہ سے رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی کی دُعا مانگی۔ ''اے اللہ! اے پروردگار! میں اپنے گناہوں سے تائب ہوتی ہوں۔ میری توبہ قبول فرمالے۔ اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ اے مالک دو جہاں! اگر میرے گناہ میرے بگڑے ہوئے گھریلو حالات کے سنورنے میں آڑے آرہے ہیں تو، تُو اپنے فضل و کرم اور رحم سے میرے گناہوں کو بخش دے۔ میری غلطیوں کو معاف فرمادے۔ میرے ان تمام گناہوں کو بخش دے جو دانستہ ہوئے ہیں اور ان گناہوں کو بھی بخش دے جو نادانستہ ہوئے ہیں۔ تُو نے کہا ہے، مجھ سے مانگو میں دوں گا، مجھے پکارو میں سنوں گا۔ تُو ستار ہے، غفار ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، کریم ہے۔ تُو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا ہے۔ تُو دلوں کا بھید جاننے والا ہے۔ میری دُعاؤں کو سن لے میرے معبود! میرا ہاتھ تیرے آگے پھیلا ہوا ہے۔ تُو میرے گناہوں کو بخش کے مجھے دنیا میں بھی عزت دے اور دین میں بھی سرخرو فرمانا۔''

دُعا کر کے مجھے بہت دلی سکون محسوس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اللہ نے میری دُعائیں سن لی ہیں اور شرف قبولیت بخش دیا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا، اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے، مجھے پکارو میں سنوں گا، مجھ سے مانگو میں عطا کروں گا۔ وہ تو سب سے بڑا داتا ہے۔ مجھے اپنی بندگی پر خوشی محسوس ہوئی۔

پھر میں نے تھوڑا لاڈ کرنا چاہا اور کہا۔ ''اے اللہ! اگر تُو نے میری توبہ قبول کرلی ہے اور میری دُعائیں سن لی ہیں تو مجھے کوئی اشارہ دے دے۔ تُو تو ستار ہے، غفار ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، کریم ہے۔''

میں کتنی ہی دیر تک اللہ کو اس کے پیارے پیارے نام سے مخاطب کرتی رہی۔ پھر جو کچھ میں نے دیکھا، اس کی فرحت اور خوشی آج بھی میرے دل و دماغ پہ نقش ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل میں اللہ کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میرا اللہ کیسا رحمٰن ہے، کتنا رحیم ہے۔ اس کی تعریف کوئی بیان نہیں کرسکتا۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم ایک قدم چل کر آؤ، میں دوڑ کر تمہارے پاس آؤں گا۔ میں تو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ تم پکار کر تو دیکھو!

میں نے جاگتے میں بہ قائم ہوش و حواس دیکھا۔ کھلی آنکھوں سے۔ میرے سامنے لفظ ''اللہ'' نُور کے موتی موتگوں سے لکھا ہوا تھا۔ ایسا پُرنور کہ اس پر نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں مگر آنکھیں خیرہ ہونے کے بعد بھی میں اس نُور کو جذب کرنا چاہ رہی تھی۔

کتنا خوبصورت نظارہ تھا۔ دنیا کی ہر خوبصورتی سے زیادہ خوبصورت! اس کے جمال کا ایک ذرہ ستر ہزار پردوں سے گزر کر اتنا حسین تھا۔

مجھ جیسی ادنیٰ بندی پر اتنا کرم، اتنا فضل! اللہ نے میری توبہ قبول کرکے مجھے دُعاؤں کو قبول کرنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ واقعی وہ مالک دلوں کا حال جاننے والا ہے اور ہدایت چاہنے والوں کو ہدایت بخشتا ہے۔

میری کہانی پڑھ کر کسی اور کو اگر راہِ ہدایت ملتی ہے تو میں سمجھوں گی کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہوگیا ہے اور جب اللہ راضی ہوجائے تو بندے کو کسی اور چیز کی خواہش باقی نہیں رہتی۔

.....☆☆.....

خود غرض محبت

ندا

کیوں ڈھونڈتے ہو ترک تعلق کے بہانے
کاندھوں پہ خود یہ بار اٹھانے لگی ہوں میں

میرا نام نادیہ ہے۔ میں آپ لوگوں سے اپنی زندگی کے کچھ لمحات شیئر کرنا چاہتی ہوں جن کو میں آج تک بھلا نہیں سکی ہوں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ایک مقامی کالج میں پری میڈیکل کی طالبہ تھی۔ اُس وقت میری عمر سترہ برس تھی۔ اُس وقت میں ایک مشہور پروفیسر کے پاس ٹیوشن پڑھنے جاتی تھی۔ وہ ٹیوشن سینٹر میرے گھر سے خاصی دور تھا' تاہم میں پیدل ہی چلی جایا کرتی تھی۔ سینٹر میں میرے گروپ میں کئی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ اُن میں سے ایک لڑکا عمران بھی تھا' وہ بہت ذہین اور اسمارٹ تھا مگر کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا جس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ وہ چھٹی کے بعد تمام راستے میرے پیچھے پیچھے چلتا' جب میں اپنے گھر میں داخل ہوتی تو وہ واپس چلا جاتا۔ اُس کی اس حرکت سے میری جان نکل جاتی تھی۔ ایک دن اُس نے راستے میں موقع دیکھ کر مجھے اپنا سیل نمبر دیا۔ میں نے اس وجہ سے لے لیا کہ میں سب کے سامنے تو اُس کو کچھ بول نہیں سکتی' کیوں نا' فون پر ہی اسے ذلیل کیا جائے۔ جب میں نے اپنا غصہ اتارنے کے لیے فون کیا تو بات ہی دوسری نکلی۔

عمران بولا۔ ''آپ اکیلے اتنی دور پیدل اپنے گھر جاتی ہیں اور آپ کی طرف سناٹا ہوتا ہے اس لیے میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔''

''مگر آپ میری اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟ آپ کی اس حرکت سے میں بدنام ہو جاؤں گی۔''

''دراصل میں آپ کو پسند کرتا ہوں' آپ کی فکر ہے مجھے' میں کیا کروں' دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

عمران نے بے دھڑک اتنی بڑی بات کہہ دی تھی اور میں گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں نے فون رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

پھر کئی دن تک وہ میرے پیچھے نہیں آیا تو میں بے چین ہو گئی۔ پتا نہیں' عمران کی باتوں کا اثر تھا یا اُس وقت میری عمر ہی ایسی تھی کہ چاہے جانے کی تمنا شدت سے جاگتی ہے۔ میری بے چینی روز بہ روز بڑھتی گئی۔ میرے احساسات عجیب سے تھے۔ پتا نہیں' مجھے کیا ہو گیا تھا' شاید میں بھی اُسے پسند کرنے لگی تھی اور پھر اس بے قراری کے باعث میں نے اسے فون کر لیا' بس پھر کیا تھا' باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ہم روز مخصوص وقت میں باتیں کرتے۔ عمران باتوں کے فن میں ماہر تھا۔ میں اس کی باتوں کے سحر میں کھو جاتی اور ایک نئے جہان میں چلی جاتی۔ دن گزرتے گئے اور ہم نے انٹر کا امتحان دے دیا۔ جب میں امتحان کے رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک روز امی نے کہا۔

''بیٹا......! آج کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں' ذرا تیار رہنا۔'' میں حیرت سے امی کو دیکھنے لگی جیسے انہوں نے خلاف توقع بات کر دی ہو۔

''مگر امی......! میری پڑھائی کا کیا ہوگا؟ ابھی تو صرف انٹر ہی کیا ہے؟'' میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''بیٹا......! ہم اُن ماں باپ میں سے نہیں ہیں جو اپنی لڑکیوں کو پڑھائی کے چکر میں بوڑھا کر دیتے ہیں۔ پڑھائی بعد میں بھی ہو سکتی ہے مگر اچھا رشتہ بار بار نہیں آتا۔'' امی کی بات پر میں کیا بولتی' خاموش ہو گئی۔

شام کو مہمان آ گئے۔ لڑکا بھی اپنے ماں باپ

اور بہن کے ساتھ آیا تھا۔ امی نے مجھے اشارے سے چائے لانے کے لیے کہا۔ میں چائے اور کچھ کھانے کا سامان اُن مہمانوں کے سامنے لے گئی۔ سب نے میری چائے کی تعریف بھی کی مگر میں زیادہ دیر نہ بیٹھی' اٹھ کر آ گئی۔ کمرے میں آ کر عمران کو فون ملایا اور ساری صورتِ حال اس کو بتادی۔

اس نے کہا۔ ''ہمیں کہیں بیٹھ کر باتیں کرنی چاہئیں۔ اس طرح فون پر بات کرنا مناسب نہیں۔'' بات ٹھیک تھی۔ اگلے رُوز مجھے پتا چلا کہ اُن لوگوں نے مجھے پسند کرلیا ہے اور میرے والدین کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ مجھے عمران سے فوراً ملنا پڑا۔ ہم دونوں ایک مقامی پارک میں ملے۔ میں تو بس روئے جارہی تھی' کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا' کیا کروں؟

عمران بولا۔ ''دیکھو نادیہ' مجھے ابھی ڈاکٹر بننا ہے' پڑھائی کرنی ہے' میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں' میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر خالی پیٹ تو محبت بھی اچھی نہیں لگتی۔ تمہارے گھر والے تمہاری شادی مجھ سے کبھی نہیں کریں گے۔ کون سے ماں باپ ہوں گے جو لڑکے کے ڈاکٹر بننے کا انتظار کریں گے اور پھر میں مزید پڑھائی کے لیے باہر جاؤں گا۔ کیا انتظار کرو گی؟ اور اچانک بھاگ کر شادی کرنے کے میں خلاف ہوں لہٰذا تمہارے ماں باپ جو کہہ رہے ہیں' مان جاؤ' ویسے بھی محبت ایسی شے ہوتی ہے کہ ملاپ شاید اس کی تقدیر میں نہیں ہوتا۔''

عمران ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' تب میں نے حالات سے مجبور ہو کر عمران کو آخری سلام کیا اور اپنے ماں باپ کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا۔ میری رخصتی بڑی دھوم دھام سے ہوئی کیونکہ میں والدین کی اکلوتی اولاد تھی' اس وجہ سے دونوں باپ نے اپنے ارمان پورے کیے۔ دوسری طر میرے شوہر شہباز بھی اپنے والدین کے اکلو بیٹے تھے لہٰذا دونوں گھرانوں نے اس شادی پر خوب ارمان نکالے۔ یوں میری نئی زندگی کا آ ہوگیا۔ شہباز بہت خیال رکھنے والے شوہر تھے۔ کی فیملی بھی بہت اچھی تھی۔ ابھی میری شادی مہینے ہی ہوئے تھے کہ میں نے آگے پڑھنے فرمائش کر ڈالی۔ میری خواہش پر میرے سسرا والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ شہباز تو میر فیصلے سے بہت خوش ہوئے۔ وہ کشادہ ذہن کے مالک تھے۔ اس طرح میں نے بی ایس سی کے لیے ایک مشہور کالج میں داخلہ لے لیا۔ شہباز نے میر داخلے کے لیے بہت تگ ودو کی تھی' یہاں تک کہ جب کلاسز شروع ہوئیں تو وہ مجھے خود کالج چھوڑ اور لینے بھی آتے لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا میرے لیے وہ اتنی تکلیف اٹھائیں۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا۔

''آپ کو اپنا کاروبار بھی دیکھنا ہوتا ہے' آپ میرے لیے اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ اسی محلے کی ایک لڑکی بھی کالج جاتی ہے' کیوں نا' میں اس کے ساتھ آیا جایا کروں؟ آپ فکر مت کریں۔'' شہباز مان گئے۔ اس طرح میں مذکورہ لڑکی کے ساتھ روز کالج آنے جانے لگی۔ ایک سال گزر گیا۔ ایک روز اچانک میرے سیل فون پر عمران کا نمبر چمکنے لگا۔ میں پریشان ہوگئی کہ عمران نے مجھے کیوں کال کی ہے؟ ہم نے تو کبھی نہ بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا پھر اب عمران اپنا وعدہ کیوں توڑ رہا ہے؟ میں نے

فون اٹھالیا۔

''کیا ہوا عمران' فون کیوں کیا' خیریت تو ہے نا؟''

''تمہاری بہت یاد آرہی تھی' مجھ سے رہا نہ گیا تو فون کرلیا۔ تمہاری آواز سن کر دل خوش ہوگیا۔'' عمران نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔

''عمران' میری شادی ہوچکی ہے۔ اب اس طرح فون پر بات کرنا مناسب نہیں۔''

''میں جانتا ہوں مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں' کیا کروں' تمہاری آواز سننے کے لیے ترس گیا تھا' کوئی لمحہ ایسا نہ گزرا جب تمہیں یاد نہ کیا ہو۔'' اس کی آواز رندھی ہوئی تھی جیسے رو پڑے گا۔

''اچھا' میں فون رکھتی ہوں' کوئی آرہا ہے۔'' میں نے فون بند کردیا۔ اُسی وقت شہباز کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

میرے کئی دن اسی سوچ میں گزر گئے کہ عمران نے مجھے ایک سال کے بعد فون کیوں کیا؟ ایک ہفتے کے بعد عمران نے دوبارہ فون کیا۔ اس بار اس نے مجھ سے ملنے کو کہا۔ میں نے پہلے تو انکار کیا مگر اس کے اصرار پر راضی ہوگئی۔ اُس روز کالج کے اوقات میں ایک ریسٹورنٹ میں ہماری ملاقات ہوئی۔ میں عمران سے ملنے تو آ گئی تھی مگر میرا کلیجہ منہ کو آرہا تھا کیونکہ اب میں شادی شدہ تھی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو غضب ہوجاتا۔ دل بہت گھبرا رہا تھا مگر جانے عمران کو باتوں میں ایسا کیا تھا کہ میں اس سے ملنے چلی آئی تھی۔

''نادیہ' میں جانتا ہوں کہ اب تمہاری شادی ہوگئی ہے لیکن ایک سچ یہ بھی ہے کہ میں تمہیں بھلا نہ سکا۔ تم میری نظر سے دور سہی لیکن دل سے قریب ہو۔ پتا نہیں' میں اتنا خودغرض کیسے ہوگیا تھا؟ میں نے صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچا اور تمہاری محبت کو نظر انداز کردیا تھا جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ میرے والد کو اچانک دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ انتقال کر گئے۔ ہمارے مالی حالات خراب ہوگئے۔ میں ٹیوشن پڑھا کر اپنا تعلیمی سلسلہ جاری تو رکھا ہوا ہوں مگر ڈاکٹر بننے کا خواب ٹوٹ گیا جس وجہ سے تمہیں شادی کرنے کو کہا' وہ وجہ ہی ختم ہوگئی۔ میں اندر سے ٹوٹ گیا ہوں مگر تمہاری یاد دل میں بسی ہوئی ہے۔ نادیہ' تم نے میرے کہنے پر ہی تو شادی کی تھی۔ پلیز' میری خاطر واپس آجاؤ۔ وہ بندھن کس کام کا جو زبردستی کا ہو اور تمہارا یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ تم آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔'' میں عمران کی باتیں سنتی رہی' تاہم بولی کچھ نہیں۔ اس کی باتوں

مسافر

مسافر کو مسافر اک نہایت کم مسافت میں
ملا تو یوں لگا جیسے
خدا نے حسن کی ساری
کہانی اس پہ لکھی ہے
میں بتلاؤں تمہیں کیسے
میں دکھلاؤں تمہیں کیسے
نہیں ممکن مرے لفظوں
میں کھینچوں اُس کی تصویریں
بس اتنا یاد رکھو تم
میں اتنا یاد رکھتا ہوں
بڑے دلچسپ چہرے پر بڑی دلچسپ
آنکھیں تھیں

محمد فیاض۔ شدوخیل

سے مجھے اور گھبراہٹ ہونے لگی تو میں وہاں سے اٹھ گئی۔

''میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔'' اس نے کہا پھر میں گھر آ گئی۔ سارا دن عمران کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ اس بارے میں جتنا سوچتی' اتنا الجھتی۔ میرا سر درد کرنے لگا اور شام تک مجھے بخار چڑھ گیا۔ پورا بدن جلنے لگا۔ شہباز آئے تو وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور دوائیاں لکھیں۔ میں نے دوائی لی اور سو گئی۔ اگلے روز عمران کا فون آیا۔ گھبراتے ہوئے میں نے فون اٹھایا۔

''ہاں نادیہ' تم نے کیا سوچا؟ تم جلد سے جلد طلاق لو اور میرے پاس آ جاؤ.....'' عمران بولا۔

''عمران..... میری طبیعت خراب ہے' بہت تیز بخار ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا مگر عمران میری بات کو نظر انداز کر کے اپنی ہی کہہ رہا تھا۔ اچانک لائن کٹ گئی۔

تین روز تک مجھے بخار چڑھتا اترتا رہا۔ مجھے ملیریا ہو گیا تھا۔ اس دوران شہباز نے میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے خود دوائی دیتے' میرے لیے دودھ لے کر آتے' میری ہر طرح خدمت کی۔ ایک ہفتے میں' میں صحت یاب ہو گئی۔ ایک ہفتے میں مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ شہباز کتنے اچھے شوہر اور بلند اخلاق انسان ہیں۔

دس دن بعد عمران کا پھر فون آیا' اس نے وہی باتیں شروع کر دیں کہ میرے پاس کب آؤ گی؟ میں نے صرف اتنا کہا کہ عمران' میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ عمران خوش ہو گیا اور ہم دونوں نے ملنے کی جگہ طے کر لی۔

اگلے روز عمران اور میں بتول پارک میں عمران مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''عمران..... آج میں بولوں گی اور تم سنو یہ سچ ہے کہ میں نے تمہارے کہنے پر شہباز شادی کی تھی۔ اُس وقت جب میں تم سے شادی چاہتی تھی' تم نے میرا ساتھ نہیں دیا' تمہیں صرف کیریئر عزیز تھا اور اب تمہارے حالات خرا ہو گئے ہیں تو تمہیں میری محبت کی ضرورت ہے عمران' تم ایک خودغرض انسان ہو جو صرف اپ بارے میں سوچتا ہے اور خودغرض انسان کسی محبت نہیں کر سکتا جبکہ تمہارے برعکس میرے شہباز نے میرا خوب خیال رکھا' انہوں نے میری خواہش کو پورا کیا' میری طبیعت خراب ہونے پر جان سے میری خدمت کی۔ تم نے میرے لیے کیا؟ عمران' آج کے بعد مجھے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہوں۔ میری زندگی کے سچے ساتھی ہیں۔

عمران مجھے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس پاس بولنے کو کچھ نہ تھا پھر میں نے عمران کو ہمیشہ لیے اپنے دل و دماغ سے نکال دیا۔

آج میں اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں۔ میری ان تمام نادان اور کچے ذہن کی لڑکیوں سے التجا ہے کہ ان خودغرض لڑکوں کے چکروں میں مت پڑیں آپ کا ذہن اور وقت دونوں برباد کر دیتے ہیں۔ آپ کی قسمت میں قدرت نے جو لکھا ہوتا ہے' وہ آپ کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

.....☆☆.....

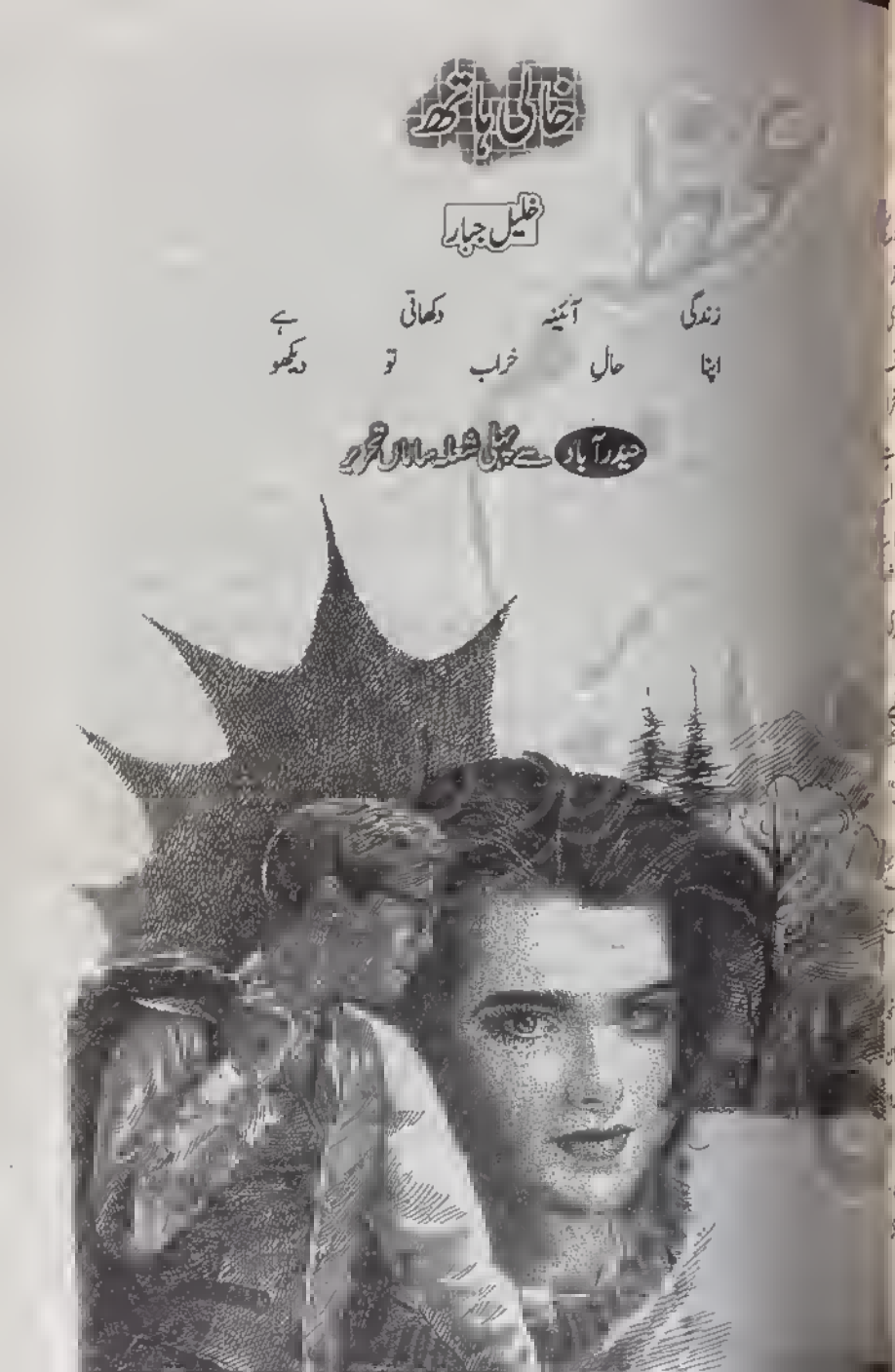

میں کورٹ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ برابر کے کمرے سے زاہد کے شور کرنے کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے کپڑے دو' مجھے کورٹ سے دیر ہو رہی ہے' جلدی کرو' کلائنٹ میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''صاحب' گھر پر آرام کریں۔ آج بہت گرمی ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے۔'' میرے ملازم انور کی آواز سنائی دی۔

''نہیں' روز تم یہی کہتے ہو کہ آج گرمی ہے۔ میں آج ضرور کورٹ جاؤں گا۔ آج گرمی ہے تو پھر ابا جان کورٹ کیوں جا رہے ہیں؟ جب وہ کورٹ جائیں گے تو میں بھی کورٹ جاؤں گا۔'' زاہد نے کہا۔

''زاہد' ضد نہیں کرو' اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔'' میں نے زور سے کہا۔

''ابا جان! میں اب بچہ نہیں ہوں' بڑا ہو گیا ہوں۔ میرے سارے دوست کام پر جاتے ہیں' میں بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔'' زاہد نے میری آواز کا جواب دیا۔

''تم کام کیا کرو گے' کینٹین میں جا کر میرے وکیل دوستوں سے سگریٹ مانگ کر دھواں پھونکو گے؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''سارے وکیل سگریٹ پیتے ہیں' چائے پیتے ہیں' میرے ایسا کرنے سے کیا بگڑ جائے گا؟'' زاہد میرے کمرے میں آ گیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

''نہیں' تم گھر پر آرام کرو گے' تمہیں کورٹ لے جا کر میں اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

''میں آج ضرور کورٹ جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے زاہد نے گھر کا سامان پھینکنا شروع کر دیا۔

زاہد کی کوئی خواہش جب پوری نہیں ہوتی تھی' وہ سامان پھینکنا شروع کر دیتا تھا اور اپنی خواہش پوری کروا کر دم لیتا تھا۔

''اچھا' ٹھیک ہے' تم تیار ہو جاؤ' ہم ساتھ چلتے ہیں۔'' زاہد بچوں کی طرح خوش ہو گیا اور تیار ہو کر مجھ سے پہلے ہی گاڑی میں جا بیٹھا۔ جب بھی میں زاہد کو دیکھتا ہوں' میرے ماضی کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ضرور تھا لیکن وہ میرے لیے ناسور بن گیا تھا جس کو کاٹ کر پھینکنا چاہوں تو نہیں پھینک سکتا۔ اس کی ماں کو بیٹے کا صدمہ بیٹھا تھا اور اس کے صدمے میں مسلسل بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ زاہد میرے اپنے کیے کی سزا تھی' انسان جو کرتا ہے' وہ اس کے آگے آ جاتا ہے۔

•......•......•......•

وکالت کا پیشہ بہت معزز پیشہ ہے لیکن اس پیشے میں وہی وکیل کامیاب ہو سکتا ہے جو صبر و برداشت سے کام لے۔ ابتدائی تکالیف خوشی خوشی برداشت کرے۔ میں نے جب وکالت کی دنیا میں قدم رکھا' اس وقت اپنے وقت کے کامیاب ترین سینئر وکلا کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگ بھی ذہانت کی بجائے سفید بالوں کو کامیاب وکیل سمجھتے ہیں اور انہیں کے پاس جانا پسند کرتے ہیں۔

ایک سے بڑھ کر ایک قابل وکیل کو دیکھ کر مجھے وکالت میں قدم جمانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ کئی ماہ مسلسل بیکاری میں گزرے۔ کوئی کام نہیں ملتا تھا' میں دوستوں کا اچھا خاصا مقروض ہو گیا تھا۔ میں اُس دن کو کوستا تھا جب میں نے وکالت کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

میرا کوئی دوست ڈاکٹر' کوئی انجینئر اور کوئی سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ ایک میں ہی تھا جو ڈگری ہونے کے باوجود ہزاروں دوسرے بے روزگار نوجوانوں کی طرح جوتے چٹخاتا پھر رہا تھا' روز گھر سے تیار ہو کر نکلتا' شام گئے جب تھک ہار کر لوٹتا تو جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی تھی۔

ایک روز صبح کے وقت میں رکشا میں کورٹ جا رہا تھا۔ میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ابتدائی سختیاں جھیلنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج مجھے کوئی کام نہ ملا تو میں ہمیشہ کے لیے وکالت کو چھوڑ کر محنت مزدوری شروع کر دوں گا' چاہے لوگ کچھ بھی کہیں' میں وکالت نہیں کروں گا۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا۔ میں رکشا سے اتر کر جانے لگا تو رکشا ڈرائیور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''صاحب! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟'' وہ ایک باریش آدمی تھا اور شکل سے نمازی' پرہیزگار اور متقی لگ رہا تھا۔

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں' ہاں' بولیں۔'' میں سمجھا کہ شاید وہ مجھے کوئی مقدمہ دینا چاہتا ہے یا کسی مقدمے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔

''صاحب! آپ نے ابھی ابھی جو فیصلہ کیا ہے' وہ درست نہیں۔ پہلے جو فیصلہ کیا تھا' وہ درست تھا۔ دکھ تکلیف آتی رہتی ہیں' انسان کا کام ہے ان سختیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور اپنی زندگی میں جان بوجھ کر کسی کو دکھ تکلیف نہ دے۔ آپ بھی کبھی کسی کو دکھ مت پہنچانا۔ صاحب' آپ بہت ترقی کریں گے۔ یہ بات لکھ کر رکھ لیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے رکشا آگے بڑھا دیا اور چشم زدن میں ٹریفک میں گم ہو گیا۔

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے میرا ذہن کیسے پڑھ لیا؟

پھر میں نے اُس رکشا ڈرائیور کو بہت تلاش کیا لیکن وہ مجھے نہ مل سکا لیکن اُس کی کہی ہوئی بات میرے دل کو لگ گئی۔

میں ایک دن کورٹ پہنچا تو وہاں اپنے ایک دوست کو منتظر پایا۔ وہ کوئی مقدمہ لے کر آیا تھا۔ پہلی بار کسی مقدمے کی بھاری فیس ملنے پر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ وہ مقدمہ بڑا دلچسپ تھا۔ میاں بیوی کے جھگڑے کا تھا۔ شوہر' بیوی سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن بیوی طلاق لینے کو تیار نہ تھی۔ شوہر کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ اس نے جذبات میں آ کر حق مہر دو لاکھ روپے لکھ دیے تھے۔ وہ خود طلاق دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے پریشان کر رہا تھا کہ بیوی اس کے ظلم و ستم سے تنگ ہو کر خلع کی درخواست دے دے تا کہ وہ حق مہر دینے سے بچ جائے۔ اس مقدمے میں میرے استاد وکیل نے بڑی مدد کی۔ ہم نے فریقین میں صلح کرا دی۔ اس مقدمے سے مجھے حوصلہ ملا اور میں مختلف مقدمات سے متعلق کتابوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھنے لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مقدمات کا جائزہ لینے کے بعد مجھے بہت سے ایسے مقدمات پڑھنے کا موقع ملا جو کورٹ میں میرے بہت کام آئے۔

میرے استاد میری کامیابی سے بہت خوش تھے اور وہ مستقبل میں مجھے کامیاب وکیل دیکھ رہے تھے۔ انہیں پوری توقع تھی کہ میں وکالت میں بہت نام پیدا کروں گا۔

انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کے پاس دولت آ جائے اور اس کا کام چل نکلے تو وہ سمجھتا ہے

کہ سب کچھ اس کی محنت سے ہوا ہے اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا جو دل میں آتا ہے وہ کرتا ہے۔

یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا' میں دولت آنے پر خودسر اور ضدی ہوگیا تھا۔

ایک بیوہ کا مقدمہ میرے پاس آیا۔ اس کا شوہر بے شمار جائیداد اپنے پیچھے چھوڑ کر مرا تھا لیکن اس کے دیوروں نے ہوشیاری سے جعلی طلاق نامہ تیار کرالیا تھا۔ اس کے دونوں جوان بیٹوں کو انہوں نے پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں داخل کرادیا۔ وہ کروڑوں کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے پیسا پانی کی طرح بہارہے تھے۔ جب میرے پاس یہ مقدمہ آیا' میں نے ایسے دلائل دیے کہ وہ فریقین بوکھلا گئے اور انہیں اپنی محنت رائیگاں جاتی نظر آئی۔ وہ مجھے خریدنے کے لیے میرے آفس پہنچ گئے۔

میں انہیں آفس میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ سمجھ گئے' مجھے ان کا آفس میں آنا پسند نہیں آیا ہے لیکن وہ ڈھیٹ تھے' مجھے اس بات کے لیے قائل کرنے لگے کہ میں انہیں اپنی مصروفیات میں سے ایک گھنٹا دے دوں۔

میں نے یہ سوچ کر ان سے بات کرلی کہ کورٹ میں یہ مقدمہ برسوں چلے گا۔ ان فریقین میں سے کسی بات پر اتفاق ہوجاتا ہے تو اچھا ہے۔ بیوہ کو فائدہ پہنچ جائے گا اور وہ کورٹ کے چکر کاٹنے سے بچ جائے گی۔

''سر آپ کو اس مقدمے کی کتنی فیس ملی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میری فیس سے آپ کو کیا غرض؟'' میں نے کہا۔ ''آپ اصل بات کریں کہ یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''ہماری اطلاع کے مطابق آپ کو یہ مقدمہ لڑنے کے ایک لاکھ روپے ملے ہیں لیکن ہم آپ کو ایک' دو نہیں' پورے پچاس لاکھ روپے دینا چاہتے ہیں۔'' ان دنوں پچاس لاکھ روپے کی ایک حیثیت تھی۔

''پچاس لاکھ روپے.....'' میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں ساری زندگی مقدمات لڑ کر بھی اتنی رقم جمع نہیں کرسکتا تھا۔

''ہاں' پچاس لاکھ روپے۔ آپ کو اپنا پسندیدہ بنگلا خریدنے کو پچاس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ وہ رقم ہم ادا کرسکتے ہیں۔'' اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

یہ حقیقت تھی کہ مجھے ایک بنگلے کی ضرورت تھی تاکہ عزیز واقارب پر میرا رعب ودبدبہ ہو۔ ایک بنگلہ مجھے پسند بھی آگیا تھا جس کی قیمت اس وقت پچاس لاکھ روپے تھی۔

وہ میرے بارے میں پوری معلومات کرکے آئے تھے۔ میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ ان کی اچھی پیشکش ہے۔ اس آفر کو قبول کرلیا جائے لیکن پھر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ اپنے پیشے سے بددیانتی ہوگی۔ میرا چہرہ خوشی سے چمکتا دمکتا اور پھر بجھتا ہوا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان کا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ''آپ مقدمہ واپس نہیں کریں بلکہ لڑیں تو ہماری یہی خواہش ہے۔''

''میں نے اس مقدمے کی پیروی کی تو تم مقدمہ ہار جاؤ گے۔''

''آپ کو مقدمہ لڑنا نہیں ہے' صرف خانہ پری کرنا ہے۔ باقی معاملات ہمارا وکیل سنبھال لے گا۔''

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔'' ان کی آفر نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

میں اپنے پیشے سے غداری نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے جس بنگلے میں رہنے کا خواب دیکھا تھا' وہ پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔

''آپ اچھی طرح سے سوچ لیں' ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

ان کے جانے کے بعد میرے دل و ذہن میں ایک جنگ سی چھڑ گئی کہ ہاں کروں یا نہ کروں؟ پھر لالچ مجھ پر غالب آگیا اور یہ سوچ کر میں نے ضمیر کی آواز کو دبا دیا کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ایک آدھ بار بے ایمانی کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں وہ مقدمہ ہار گیا۔ اُس بیوہ کو مجھ سے بڑی آس تھی' وہ ٹوٹ گئی۔ اس کے پاس جو کچھ بھی جمع پونجی تھی' وہ اس مقدمے پر لگ گئی تھی۔ ہائی کورٹ میں جانے کے لیے اُس کے پاس بھاری فیس اور خرچہ نہیں تھا اس لیے اس کے دیور بہت خوش تھے اور وہ بہت رنجیدہ!

آخری بار جب وہ مجھے ملی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''وکیل صاحب' آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرا مقدمہ بڑی محنت سے لڑا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ بک گئے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ اتنا بااصول اور دیانت دار شخص اپنے پیشے سے غداری کیسے کرسکتا ہے؟''

''آپ ان کے خلاف ہائی کورٹ میں چلی جائیں' آپ کے دیور ہار جائیں گے۔''

''میرا تو سب کچھ لٹ گیا ہے۔ دولت بھی گئی' جوان لڑکے پاگل خانے میں قید کردیے گئے ہیں۔ میرے پاس اب کچھ نہیں بچا۔ میں خالی ہاتھ ہوں' ان خالی ہاتھوں سے اپنے دیوروں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کیے اور سسکیاں بھرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میں نے پیسے کے لالچ میں اپنے پیشے سے غداری کردی' اس کا مجھے اس وقت بڑا دکھ ہورہا تھا۔ احساسِ جرم سے میں اپنی ہی نظروں سے گرگیا تھا۔ اُس بیوہ کی سسکیاں محسوس کرکے میں آج بھی کانپ اٹھتا ہوں۔ اُس کی آواز میں گہرا درد تھا۔

میں اپنے شاندار بنگلے میں منتقل ہوگیا۔ رشتے دار مجھے رشک بھری نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس دوران میں ایک اچھے گھرانے کی لڑکی سے میری شادی بھی

کچھ یادیں اس کی باقی تھیں

کچھ یادیں سچے وعدوں کی
کچھ اپنوں' کچھ بیگانوں کی
کچھ وہ بھی روٹھا روٹھا تھا
میری آنکھوں میں بھی پانی تھا
کچھ یادیں اس کی باقی تھیں
کس بات پہ وہ ناراض ہوا
وہ بات بھی اب تو یاد نہیں
دل کانچ کا تھا' سو ٹوٹ گیا
کچھ باتیں ہیں افسانوں کی
سب اپنوں کی' بیگانوں کی
کس بات پر بچھڑا' یاد نہیں
آنکھوں سے رکی برسات نہیں
سب وعدے اس کے بھول گئے
وہ سچے تھے یا جھوٹے تھے
ہر لمحہ آنکھیں روتی ہیں
یہ جاگتی ہیں نہ سوتی ہیں
فریاد یہی بس کرتی ہیں
کہ لوٹ کے اب وہ آجائے

غزالہ جلیل راؤ۔ اوکاڑہ

ہوگئی۔

شادی کے ایک سال بعد زاہد پیدا ہوا۔اس کی کلکاریاں گھر میں گونجتی اچھی لگتی تھیں۔زاہد کے پیدا ہونے سے ہمارے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں آ گئی تھیں۔

میں کورٹ سے تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو زاہد کو بانہوں میں لے کر کھلاتا جس سے میری ساری تھکن دور ہو جاتی تھی۔زاہد جب کچھ بڑا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ نارمل بچوں کی طرح نہیں ہے۔اس کی عمر پانچ سال تھی اور ذہن کسی دو سالہ بچے کا تھا۔پڑھنے لکھنے میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔یہ خاصی تشویش ناک بات تھی۔

زاہد کے بعد ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔میں نے جب اس کا میڈیکل ٹیسٹ کرایا تو مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔میڈیکل رپورٹ کے مطابق زاہد واقعی نارمل نہیں تھا۔اس کی ذہنی نشوونما برائے نام تھی۔اس انکشاف نے میری نیندیں اڑا کر رکھ دیں۔اس وقت بے اختیار میرے کانوں میں اُس بیوہ کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔اُس بیوہ کا دل دکھانے اور اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی مجھے سزا ملی تھی۔

مجھے روز کورٹ جاتا دیکھ کر زاہد کے دل میں بھی خواہش مچلتی تھی' وہ بھی میری طرح تیار ہو کر کورٹ جائے۔میں نے زاہد کا دل رکھنے کو اُسے وکیلوں والا کوٹ اور ٹائی وغیرہ لے دی تھی۔کپڑے پہن کر اس نے خود کو وکیل سمجھنا شروع کر دیا اور میرے ساتھ کورٹ جانا شروع کر دیا۔میرا خیال تھا کہ چند دن کورٹ جا کر وہ وہاں جانا چھوڑ دے گا۔

میں مختلف مقدمات کے سلسلے میں مختلف عدالتوں میں جاتے وقت زاہد کو کینٹین میں چھوڑ کر چلا جاتا۔میرے عدالت میں جانے پر وہ بھی کسی عدالت میں جا کر بیٹھ جاتا ہے کہ جیسے وہ کسی مقدمے کی پیروی کرنے آیا ہو یا کینٹین میں بیٹھا چائے پیتا رہتا۔

جب پیسے ختم ہو جاتے ہیں تو میرے دوست وکلاء سے چائے' سگریٹ مانگتا ہے۔

میرے دوست اسے جانتے ہیں اس لیے سگریٹ اور چائے پلا دیتے ہیں لیکن لوگوں کے ذریعے مجھے پتا چل ہی جاتا ہے کہ آج کس کس سے زاہد نے چائے اور سگریٹ پی ہے۔

یہ سن کر مجھے غصہ بہت آتا ہے لیکن زاہد کی ذہنی کیفیت دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔دوستوں کو میں منع بھی کرتا ہوں کہ وہ زاہد کی عادت خراب نہ کریں اور وہ وعدہ بھی کر لیتے ہیں کہ ایسا نہیں کریں گے لیکن وہ ان کی اتنی منت کرتا ہے کہ وہ مجبوراً چائے اور سگریٹ پلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔وکالت کے پیشے میں بہت دولت کمانے کے باوجود میں خالی ہاتھ ہوں' میرے مرنے کے بعد میری دولت زاہد زیادہ عرصے سنبھال نہیں سکے گا کیونکہ کہتے ہیں کہ خرچ کرتے رہنے سے قارون کا خزانہ بھی خرچ ہو جاتا ہے..... میں جو زاہد کے لیے رقم چھوڑ کر جاؤں گا' وہ تو قارون کے خزانے کے آگے کچھ بھی نہیں۔ رقم ختم ہو جانے پر زاہد کا کیا بنے گا' کوئی نہیں جانتا۔

کبھی کبھی مجھے اُس رکشا ڈرائیور کا خیال آ جاتا ہے اور میں بے اختیار اپنے آپ پر افسوس کرنے لگتا ہوں کہ میں نے اُس رکشا ڈرائیور کی بات پر پوری طرح عمل کیوں نہیں کیا؟ اگر میں اُس کی بات پر عمل کر لیتا تو آج میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خالی ہاتھ تو نہ ہوتا اور یہ اذیت ناک سزا مجھے کبھی نہ بھگتنا پڑتی۔

.....☆☆.....

سوال کرتا ہے

بشریٰ اکرام

ہو دل کی بات تو دلِ فسردہ کیا کہے
زندہ حقیقتوں پہ کوئی مردہ کیا کہے

بہاولپور سے دوسری شعلہ ساماں تحریر

کیا کچھ لمحوں کے لیے میرا وجود ہوا میں تحلیل ہو سکتا ہے۔ میں فرار چاہتی ہوں ان پریشان کن سوچوں سے.....

کیا کچھ لمحوں کے لیے میرا وجود بربط کے غمگین سروں کو اوڑھ سکتا ہے۔ بھربھری ریت بن سکتا ہے جو کہ کسی کی بھی گرفت میں نہ آئے.....

یا پھر کیا کچھ لمحوں کے لیے میں بہتے جھرنے کا پانی بن سکتی ہوں جس کی ایک بوند گرتے ہی دوسری بوند سے اس طرح جدا ہو جائے کہ پھر کبھی نہ مل سکے.....

کیا میں ایسا سناٹا بن سکتی ہوں جس سے ہر شخص دور بھاگے۔

کاش کہیں ایک ایسی بوتل ہوتی جس میں میں بند ہو سکتی۔ نہ کوئی میری آواز سن سکتا اور نہ ہی میں کسی کی' پھر میں چیخی' اتنی زور سے چیخی کہ میرے اپنے ہی کان اس چیخ کو سہار نہ پاتے اور باہر سے آنے والی آوازوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے نجات مل جاتی مگر اندر کی آوازیں.....ان کا گلا میں کیسے گھونٹوں..... یا اللہ! میری مدد فرما۔ نفرت ہو رہی ہے مجھے اپنے ہی وجود سے' میں کیا کروں' مجھے کیوں لگتا ہے کہ اگر میں چاہتی تو اسے بچا سکتی تھی۔ کیا اس کے اس طرح مرنے میں میرا ہاتھ بھی ہے؟ اسے موت کی اندھیری کھائی میں دھکا دینے والا آخری ہاتھ کہیں میرا تو نہیں؟ کیا میں اسے روک سکتی تھی؟

کیسے نبرد آزما ہوں میں اس تمام حسیات منجمد کر دینے والے احساس جرم سے؟ کیسے.....

☆.....☆

ہم دونوں میں بہت محبت تھی۔ وہ میرا بہترین اور اکلوتا دوست تھا۔ اس کی رفاقت میں مجھے کبھی کسی سے دوستی کا خیال تک چھو کے نہیں گزرا۔ ہاں' مگر اب سوچتی ہوں کہ کاش میری بھی کوئی ہوتی جس کے سامنے میں اپنی کچھ گھٹن دور کر پاتی۔ مجھے اب کتھارسس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بے رحم یادیں ہر دم میرے اندر تلاطم سا برپا رکھتی ہیں۔

علی اور میرا بچپن ساتھ گزرا۔ کسی ہمجولی کی طرح میں اپنی ساری باتیں اس سے کرنے کی کب عادی بن گئی' پتہ ہی نہ چلا۔ وہ بھی جب تک سارے دن کا کھا مجھے نہ سناڈالتا' اسے چین نہیں پڑتا۔ ہم دونوں جڑواں تھے۔ تھی تو میں اس سے چند لمحے ہی بڑی مگر اس بڑے پن کا فائدہ میں نے ہمیشہ اٹھایا۔

اکثر وہ چڑ کے کہتا۔ ''افشین' تم بہت بری ہو۔'' اور میں ہنس دیا کرتی۔

ان دنوں ہنسنے کے لیے ویسے بھی ہم بہانے ڈھونڈا کرتے۔ زندگی اتنی حبس زدہ تھی کہ اگر کبھی سے بھی' ہمیں کوئی روزن کھلا ملتا تو وہاں سے آتی ہوا آکسیجن سے ہی ہم ہنسی شیئر کرنے کی کوششوں میں اپنی پوریں زخمی کر بیٹھتے اور پھر ان سے اٹھتی ٹیس ہمیں ملال کی کھائیوں میں لا پھینکتی تھی۔

دیکھنے میں تقریباً ایک جیسے ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری حرکتوں میں بھی خاصی مماثلت پائی جاتی۔ وہ روٹھتا تو میں بے چین رہتی اور میں روٹھتی تو چین اس سے بھی ہاتھ چھڑا کے کسی ضدی بچے کی طرح دور کھڑا ہوتا۔ علی اس وقت تک منہ بسورتا جب تک ہم دونوں مل کے ساتھ ہنس نہ لیتے۔ وہ میرا کل کائنات تھا۔

اس بوسیدہ سے مکان کے ہم چار ہی آسیب زدہ سے مکین تھے۔ میں' علی' امی اور ابو۔ یہاں کے پھپھوند لگے ماحول کے ہم اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ عید تہوار کو بھی اگر کہیں باہر جاتے تو حیرت سے ایک ایک چہرہ تکا کرتے۔ باہر جانے کا تصور خاصا تکلیف دہ ہوتا تھا کیونکہ باہر نجانے کیسی دنیا تھی۔

وہاں لوگ ملتے تو ایک اطمینان ان کے چہروں پر ہوتا۔ اطمینان..... ہم جیسے ابنارمل رویوں میں پلنے والے بچوں کے لیے یہ لفظ اطمینان خاصا اجنبی ہوتا ہے۔ سو اس اجنبی ماحول میں چند لمحے گزارنے کے تصور سے بھی ہم خاصے نالاں رہتے۔

☆.....☆

میں نے آج سے پچیس سال پہلے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد جو ماحول دیکھا' اس میں سب سے تکلیف دہ میری ماں تھی۔ ایک پڑھی لکھی جاہل عورت' جو اپنے برابر میں بیٹھے شخص سے بھی اتنا چیخ کے بات کرتی گویا وہ کوسوں دور کھڑا ہو۔ کھانے کو ہونہ ہو' پہننے کو بہت سا ہونا چاہیے۔ شاید وہ پیدا ہی دنیا دکھاوا کرنے کو ہوئی تھی۔ ایک سوئی بھی خریدتی تو اسے سارے محلے میں گھمانا اپنے اوپر فرض سمجھتی۔ کھانے کی اس قدر شوقین کہ میں شکر گزار ہوں اللہ کی کہ اس نے انسان پر انسان کا گوشت حلال نہیں کیا ورنہ شاید وہ ہمیں بھی بھنبھوڑ ڈالتی۔ عجیب بے حس عورت تھی۔ میری یادداشت میں ایسا کوئی لمحہ نہیں جب انہوں نے ہم سے کبھی پیار سے بات کی ہو یا گود میں کھلایا ہو' ساری عمر ہم دونوں بہن بھائی نے عجیب سرد مہر اور غیر جانبدار رویہ جھیلا۔ پتا نہیں ہمیں پیدا کرنے کا کشٹ بھی کیوں اٹھایا گیا تھا؟

میں نے اپنے والدین کو کبھی آپس میں پیار و محبت سے بولتے نہیں دیکھا۔ اول تو بلاضرورت وہ آپس میں بات ہی نہیں کرتے تھے۔ میں نے ماں کو ہمیشہ سر سے دوپٹہ لپیٹے کسی نہ کسی بات کا رونا روتے ہی دیکھا نتیجتاً ہر دوسرے دن گھر میں نت نئے تماشے ہوتے' ایک دوسرے پر ایسی ایسی الزام تراشیاں کی جاتیں کہ بے ساختہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینے کو جی چاہتا۔ میری ماں اگر میرے والد کے خاندان کی دھجیاں اڑاتی تو وہ بھی ان کے خاندان کے بخیے ادھیڑتے' وہ وہ باتیں ہوتیں کہ اللہ کی پناہ۔ ایسے میں انہیں کبھی ان معصوم ذہنوں کا خیال تک نہ آتا جو اندھیرے کمرے میں لکڑی کی دیمک زدہ الماری کے ساتھ لگے لرزتی ٹانگوں اور سفید پڑتے ہونٹوں کے ساتھ زاروقطار بے آواز روئے چلے جاتے۔

گزرے اذیت ناک روز و شب کی سوئیاں آج بھی قلب میں جوں کی توں پیوست ہیں۔ ان سے قطرہ قطرہ رستے خون کی کسک اب بھی اکثر دل کے خالی دریچوں میں سرٹکراتی پھرتی ہے۔

غرض سارا بچپن ایسے ہی معرکوں کی نذر ہوا۔ اگر علی نہ ہوتا تو شاید میں پاگل ہو جاتی یا نفسیاتی مریضہ تو ضرور ہی بن جاتی۔ نجانے کیسے بچپن کے بڑے پن کا غرور میرے لڑکپن تک پہنچتے پہنچتے میرے جسم کی نس نس میں سرائیت کر گیا تھا۔ جب اگر کبھی ابا کے منہ سے مغلظات کا طوفان رواں ہوتا تو یہ احساس کہ میں بڑی ہوں' مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ایسے موقعے پر میں کبھی علی کو تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ ہم دونوں بڑے کمرے میں بند ہوتے کیونکہ گھر میں وہی تو قید خانے تھے۔ ہر گزرتے لمحے اس کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہوتا جاتا جیسے کسی نے اس پر سرخ رنگ پھینک دیا ہو۔ میرے ہاتھ کی گرفت میں پھنسا اس کا ہاتھ بار بار اس زور سے جھٹکا کھاتا کہ دل بے ساختہ چاہتا کہ باہر جا کے ان دونوں کے حلق میں کارک ٹھونس دوں۔ دانت پر سختی سے دانت جمائے' آنکھیں کسی نادیدہ شے پر گاڑے اس لمحے مجھے وہ خود سے اتنا دور محسوس ہوتا کہ تسلی کے لیے سوچے سارے الفاظ میرے ذہن

میں اپنی موت آپ ہی مر جاتے۔ میری نگاہیں اس کے منہ سے بہنے والی رال پر جمی رہ جاتیں۔ نجانے کیوں علی میں ابھی کچھ سالوں سے یہ تبدیلی آئی تھی کہ اگر وہ کبھی بہت خوش ہوتا یا پھر غصہ کرتا تو اس کے منہ سے رال بہنے لگتی۔ میں نے اکثر بے تحاشہ ہنستے ہوئے بھی اس کے منہ سے رال بہتے دیکھی تھی۔

☆......☆

خاندان میں کوئی موت ہو یا تقریب ہو ہمارا جانا نہ جانا برابر ہوتا۔ ابا کی شعلہ مزاجی اور اماں کی طراری دیکھتے ہوئے ویسے بھی کوئی ہم سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عید تہوار بھی ہم گھر میں ہی رہتے۔ اماں کی طرف سے ایک ماموں ہی تھے' اکلوتے ماموں' نانا نانی انتقال کر چکے تھے۔ مامی اور ہماری اماں میں بنتی نہیں تھی' سو یہاں سے تو چھٹی ہوئی' رہ گیا ددھیال تو وہاں بھی ان ہی وجوہات کی بناء پر کوئی ہمیں منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ دادا دادی کے زمانے تک تو بہر طور برداشت کیا گیا مگر اب کافی سالوں سے کوئی قابل ذکر تعلق نہیں تھا۔

☆......☆

ان دنوں میں اور علی میٹرک کے پیپرز دے کر فارغ تھے۔ اگرچہ مجھے تعلیم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا' اس کے باوجود میں یہ ضرور چاہتی تھی کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کرے۔ مجھے خوابوں میں وہ ہمیشہ افسر بنا دکھتا۔ میں چاہتی تھی' وہ ایک عام نارمل آدمی کی طرح بہت سا پڑھ لے اور پھر ہم دونوں ایک بڑے سے گھر میں جا بسیں جس میں ایک بڑا سارا باغ ہو اور وہاں ہر روز ڈھیر سارے رنگا رنگ پھول اپنی خوشبو بکھیرتے ہوں' خوش نما' خوشبو دار پھول جن کے ارد گرد اجنبی رنگوں کی تتلیاں ہمہ وقت رقصاں ہوں۔ ہر نئی صبح بہت سارے سنہری رنگ کے پھول اکٹھے کر کے میں ایک گلدستہ ترتیب دوں اور پھر اسے جیسے ہی علی کے سرہانے رکھوں' ان کی مسحور کن خوشبو سے وہ جاگ جائے اور پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم دونوں سامنے سے نظر آتی پہاڑی کی سیر کو نکلیں' ہماری ہم سفر سفید پروں والی بطخیں اور سریلی آواز والی ننھی چڑیاں ہوں...... ایسے ہی نجانے کتنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آج بھی میری آنکھوں میں نوحہ خواں ہیں۔ باہر برستی بارش کو دیکھتے ہی میری آنکھیں بھی بادل بن جاتی ہیں۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ آج کل میرے ننھے منے بھائی میں کچھ تبدیلیاں سی آ رہی ہیں۔ بات بے بات پڑنے والے قہقہے سے زیادہ مجھے اس کے روانی سے جملے ادا کرنے نے حیران کیا تھا۔ اکثر وہ اتنا بے ساختہ بولتا اور پھر بولتا ہی چلا جاتا کہ کتنے ہی جملے بنا اٹکے ادا کر جاتا۔ بچپن میں ہی علی کو ہکلانے کی عادت پڑ گئی تھی جس کو میں لاکھ جتن کر کے بھی چھڑا نہ سکی تھی۔ اب جب اسے روانی سے بولتے دیکھتی تو بے ساختہ دل اس کی کشادہ پیشانی چوم اٹھنے کو چاہتا جہاں ہلکا سا چمکتا نماز کا نشان مجھے چاند سے بھی زیادہ پیارا لگتا۔ وہ بچپن سے ہی نجانے کیسے کب نماز کا پابند ہو گیا تھا' مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

آج کل اس کے ہر دوسرے جملے میں کیتی خود بخود آن موجود ہوتی۔ بات کہیں سے شروع ہو تان ہمیشہ کیتی پر ہی ٹوٹتی۔

کیتی ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ کچھ عرصہ تو میں نے صبر کیا پھر ایک دن تنگ آ کے پوچھ ہی لیا۔

"علی! ایک بات تو بتاؤ' تم آج کل کچھ بدلے بدلے سے کیوں لگتے ہو؟"

"میں...... نہیں...... تو۔" نجانے کیوں وہ گھبرا سا گیا۔ "تم...... تم...... پاگل تو نہیں ہو گئی افشین!" کہہ کر وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

میں دیکھتی رہ گئی یہ علی کو کیا ہوا؟ پھر میرے ذہن میں کئی گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی چلی گئیں اور آپ ہی آپ میرے لب مسکرا اٹھے۔ مستقبل میں کیتی کے بھابی بننے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں' مجھے اپنے خوابوں میں تھوڑی ترمیم ضرور کرنی پڑتی اور ایسا تو میں کر ہی سکتی تھی۔ کیتی کے لیے گنجائش خود بہ خود میرے خوابوں میں نکل آئی تھی۔ ان خوابوں میں' میں اسے علی کے ہمراہ پاتی تو سرشار سی ہو جاتی۔

☆......☆

میری سخت ترین نگرانی میں میٹرک شاندار اور پھر کالج بھی بہترین نمبروں سے پاس کر کے آج کل علی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور خود میں انٹر میں سپلی آنے کی وجہ سے بددل ہو کے تعلیم کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ اماں' ابا کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوا مگر علی مجھ سے زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے خفا ہوا تھا۔ اس کی خفگی دور کرنے کے ایک لاکھ دو ہزار تین سو تہتر نسخے مجھے زبانی یاد تھے۔ سو اس کی خفگی بھی زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔

☆......☆

اماں ابا کے جھگڑے اور بھی شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ وجہ ابا کا زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں گزارنا تھا۔ ان کے آفس میں کوئی نئے باس آئے تھے جو سخت گیر تھے۔ ابا دیر سے جانے اور جلدی آنے کے شوقین تھے' سو ہوا وہی جس کا اندیشہ کافی دنوں سے میرے اندر پل رہا تھا۔ ابا مستقل گھر میں رہتے اور بات بات پر چلاتے یا پھر کونے والی پان کی دکان پر بے مقصد جا بیٹھتے۔ پان چھالیہ کے پہلے بھی شوقین تھے۔ اب ادل جلول دوست بھی بنا لیے تھے۔ اماں کا مزاج آج کل سوا نیزے پر رہتا۔ بات بے بات مجھے روئی کی طرح دھنک ڈالتیں' گالیاں دیتیں' کوسنے دیتیں۔ میں سنتی جاتی۔ خاموشی سے پتی جاتی۔

فائنل پیپرز قریب ہونے کی وجہ سے علی کا زیادہ وقت باہر گزر رہا تھا۔ میرے پرزور اصرار پر یونیورسٹی میں ہی اس نے چند نئے دوست بنا لیے تھے حالانکہ ابھی ان کے ساتھ وہ گھل مل نہیں پاتا تھا مگر خیر' میرے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وہ نارمل لڑکوں کی طرح دوست وغیرہ بنا رہا ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک وہم میرے دل کو بے چین کر رہا تھا کہ علی...... شاید علی دوسرے لڑکوں کی طرح نہیں ہے۔ اس میں اب بھی بہت جھجک تھی۔ عجیب طرح کی شرماہٹ۔ اب بھی گھنٹوں وہ مجھ سے کیتی کے بارے میں بات کرتا مگر ان دنوں میں کچھ الجھ سی رہی تھی۔ ابھی میرے ہاتھ کوئی سرا لگا بھی نہیں تھا کہ ابا گھر آ بیٹھے اور پھر مسلسل جھگڑے' فساد وغیرہ...... ایسے میں' میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی کہ علی کے ان دوستوں کی وجہ سے اب اس کا کچھ وقت باہر گزرنے لگا تھا۔ کم از کم اسٹڈی کی وجہ سے وہ آج کل گھر کے حالات سے لاعلم تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ میں دیکھ رہی تھی کہ علی میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے۔ وہ بہت افسردہ' بہت سنجیدہ سا رہنے لگا ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ بات نہیں کرتا بلکہ میں اس کے پاس جا کے بیٹھتی بھی تو یا تو وہ وہاں سے چلا جاتا یا خود سے کوئی بات نہیں کرتا اگر میں کوئی بات کرتی بھی تو مارے باندھے کو ہوں' ہاں میں جواب دے کے لیٹ جاتا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے یا میرے سر میں درد ہے" سن سن کے میں عاجز آ گئی تھی۔ یہ سب میری برداشت سے باہر تھا۔ میرا علی میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا تھا' یہ جاننے سے میں قاصر تھی۔ وہ زیادہ وقت باہر گزار رہا تھا۔ نہ کپڑے بدلنے کا ہوش نہ کسی اور چیز کا' میں کوئی بات کرتی تو کاٹ کھانے کو دوڑتا یا پھر بنا جواب دیے باہر چلا جاتا۔ میں دہری مصیبت میں مبتلا تھی۔ مہینے کا آخر' گھر میں تیزی سے ختم ہوتا راشن جہاں میرا بلڈ پریشر

بڑھاتے' وہاں علی کا رویہ اور لہجہ میری رہی سہی ہمت بھی توڑ دیتا۔

☆.....☆

میں باورچی خانے میں کام کر رہی تھی کہ کسی چیز کے گرنے کی آواز پر بے ساختہ سامنے والے کمرے کی طرف بھاگی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے علی گھسا تھا۔

کمرہ میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ چاروں جانب بکھرے تکیے' بیڈ کور' کتابیں.....الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے اور ان کے سامنے پڑا کپڑوں کا ڈھیر اپنے ساتھ گزرنے والے سانحے کے بارے میں خود ہی گواہی دے رہا تھا۔

''علی! یہ سب..... کیا ہوا چندا؟'' پریشانی کے باعث میرے منہ سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

کمرے کے بیچوں بیچ غصے میں بکھرے بالوں سمیت کھڑا وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میرا ہمدردی سے بڑھتا ہاتھ اس نے جھٹک دیا۔

''مت ہاتھ لگاؤ مجھے' تم ہی ہو سارے فساد کی جڑ' لے کے بن گئی میری اماں.....اور..... مجھے کیا بنا دیا.....'' وہ زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھا دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔

''میں.....میں.....'' میں حیران و پریشان کھڑی تھی۔ میرے سامنے میرا علی' میرا شہزادہ' میرا بھائی بالکل ویسے ہی رو رہا تھا جیسے بھی بچپن میں خوف زدہ ہو کے روتا تھا' بالکل ویسے ہی بے آواز' ہلکے ہلکے سسکتا ہوا۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس کے اس طرح رونے نے ہی تو مجھے اس کی بہن سے ماں بنا دیا تھا۔

میرے اندر پوشیدہ ممتا بری طرح تڑپی تھی اور میں اس کے پاس بے اختیار بیٹھتی چلی گئی۔

''علی چندا! کیا ہوا؟'' بولتے ہوئے میرے لہجے کے ساتھ ساتھ سارا وجود بھی کانپ رہا تھا۔

اس نے مجھے دھکا دیا۔ ہاں' اس نے مجھے دھکا دیا اور میں پیچھے کی طرف گر گئی۔ اسی وقت اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم دونوں نے؟ اور کمرے کا یہ حال.....؟''

''بس کریں' چپ کریں آپ.....'' علی پوری قوت سے دہاڑا تھا۔

میں نے بے ساختہ اپنا دل تھام لیا۔

''اپنا منہ بند کریں آپ' مجھے آپ کی آواز بالکل نہیں سننی۔ نکل جائیں کمرے سے' ابھی اسی وقت' دور ہو جائیں یہاں سے۔'' وہ پوری قوت سے چیخا تھا اور میں دم سادھے جہاں کی تہاں بیٹھی تھی۔

کچھ دیر تو اماں کو بھی سانپ سونگھ گیا۔ میرے مقابلے میں انہوں نے خاصی جلدی خود پر قابو پایا اور پھر شروع ہو گئیں۔

''اچھا تو اب تیرے بھی منہ میں زبان آ گئی' سنپولیے..... گدی سے کھینچ لوں گی تیری زبان' سنا تو نے.....آواز نیچی رکھ کے بات کرنا مجھ سے' نہ نہ بھولنا کہ میں کون ہوں تیری' مجھے اپنا باپ نہ سمجھنا' جو تجھے کچھ نہیں کہتا' نکما' نکھٹو' سارا سارا دن لفنگے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے اور ہمیں جھانسا دیتا ہے پڑھائی کا..... یہ پڑھے گا ہنہ.....! بڑا آیا پڑھنے والا' کام کا نہ کاج کا۔ ارے میں تو تیری چمڑی ادھیڑ کے رکھ دوں گی۔ اگر آئندہ میرے سامنے اتنی آواز نکالی تو.....''

''اماں! بس کریں۔'' اس سے زیادہ سننا میری قوت برداشت سے باہر تھا۔ میرے علی کے لیے اگر کوئی اور ایسے الفاظ سوچ بھی لیتا تو میں اس کا منہ ہی نوچ ڈالتی۔

میں تیزی سے کھڑی ہوئی اور تبھی اماں چیل کی طرح میری طرف جھپٹیں۔

''کمینی' چڑیل' مجھ سے زبان چلائے گی۔'' وہ جانوروں کی طرح مجھے پیٹ رہی تھیں اور علی سامنے کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے پٹتا دیکھ رہا تھا۔

آج سے اکیس سال پہلے والا خوف توانا ہو کے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں تیر رہا تھا۔ مجھے اماں کے ہاتھوں پٹنے اتنی تکلیف نہیں ہو رہی تھی جتنی اذیت ایک بار پھر اس خوف کو جاگتے دیکھ کے میں محسوس کر رہی تھی۔ اسی خوف کی وجہ سے تو میں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹا تھا۔ اسے باہر ہوتے ظلم و کرو فریب اور ممکنہ دکھ سے دور رکھنے کے لیے پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں سنائی تھیں جہاں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری رہتیں۔

میرا علی اندر سے بالکل کھوکھلا ہو گیا ہے' یہ انکشاف آج میرے اندر کسی بم کی طرح پھٹا تھا۔ سارے تکیے' تدبیریں ریزہ ریزہ ہو کے میرے اندر گر رہی تھیں۔ میری سوچ اپنی ناکامی پر مسلسل میرے ذہن پر ہتھوڑے چلا رہی تھی۔ سارا وجود شدید زلزلے کی زد میں تھا۔

اماں شاید مجھے مار مار کر تھک گئی تھیں۔ انہوں نے آخری بار مجھے بال پکڑ کے جھٹکا دیا اور پھر نیچے کی طرف دھکیلتی باہر چلی گئیں۔ جسم سے اٹھتی ٹیسوں اور ناک سے بہتے خون سے لاپروا میں علی کی جانب ٹکٹکی جواب تک ویسا کا ویسا بت بنا سامنے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ میرا محبتوں کی تقسیم زدہ ریاست کا اکلوتا شہزادہ۔

''علی.....!علی.....!'' میرے بری طرح جھنجھوڑنے پر اچانک اس نے میری طرف چونک کر دیکھا جیسے ابھی سوتے سے جاگا ہو اور پھر اس کے جسم سے تیزی سے جھٹکے کھانا شروع کر دیئے۔

''علی.....!'' میں بہت زور سے چیخی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت تیزی سے اوپر کی جانب چڑھ رہی تھیں اور جسم مسلسل جھٹکے کھا رہا تھا۔ دو تین دفعہ جھٹکے کھا کے اس کا جسم بے جان ہو کے میری بانہوں میں گر پڑا۔ وہ اونچا پورا مرد اور میں ایک نازک سی لڑکی۔ کیسے اس کا وزن سہار سکتی تھی' سو خود بھی زمین پر اس کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

''علی.....!علی.....!'' میرے کئی بار پکارنے پر بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

میں باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ بدحواسی میں دو گلاس توڑے' بمشکل تیسرے گلاس میں تھوڑا سا پانی لے کر ناکا کھلا ہی چھوڑتی واپس کمرے کی طرف دوڑی۔ اماں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے پورا گلاس ہی اس کے چہرے پہ الٹا دیا۔ تھوڑی دیر کوشش کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

''علی.....!علی.....!'' کپکپاتے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے میں مسلسل اسے پکار رہی تھی۔ ''دو منٹ.....میں.....میں بس ابھی ابا کو بلاتی ہوں۔'' اسے ہوش میں آتا دیکھ کر الٹے پاؤں میں باہر بھاگی۔

''ابا.....!ابا.....!'' زندگی میں پہلی بار شاید اتنے جوش میں' میں نے اپنے باپ کو پکارا تھا۔ ''دیکھو' علی کو کیا ہوا؟''

☆.....☆

وہ آدھے گھنٹے میں واپس آ گیا تھا۔ نیند کے انجکشن کے زیر اثر.....ابھی اسے کافی گھنٹے سونا تھا۔

میں اس کے پلنگ کے کنارے بیٹھی اسے تکے جا رہی تھی۔ اس کے اٹھنے تک سوچنے کے لیے میرے پاس کافی وقت تھا۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جھگڑوں کی آوازوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اٹھ کے دروازہ بند

کردوں۔

☆.....☆

ڈاکٹر نے فی الحال علی سے کچھ بھی پوچھنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ میں نے اماں سے ہاتھ جوڑ کے التجا کی تھی کہ جب تک وہ مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتا' اس کے سامنے مزید کوئی نیا ڈراما مت شروع کرنا اور زندگی میں پہلی ہی مرتبہ شاید ان کی عقل میں کوئی بات سمائی تھی۔ اس کے سارے کام پہلے کی طرح میں ہی انجام دے رہی تھی۔ وہ لیٹا لیٹا مجھے آتے جاتے دیکھتا رہتا' مجھ سے بات نہیں کرتا۔ اگر میں کچھ کہتی تو نظر جھکا لیتا' جواب نہیں دیتا۔ اس کی گہری چپ میرے اندر دھواں بھر رہی تھی کہ ایک دن..... ہاں' مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ سگریٹ پی رہا تھا۔

''علی..... یہ تم.....'' حیرت سی حیرت تھی۔

''ہاں' میں..... پھر؟'' بے رحم لہجے نے لمحوں میں ساری حیرت ختم کردی۔

''علی! تم سگریٹ پی رہے ہو؟'' اس کے دکھ کی کڑواہٹ کچھ کچھ لہجے میں بھی اپنے اندر سمو لی تھی۔

''ہاں' سب پیتے ہیں۔'' جواب ایک بار پھر مجھے حیرت میں ڈالنے کے درپے تھا۔ ''میں نے کیا دنیا سے انوکھا کام کیا ہے جو تم یوں.....''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں اس ننھے سے شعلے کو جھپٹ چکی تھی۔ میرا اس سے سگریٹ چھیننا تھا کہ وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔

''تم..... تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو؟ جو تم کہو گی' میں وہ کروں گا۔ جو تم سوچو گی' میں وہ سوچوں گا۔ جو تم بولو گی' وہی میں بھی بولوں گا۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے مجھ سے التجا کر رہا تھا۔ ''میں تھک چکا ہوں تمہاری محبتوں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے افشین! خدا کے واسطے' مجھے آزاد کردو۔ تم نے مجھے مذاق بنا دیا ہے۔ میں ہوں کیا؟ ایک فیصلہ تک نہیں لے سکتا' میری سوچ تک تو میری اپنی نہیں ہے' مجھے کیا پہننا چاہیے' کون سا رنگ مجھ پر اچھا لگے گا' مجھے کچھ نہیں پتا' سب وہی ہے جو تم کہتی ہو' میرے پاس میرا اپنا کچھ نہیں ہے۔''

وہ زمین پہ میرے پیروں کے پاس پڑا رو رہا تھا ویسے ہی ہچکیوں سے جیسے ابھی کچھ دنوں پہلے رویا تھا اور میں جو اس کی آنکھوں میں آنسو آنے سے پہلے خود ہی سارے آنسو پی لیا کرتی تھی۔ آج تہی دست اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے جڑے ہاتھ میرے سامنے دھرے تھے۔ میں جو اس ڈر سے کہ کہیں اسے چوٹ لگنے کی تکلیف نہ سہنی پڑ جائے' کبھی بازو بچوں میں کھیلنے ہی نہیں دیتی تھی' آج اس کے دل پہ لگی گہری چوٹ سے انجان تھی۔

''معاف کردو افشین! مجھے معاف کردو میں..... میں تنگ آ گیا ہوں تمہاری انوکھی محبت سے' سب میرا مذاق اڑاتے ہیں' میں کیسے جاؤں دنیا کے سامنے' سب کہتے ہیں میں لڑکیوں جیسا ہوں' نازک سا..... وہ..... وہ گیتی بھی یہی کہتی ہے کہ میں لڑکیوں جیسا ہوں' مجھ میں مردوں والی کوئی خوبی نہیں۔ کیا افشین! کوئی لڑکی کبھی مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہے گی' میں..... کیا..... میں.....؟''

میں اسے اپنے سامنے روتے ہوئے' تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھی مگر کہنے کو' کرنے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

آج میری زندگی کی واحد پونجی بھی لٹ گئی تھی۔ خبر تک نہ ہوئی' کب اس کا درد آنسوؤں میں ڈھل کر میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اس کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں' وہ بین کر رہا تھا' ماتم کر رہا تھا نجانے کس کے مرنے کا.....

شاید اس کی چیخ و پکار پر ہی ابا بھاگے بھاگے

آئے تھے۔

کتنی ہی دیر اماں میرے سرہانے کھڑی کیا بولتی رہیں' خبر نہیں۔ میں بھی کیا کرتی' میرے کانوں میں کوئی اور آواز آ ہی نہیں رہی تھی۔ میں بیٹھی ان لفظوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو ایک ایک کر کے میرے خالی کاسۂ دل میں علی نے ڈالے تھے۔

یہ ثمر تھا میری محبت کا.....؟

علی ابا کی بانہوں میں ہوش و حواس سے بیگانہ پڑا تھا۔ آخری منظر میری آنکھوں نے یہی دیکھا تھا کہ ابا اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کے باہر کی جانب بھاگے تھے پھر میں اس کے پلنگ پہ ہی لیٹ گئی اور پائنتی پڑی چادر سر سے پیر تک تان لی۔ میں سو جانا چاہتی تھی' ہمیشہ کے لیے۔

☆.....☆

اور وہ چلا گیا۔ ہم سب سے روٹھ کے۔ بنا کچھ کہے' بنا کچھ سنے' شکستہ وجود لیے وہیں چلا گیا جہاں سے آیا تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس جیسے معصوم لوگوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اچھا ہوا علی! تم مر گئے۔

مر تو تم اسی وقت گئے تھے جب کہ ہر گھڑی اپنے والدین کو وحشیوں کی طرح لڑتے جھگڑتے دیکھتے تھے۔ میں ہی پگلی تھی' لمحہ بہ لمحہ اپنی سانسیں تمہارے اندر پھونکتے میرے ہونٹ نیلے پڑ جاتے۔ جھوٹی خوشیوں کے گھروندے بناتے بناتے میرے ہاتھوں پہ آبلے اگ آئے مگر..... مگر وقت نے کیا کیا' کیا کیا میرے ساتھ..... کیا کیا تمہارے ساتھ..... کیا کیا میرے ساتھ علی.....! میرے ساتھ ساتھ گھر کی دیواریں بھی کراہیں لینے لگی ہیں۔

''افشین! تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

یہ وہ سوال تھا جس کا کرب آج بھی میرے دل سے جھیلا نہیں جاتا۔ کلیجہ پھٹنے لگتا ہے میرا۔ میرے جوان بھائی کا لاشہ باہر رکھا تھا اور گھر میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ اس کو دفنایا جا سکتا' اس سوال کو پوچھنے والی اور کوئی نہیں بلکہ اس لاشے کو بھی جنم دینے والی اس کی ماں ہی تھی۔

آنے والے تمام لمحوں میں دراڑیں ویسے ہی کندہ ہیں جیسے میرے اپنے اندر..... وقت بھی بوڑھا دلاغر ہو چکا ہے میرے وجود کی طرح۔

اس کے آخری وقت اماں بچھاڑیں کھا رہی تھیں اور میں دل میں اسے آخری آرام گاہ تک پہنچانے کی حسرت لیے خود بھی مر رہی تھی۔

وہ خود تو مر گیا' پیچھے سوالوں کی بوچھاڑ چھوڑ گیا ہم سب کے لیے۔

جنگلی کبوتروں سا' بھولا بھالا' خوف زدہ سا علی' آج بھی اکثر میرے خوابوں میں آ کے مجھے جھنجھوڑتا ہے' سوال کرتا ہے کہ میں نے اسے کیوں مارا؟ میں نے' یعنی میں نے خود اسے ہی اپنے علی کو.....؟ کیا میں نے اسے مارا ہے' ہاں' شاید..... نہیں' لیکن اکیلے میں نے ہی کیوں؟ اس کے خون میں اماں کے ہاتھ بھی برابر کے رنگے ہیں۔ اگر وہ چاہتیں تو مجھے وقت سے پہلے ماں نہیں بننا پڑتا۔ اس کے قتل عام میں ابا بھی شریک ہیں' اگر وہ تحمل سے کام لیتے' حالات کو سنبھالتے تو کیا مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا۔ اس کو مارنے میں حالات بھی ذمے دار ہیں' معاشرہ بھی اور..... اور وہ بھی.....

گیتی' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تمہارے الفاظ نے میرے بھائی کی شہ رگ پہ آخری چھرا چلایا تھا' وار کاری تھا اور میرا بھائی.....

کس نے مارا اسے؟ میں نے' اماں نے' ابا نے' گیتی نے' حالات نے یا.....

آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆.....

لگا اک داغ

عذرا فردوس

بڑھتا چلا جاتا ہے دکھ کم نہیں ہوتا
دل پھر بھی شریکِ صفِ ماتم نہیں ہوتا

کراچی سے تیسری شعلہ ساماں تحریر

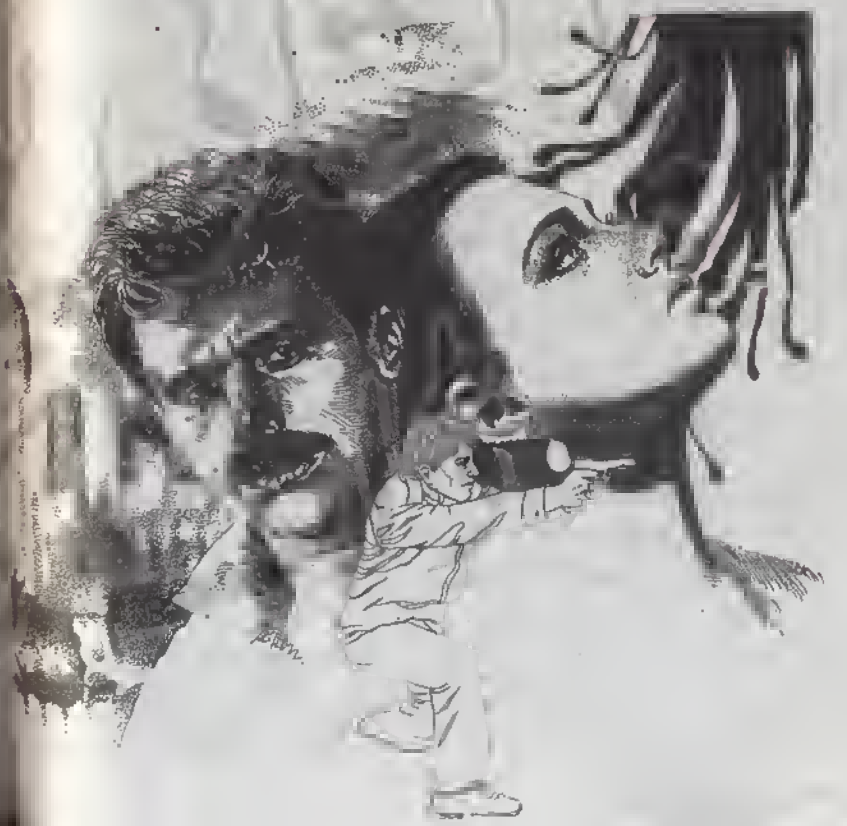

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی' شام کے چھ بج رہے تھے مگر بارش کی وجہ سے اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے اپنی دراز لاک کی اور آفس سے نکل کھڑا ہوا۔ باہر سڑک جل تھل ہو رہی تھی۔ ایک طرف بنے شیڈ کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے رکشہ' ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر کسی بھی قسم کی کنوینس ویگن' بس' رکشہ' ٹیکسی کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ پانی کھڑا تھا بلکہ سڑک اچھی خاصی دریا بنی ہوئی تھی جس میں سے گزرتی ہوئی گاڑیاں بوں لگ رہی تھیں جیسے تیر رہی ہوں۔ میرے ساتھ دو چار افراد اور بھی کھڑے تھے اور سب کی نظریں سامنے سے آتی ہوئی ویگن پر تھیں۔ میں نے بھی امید بھری نظروں سے ویگن کو دیکھا لیکن بدقسمتی سے وہ دوسری سمت میں جانے والی تھی۔ اتنے میں ایک رکشہ قریب آ کر رکا۔ میں نے اپنے علاقے کا بتایا۔

''صاحب! تین سو روپے ہوں گے۔'' رکشہ والا بھی بارش کا فائدہ اٹھانے کے موڈ میں تھا۔

''تین سو روپے تو بہت زیادہ ہیں۔'' کرایہ بچانے کے لیے میں ہمیشہ بس میں سفر کرتا تھا۔

''صاحب! سڑکیں بھی تو دیکھیں' دریا بنی ہوئی ہیں' راستے میں رکشہ خراب ہونے کا ڈر بھی ہے۔''

اس کی بات معقول تھی' چنانچہ میں فوراً راضی ہو گیا۔ ایک صاحب جو میرے ساتھ کھڑے تھے' میں نے ان سے پوچھا۔

''آپ کو کدھر جانا ہے؟ اگر روٹ ایک ہی ہے تو آپ بھی آ جائیں۔''

''جانا تو ادھر ہی ہے۔'' وہ بڑی حسرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ میرے ساتھ چلیے' کب تک رکشے کی تلاش میں ادھر کھڑے رہیں گے؟'' وہ صاحب میری اس آفر پر فوراً رکشے میں بیٹھ گئے۔

بارش مزید تیز ہو گئی تھی' بادل بھی خوب گرج رہے تھے' بجلی کی چمک دل کو دہلا رہی تھی' سڑکوں پر پانی کھڑا ہونے کی وجہ سے رکشہ رینگ رہا تھا۔ اس دوران میں نے اُن صاحب سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنا نام راحم صدیقی بتایا۔ نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ مجھے لگا جیسے میں نے یہ نام کہیں پڑھا ہے۔ کچھ دیر سوچتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا' یہ نام کچھ عرصہ پہلے ہی اخباروں کی زینت بنا تھا۔ میں صحافت سے وابستہ تھا' کچھ عرصہ پہلے راحم صدیقی کی تصویر اخبار کے پہلے صفحے پر لگی تھی' ساتھ ہی ڈکیتی کی خبر تھی۔ میں نے اُن صاحب کو غور سے دیکھا تو وہ میری نظروں کو بھانپ گئے تھے' ساتھ ہی دکھ کی ایک لہر اُن کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

''آپ درست سوچ رہے ہیں' میں وہی راحم احمد ہوں جس کے متعلق اخبارات میں خبریں لگیں حالانکہ وہ گناہ میں نے نہیں کیا تھا۔'' اُن کی آواز میں درد بھرا ہوا تھا' حقیقتاً دیکھنے میں بھی وہ کسی ڈکیتی میں ملوث نہیں لگ رہے تھے لیکن کسی کے دل میں کیا ہے' اس کی خبر صرف خدا کو ہی ہوتی ہے۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجانے میں انسان ماہر ہوتا ہے۔ راحم صدیقی اور میرا گھر ایک ہی علاقے میں تھا۔ ہم ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہتے تھے۔ تھوڑی دیر میں رکشے والے نے ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دیا۔

''اچھا بھئی' خدا حافظ!'' میں نے کہا۔

''فیاض صاحب! اب آپ میرے گھر سے چائے پی کر جائیں گے' سامنے گلی میں میرا گھر ہے۔'' راحم صدیقی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں نہ جاتا لیکن ایک تو اُن کی کہانی

سننے کا تجسس اور دوسرے بارش کی شدت نے مجھے اُن کے ساتھ جانے پر مجبور کردیا۔

راحم صدیقی کا گھر بہت خوبصورت تھا' ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش اعلیٰ ذوق کی داد دے رہی تھی۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے میں کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ راحم صدیقی کا دس سالہ بیٹا چائے لیے کمرے میں آ گیا۔ گرما گرم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے۔ مجھے اُن کے متعلق جاننے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں راحم صدیقی سے بہت سے سوال کرنا چاہتا تھا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے ذریعے ان کے متعلق مجھے جو معلومات ہوئی تھیں' ان کے مطابق وہ ایک مشہور کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ چند ماہ پیشتر وہ بینک سے ملازمین کی تنخواہ لے کر آ رہے تھے کہ اُن کے ہمراہ کمپنی کا ایک ملازم بھی تھا۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے کار کی رفتار ذرا ہلکی ہوئی' بس وہیں گن پوائنٹ پر تین نقاب پوشوں نے راحم صدیقی کو لوٹ لیا' ڈاکوؤں نے انہیں ان کے نام سے مخاطب کیا تھا' بس یہی چیز ان کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ کمپنی کے مالک نے راحم صدیقی کے خلاف گواہی دی کہ وہ ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے لہٰذا ڈکیتی میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ بعد میں اس الزام پر انہیں گرفتار کرلیا گیا' پولیس فردِ جرم ثابت تو نہ کرسکی لیکن راحم صدیقی کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے' رسوائی علیحدہ ہوئی۔ اب اصل بات کیا تھی' یہ تو راحم صدیقی ہی بہتر جانتے تھے۔ میرے دل میں تمام حالات جاننے کا فطری تجسس تھا لیکن راحم صدیقی کے زخموں کو کریدنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ان کے گھر کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کا تعلق کسی اچھی فیملی سے ہے۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ راحم صدیقی نے کہنا شروع کیا۔

''میری زندگی بھی عجیب ہے' میں وہ انسان ہوں جو ناکردہ گناہ کی سزا کاٹ رہا ہے۔ فیاض صاحب! اللہ گواہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ میرے خلاف جرم بھی ثابت نہیں ہوسکا ہے لیکن لوگوں کی میری طرف اٹھتی ہوئی نظروں نے مجھ اور میرے بچوں کو مجرم بنا دیا ہے۔ میں کس کس کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا پھروں؟ اخبارات کی سرخیاں جو میرے خلاف لگائی گئیں' انہوں نے مجھے مجرم تو بنا دیا ہے' میری تصویر اور میرے متعلق خبریں تو سب نے پڑھ لی ہیں پھر میں اپنی بے گناہی کو کیسے ثابت کروں؟ میں ایک ایک فرد کو کیسے بتاؤں کہ میں مجرم نہیں ہوں بلکہ کمپنی کے ایک ذمے دار افسر کا اس ڈکیتی میں ہاتھ تھا۔ ایک نوکری تو ختم ہو ہی گئی ہے اور میں جانتا ہوں' اس شہر میں مجھے کوئی اور نوکری نہیں دے گا اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے' میں کسی دوسرے شہر جا کر نوکری تلاش کروں جہاں کوئی مجھے ڈاکو یا چور نہ کہہ سکے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سارے معاملے میں قصوروار کس کو ٹھہراؤں؟ اس شخص کو جس نے میرا نام لیا یا کمپنی کا وہ افسر جو ڈکیتی میں ملوث ہے؟ مگر کوئی اس کا نام لینے کو تیار نہیں۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے سر جھکا لیا۔ ان کی سسکیوں کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

''راحم صاحب! حوصلہ رکھو' بعض اوقات انسان پر آزمائش آتی ہے۔'' میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ ان کی آنکھوں سے لاوا ابل رہا تھا۔ ''اگر آپ جانتے ہیں کہ کمپنی کا افسر اس ڈکیتی میں ملوث ہے اور تمہارے خلاف سازش کی گئی ہے تو آپ نے پولیس کے سامنے بیان کیوں نہیں دیا؟''

''میں نے لاکھ بیان دیا مگر پولیس تو مجھے ہی

مجرم سمجھ رہی تھی۔ اسے میرے بیان پر یقین نہیں تھا اور ویسے وہ افسر کوئی معمولی انسان نہیں ہے' وہ کمپنی کے مالک کا بھتیجا ہے' اس سے پہلے بھی وہ کئی طرح کی ہیرا پھیری اور بے قاعدگیوں میں ملوث رہا ہے۔ مجھ سے تو وہ خاص طور پر خار کھاتا تھا' کیونکہ میں اوروں کی طرح رشوت نہیں لیتا تھا۔ میں ایک طرح سے اس کی راہ کا کانٹا تھا جو اس کی نظر میں کھٹک رہا تھا۔ فیاض صاحب! لفظ 'مجرم' کا جو خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا ہے' وہ میں ہی جانتا ہوں' مجھ پر روزگار کے دروازے بند ہیں' میری سترہ سالہ بیٹی کی منگنی ایک سال پہلے ہوئی تھی' وہ ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے' لوگ ایسے شخص کی بیٹی سے کیوں شادی کریں گے' جس کے باپ کا نام ڈکیتی میں آیا ہو؟ لوگوں کو اس سے غرض نہیں کہ میں مجرم ہوں یا نہیں یا عدالت مجھے بے گناہ قرار دے چکی ہے' ان کی نظروں میں تو اخبار میں چھپنے والی وہ خبر اور تصویر ہے جو چیخ چیخ کر مجھے مجرم قرار دیتی ہے' مجھ پر کئی ماہ سے مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے' مالک مکان نے مجھے مکان خالی کرنے کا کہہ دیا ہے' زندگی بہت تنگ ہوگئی ہے' بیوی کا زیور بیچ بیچ کر گزارہ کر رہا ہوں مگر اب تو بیوی کے پاس کوئی زیور بھی نہیں بچا ہے جسے بیچ کر میں راشن پانی کا انتظام کرسکوں۔ مجھے بتایئے' ان حالات میں' میں کیا کروں؟ جس پر گزرتی ہے' اسے ہی دکھ کا اندازہ ہوتا ہے۔'' راحم صدیقی حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے جبکہ میرے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میرے پاس تو ہمدردی کے الفاظ بھی نہیں تھے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو اخبار پڑھ کر انہیں مجرم سمجھتا تھا۔

''اچھا' میں چلتا ہوں' باہر شاید بارش رک گئی ہے' کہیں دوبارہ شروع نہ ہوجائے۔ گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔ حوصلہ رکھو' میں آپ کے روزگار کے لیے کچھ کروں گا' پریشان مت ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو نوکری مل جائے گی اور اسی شہر میں ملے گی۔'' میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بہت' بہت مہربانی جو آپ میرے گھر آئے ورنہ تو لوگ مجھے دیکھ کر کٹ جاتے ہیں۔ میں اپنے مالی حالات کی وجہ سے بہت پریشان ہوں' دوسرے شہر جانا بھی آسان نہیں' وہاں پر سیٹ ہونے کے لیے بھی رقم کی ضرورت ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ میرے تو چاروں بچے ابھی پڑھ رہے ہیں۔'' راحم صدیقی کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ میں نے ان کا شانہ تھام کر انہیں تسلی دی اور ہاتھ ملا کر گھر آ گیا۔

''کہاں رہ گئے تھے آپ؟ کم از کم فون ہی کر دیتے؟'' گھر میں گھستے ہی بیگم کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''راستے میں ایک صاحب مل گئے تھے' اُن کے گھر چلا گیا تھا۔''

''آپ کو تو گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں ہے۔ میں نے صبح جو آپ کو سامان کی لسٹ دی تھی' وہ لے آئے؟ ایک ایک کرکے سب چیزیں ختم ہو رہی ہیں۔''

''اتنی بارش میں کہاں سامان لینے جاتا' ویسے بھی مہینے کا آخر ہے' جیسے تیسے مہینہ پورا کرو۔''

''مجھے پتا تھا' آپ یہی کہیں گے۔ اسد کا دودھ ختم ہونے کو ہے' وہ تو آپ کو لانا ہوگا۔ آپ جو مجھے رقم دیتے ہیں' اس میں گھر چلانا بہت مشکل ہے۔'' بیگم نے راگ الاپتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی' کل لادوں گا' اس وقت مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے' تم کھانا لگاؤ۔'' میری بیگم ناک

بھوں چڑھاتی کچن میں چلی گئی۔ کھانے کے بعد آرام کرنے بستر پر لیٹا تو سوچوں نے مجھے گھیر لیا۔ میری سوچ کا محور راحم صدیقی تھے۔ جوں جوں اُن کی حالت کے بارے میں سوچتا' میری بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میری بیگم نے بھی میری بے چینی محسوس کرلی تھی۔ ''کیا بات ہے؟ جب سے گھر آئے ہیں' پریشان سے ہیں؟''

''فرحانہ! آج میری ملاقات اپنے علاقے کے ایک شخص سے ہوئی ہے جو بے چارہ ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا ہے۔ ملازمت ہے نہیں' اس پر بیوی اور چار بچوں کا ساتھ ہے۔ سخت مالی پریشانی میں گھرا ہوا ہے' اوپر سے گھر کرائے کا ہے۔''

''آپ اس کی کچھ امداد کردیتے' ویسے ہمارے پاس اتنا زیادہ تو ہے نہیں جو ہم کسی کے لیے راشن کا انتظام کرسکیں۔'' بیگم نے خود ہی اپنے مشورے کی نفی بھی کردی۔

''ہاں' میں بھی یہی سوچ کر کچھ نہیں بولا۔ تھوڑا سا دینے سے کیا ہوگا' جب بندے کے پاس کمائی کا کوئی آسرا نہ ہو تو کسی کی مالی امداد سے اس کے گھر کا خرچہ کتنے دن چل سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ اسی فکر میں جانے کب مجھے نیند آگئی۔

اگلے روز آفس پہنچ کر میں نے اپنے جاننے والے کئی لوگوں سے راحم صدیقی کی جاب کے لیے کوشش کی۔ سب نے یہی جواب دیا' فی الحال کوئی جاب نہیں ہے۔ دن اسی طرح گزرتے رہے' رفتہ رفتہ راحم صدیقی کا نام میرے ذہن کے کسی کونے میں گم ہوگیا۔ میں نے راحم صدیقی کو اپنا فون نمبر بھی دیا تھا مگر انہوں نے کبھی رابطہ بھی نہیں کیا کہ مجھے وہ یاد رہ جاتے۔ اگر کبھی ان کی یاد آتی تو یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا' ہوسکتا ہے' وہ ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر چلے گئے ہوں۔

ایک دن میں آفس میں بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ میرے ایک ساتھی فاروق نے ایک خبر دی۔ خبر میرے ہی علاقے سے متعلق تھی۔

''یار! تم راحم صدیقی کو تو جانتے ہوگے' وہ شخص جس کا نام بینک ڈکیتی کے ملزمان میں شامل تھا اور وہ بعد میں رہا بھی ہوگیا تھا؟'' فاروق نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں' ہاں' میں اس سے ملا ہوں اور کئی لوگوں سے اس کی نوکری کے سلسلے میں سفارش بھی کی تھی۔''

''آئندہ تم اس طرح کے لوگوں کے چکر میں مت پڑنا ورنہ خواہ مخواہ تھانے کچہریوں کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ پتا ہے' ان نے کیا' کیا ہے؟ اپنی کمپنی کے اعلیٰ افسر کو شوٹ کرنے کے بعد خود بھی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلالی۔'' یہ خبر میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ کچھ دیر تک میں گم صم سا بیٹھا رہا' گویا راحم صدیقی حالات سے ہار گئے تھے' زندگی کے تمام دروازے ان پر بند ہوچکے تھے اس لیے انہوں نے اصل کردار کو کیفرکردار تک پہنچا کر اپنی زندگی اور زندگی کی تمام پریشانیوں سے نجات تو حاصل کرلی تھی مگر اپنے پیچھے رہ جانے والی زندگیوں کو انہوں نے جیتے جی مار ڈالا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اب ان کی اولاد کو ایک قاتل کی اولاد بنا دیا تھا۔ اب اس داغ کے لگنے کے بعد ان کی اولاد اب کن راہوں کی مسافر بن سکتی تھی' یہ مجھے صاف نظر آرہا تھا مگر اس وقت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بس یہی دعا نکلی تھی کہ ان کے ساتھ ایسا نہ ہو جیسا میں سوچ رہا تھا۔

......☆☆......

کھنک ہنسی کی

محسنہ جیلانی

جب سے روٹھی ہے ہنسی دل بھی ہے پژمردہ سا
دیکھتے ہیں ہمیں آئیں گے ہنسانے کتنے

بہ منتکم — سے چیختی شعلہ سالاں تحریر

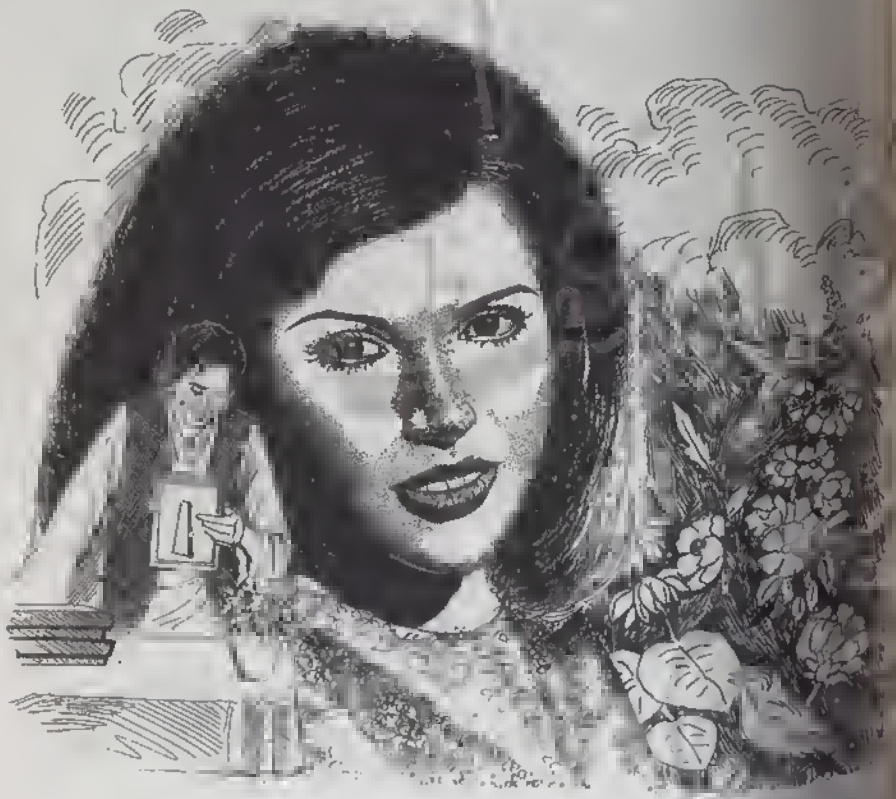

بے کراں پھیلے ہوئے آسمان پر روشنیوں کے سیلاب نے اپنی راہیں استوار کر لی تھیں۔ ویسٹ منسٹر ایبے' لندن برج اور ٹاور آف لندن کی اجلی عمارتیں پانی سے دھل کر آنے والی روشنیوں میں نہائی ہوئی کھڑی تھیں۔ تیز روشنیوں کی تاب نہ لاکر تاروں نے آنکھیں موند لی تھیں مگر چاند کا پیلا چہرہ ٹیمز کے عین اوپر جھکا ہوا تھا جیسے اس کے اور پانیوں کے بیچ آجانے والی روشنی کی چادر پر دُکھی ہوگیا ہو مگر آج کی رات وہ ضرورت سے زیادہ ہی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس نے شاید اپنی سب سے زیادہ خوبصورت ساڑی پہنی ہوئی تھی اور میک اپ کرنے میں بڑا اہتمام کیا تھا اور انگلش یاسمین کے سفید گجرے بنا اپنے لمبے بالوں میں گوندھ رکھے تھے۔

''آج تو تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' میں نے اس سے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ ''روز روز تو اس قسم کی پارٹیاں نہیں ہوتیں نا اور پھر موقع ہی کب ملتا ہے۔ تم تو جانتی ہی ہو' وہ مجھے میک اپ کرنے ہی کہاں دیتا ہے۔ آفس جاؤں تو یونہی اجڑی اجڑی..... کہتا ہے' اتنی ڈھیر ساری خوشبو کیوں لگائی ہو؟ لپ اسٹک لگانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ آفس جارہی ہو یا فیشن شو میں؟ یہ مت کرو' وہ مت کرو' روز روز کی مصیبت سے تنگ آکر میں نے میک اپ کرنا ہی چھوڑ دیا' کسی طرح تو چین سکون ملے۔ نہ جانے وہ اتنا شکی کیوں ہے؟ میرے اوپر تو اعتماد ہی نہیں کرتا اور تو اور' سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔''

''کیا بھلا؟''

''کہتا ہے' جس دن تم نے اپنے بال کٹائے' بس سمجھو کہ طلاق ہوگی' میرے گھر میں مت آنا۔''

''ہوسکتا ہے' وہ تمہارے لمبے گھنے بال بہت پسند کرتا ہو؟''

''مجھے تو خود ہی اپنے لمبے بال پسند ہیں' میں بھلا کیوں کٹوانے لگی انہیں؟'' وہ پھر ہنسنے لگی۔ وہی کھنکتی ہوئی چوڑیوں کی مدھر آواز۔ ''دیکھو' میں اوپر سے کیسی خوش ہوں' چاہے اندر سے بالکل چور چور ہوجاؤں' میں نے سوچ لیا ہے' اپنے دکھ کی آنچ کسی تک بھی نہ جانے دوں گی۔''

''تم بہت بہادر ہو' میں اور کہہ بھی کیا سکتی ہوں؟'' میں نے کہا تھا۔

''یوں تو جینے کے لیے بہت کچھ ہے مگر کبھی اس زندگی سے بددل ہونے لگتی ہوں' وہ سمجھتا ہے کہ نہ صرف میں اس کی ملکیت ہوں بلکہ میری ہر چیز' کپڑے' زیور حتیٰ کہ میری تنخواہ تک سب کچھ کا وہی مالک ہے اور اس کی اجازت کے بغیر مجھے کچھ نہیں کرنا چاہیے یعنی اس کی مرضی کے بغیر میں سانس بھی نہیں لے سکتی۔ کبھی مجھے اس کی باتوں پر ہنسی بھی آتی ہے' کس قدر بچپنا ہے اس میں۔ اگر کسی گاؤں میں شادی ہوکر جاتی تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر یہ تو یہاں پیدا ہوا' یہیں برمنگھم میں' یہیں کے اسکولوں' کالجوں میں تعلیم پائی اور اتنے بڑے اخبار کے لیے کام کرتا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے نا؟ کہیں اکیلا جانے نہیں دیتا اور میرا دل چاہتا ہے' کبھی کبھی اکیلی رہوں' کبھی بس اپنے بچے کے ساتھ' کبھی بالکل تنہا' تم کہو گی' میں بھی بڑی عجیب ہوں مگر کیا کروں' وہ تو ہمیشہ ذہنی اذیت ہی پہنچاتا ہے' اس طرح کہ طبیعت اوب جاتی ہے۔ کبھی دوسری شادی کر لینے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ کتنی دفعہ کہا' بابا' میرا پیچھا چھوڑو' بس میرا بچہ مجھے دے دو' میں اسے لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ دل چاہتا ہے.....'' وہ کہیں دور سے بول رہی تھی۔ ''دل چاہتا ہے' اسے لے کر دنیا کے اُس پار چلی جاؤں۔''

ہیراڈرنک لے کر ہماری طرف آگیا تھا اور ہم نے اورنج جوس کے گلاس اٹھا لیے تھے۔

وہ فارن جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی ایک پارٹی تھی جس کا اہتمام بوٹ پر کیا گیا تھا۔ میں اُن دنوں ایک اخبار کے لیے کام کررہی تھی اور وہیں آفس میں میری ملاقات اندو سے ہوئی تھی۔ اسے یہاں آئے ہوئے ابھی دو سال ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی' اس کا راج سے شادی کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔

ابھی ہم نے تھوڑی دیر پہلے فش اینڈ چپس کھائے تھے' لیمونیڈ پیا تھا اور اپنے بچوں کی باتیں کی تھیں اور خالص عورتوں کے انداز میں غصہ میں دوسری عورتوں اور لڑکیوں کے سلیقہ اور بدسلیقہ پہنے ہوئے لباسوں اور رنگوں پر تبصرے کیے تھے۔ ہم دونوں کی دوستی کا راز شاید اسی میں تھا کہ ہم دونوں کے ذوق اور پسند میں مماثلت تھی۔

اب پیلا چاند عین عرشہ پر چمک رہا تھا۔ روشنیوں میں مدغم ہوکر چاندنی نے پانیوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ میں نے ایسی خوبصورت راتیں کم دیکھی ہیں یا صرف چاندنی میں ٹیمز کے کنارے کھڑے ہوکر دیکھی ہیں۔ جب حسنِ فطرت کے ساتھ ساتھ رات نے مصنوعی روشنیوں کے زیور پہن لیے ہوں اور تیز جلتے ہوئے قمقموں کی نگاہیں سیدھی فضاؤں میں پھیلنے کے بجائے آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہوں یا پانیوں کے دونوں کناروں سے گلے مل رہی ہوں۔

عرشہ پر ساز بج رہا تھا اور لوگ محوِ رقص تھے۔ ہمارے سامنے عرشہ پر ایک ہندوستانی مغرب زدہ لڑکی اپنے دوست کے ساتھ رقص کررہی تھی۔ اس کا بھدا نیم برہنہ جسم بلاوز سے جھانک رہا تھا اور سوکھی سانولی ٹانگیں اسکرٹ سے باہر نکلی عجیب انداز سے تھرک رہی تھیں۔

''کوکونٹ۔'' اندو نے میری طرف جھک کر کہا اور پھر زور سے ہنس پڑی' وہی کھنکتی ہوئی ہنسی۔ اس کی سدا خوش نظر آنے والی عادت عود کر آئی تھی یا وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے مسائل بھول گئی تھی۔

ہم لیمونیڈ پی رہے تھے اور ٹیمز کے دمکتے ہوئے پانیوں میں جھانک رہے تھے۔ ہماری کرسیاں عین کھڑکی کے پاس تھیں۔ روشنی سے بھرے جھلمل پانی کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بوٹ کی رفتار تیز ہورہی تھی' اس کے ساتھ موسیقی بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ بوٹ پر لگی بے شمار رنگین روشنیاں جل بجھ رہی تھیں اور رقص کرنے والوں کے قدم تیز ہوگئے تھے۔

مجھے اور اندو کو رقص سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم تو عرشہ پر بیٹھ کر صرف باتیں کرنا چاہتے تھے اور ٹیمز کی لہروں میں روشنیوں کو پھنسا ہوا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہورہے تھے کہ اچانک اندو کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور اس کی نگاہیں عرشہ کے مغربی کونے میں جا کر اٹک گئیں۔

"Hypocrite." وہ قدرے جھنجھلا کر بولی۔

میں نے ایک دم مڑ کر اس سمت دیکھا جہاں اندو کی نظریں جا کر ٹھہر گئی تھیں۔

راج..... ایک لڑکی کے ساتھ محوِ رقص تھا۔ دنیا سے بے خبر سنہرے بالوں میں منہ چھپائے' آنکھیں بند نجانے کون سی دنیا میں تھا وہ.....

''تم تو پروا نہیں کرتیں۔'' میں نے کہا۔ ''چاہے وہ کچھ بھی کرتا پھرے۔''

"نہیں، بالکل نہیں۔" وہ فضا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "لیکن اگر میں بھی کسی کے ساتھ رقص کرنے لگوں تو لندن میں کل صبح تک قیامت آجائے گی۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ اب کی بار میں نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی میں نہ چوڑیوں کی کھنک تھی نہ کلیوں کی نرماہٹ پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنے کو بڑے سلیقہ سے سنبھال لیا اور پانیوں میں جھانکنے لگی۔ روشنیاں تو پانی پر خود ہی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہیں اور پانی کیسا پرسکون ہے۔

میں نے اکثر پارٹیوں میں دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ مشرقی لباسوں میں ملبوس لڑکیوں کو دیکھ کر کوئی ان کے ساتھ رقص کرنے کی خواہش نہیں کرتا تھا' شاید انگریز ہماری تہذیب اور کلچر سے واقف ہو گئے تھے۔ میں نے تو یہ بھی دیکھا تھا کہ اکثر کرسمس کی پارٹیوں میں ساڑھی یا شلوار قمیص میں ملبوس کوئی مغرب زدہ لڑکی خود ہی اٹھ کر کسی انگریز کی باہیں تھام لیتی اور کھینچ کر ڈانس فلور پر لے آتی اور میں سوچا کرتی' کیسی الٹ بات ہو رہی ہے۔

اچانک ایک بڑی غیر متوقع بات ہو گئی' ایک اطالوی جرنلسٹ بڑی دیر سے ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا' شاید وہ ڈانس کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں پا رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ ہمیں ڈانس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اندو نے گھبرا کر میری طرف دیکھا' وہ ہماری طرف آرہا تھا۔ شاید زیادہ پی کر وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں رہا۔ وہ چپکے سے بولی اور اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی نے فضا میں چاندی کے تار بکھرا دیئے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' وہ قریب آ گیا تھا' قدرے جھک کر اس نے بڑے مہذب انداز سے پوچھا تھا۔

"کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟"

مجھے ڈانس سے کوئی دلچسپی نہ تھی' میں جانتی تھی' مجھے کیا جواب دینا ہے۔

"I will sit this one out."

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" اس نے شکریہ کے انداز میں سر کو جنبش دی۔ ابھی وہ مڑنے بھی نہ پایا تھا کہ اندو ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

"مجھے آپ کی ہم رقص بننے پر بڑی خوشی ہو گی۔" اس نے بڑی شستہ انگریزی میں کہا۔ اجنبی اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ کر قدرے جھکا اور مسکرا کر اندو کو تھام لیا پھر وہ اس کے ساتھ رقص کرتی عین راج کے سامنے چلی گئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور کنپٹیاں جل رہی تھیں' شاید وہ اس سے بدلہ لے رہی تھی۔ پانی میں نہا کر آنے والی ہوا کے لیے میں نے اپنا چہرہ کھڑکی سے ذرا باہر کیا۔

'اب کیا ہو گا؟ اندو کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔' لندن برج' ٹاور آف لندن اور شہادت کی انگلی کی طرح اٹھی ہوئی قلوپطرا نیڈل سب پانی میں ساتھ ساتھ جیسے بہہ رہے تھے۔ روشنیوں کا سیلاب انہیں تھامے ہوئے تھا۔ رات دلہن کی طرح گوٹے کناری کے کپڑوں میں لپٹی جھلمل زیورات کے بوجھ سے دبی آنے والے وقت کے خدشہ سے سہمی سہمی لگ رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی' اس کی زندگی میں طوفان آتے ہی رہتے ہیں' نجانے اس بار کتنا بڑا طوفان آئے گا۔ کیسی بے وقوفی کی ہے اس لڑکی نے لیکن میں اس کے لیے اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہوں؟ میں نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سمجھایا' بس میرا اور اس کا دوستی کا ہی تو رشتہ ہے' میری بلا سے' کچھ بھی کرے مگر دل کسی طرح نہ ٹھہرا' اندر ہی اندر جیسے اسے نجانے کیا ہو رہا تھا؟

آدھی رات ہونے تک ہماری بوٹ اپنی منزل

تک پہنچ کر واپس لوٹنے لگی تھی۔ ہر سفر' ہر خوشی اور ہر دکھ کا ایک اختتام بھی ہوتا ہے آخر۔

لوگ رقص کرتے کرتے بدحال ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ تھک کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ رات کے بھیگے آنچل سے خوشیوں کا آخری قطرہ نچوڑ لینا چاہتے تھے اور ابھی تک رقص کر رہے تھے۔ اندو بھی ان میں شامل تھی۔ میں نے دیکھا' اس نے اپنا پارٹنر بدل لیا تھا البتہ ڈھونڈنے پر بھی مجھے راج کہیں نظر نہیں آیا' شاید وہ نیچے چلا گیا تھا۔ بوٹ اب منزل پر واپس پہنچ چکی تھی اور سارے منظر پیچھے رہ گئے تھے۔ لوگ اتر کر اپنی کاروں کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لوگ تیزی سے انڈر گراؤنڈ کی طرف دوڑ رہے تھے کہ آخری ٹرین مس نہ ہو جائے۔

ہم خاموش بوٹ سے اترے اور لندن برج تک آئے۔ اندو خاموش تھی' وہ ایک لفظ نہیں بولی۔ میں نے دیکھا' راج تیزی سے اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اندو کا انتظار نہیں کیا اور پاگلوں کی طرح کاریوں اسٹارٹ کی تھی جیسے آگے جا کر کہیں ٹکرا ہی دے گا۔

چپ چاپ تھکی ہوئی روشنی میں اندو کا چہرہ بدلا ہوا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کا خلا اور زیادہ گہرا ہو گیا ہو۔ اس کی ہمیشہ کی طرح کھنکتی ہوئی چوڑیوں جیسی ہنسی بوٹ پر کہیں رہ گئی تھی۔

دوسرے لمحے وہ ٹیکسی ہائر کر رہی تھی جیسے ساری تفریح خاک میں مل گئی تھی۔

اس باقی ماندہ رات میں گھر جا کر پریشان ہی رہی اور سو نہ سکی۔ میں ان آوازوں اور شور وغل کو سن رہی تھی جو اندو اور راج کے درمیان ہو رہا تھا۔ لاکھ ذہن کے کیواڑوں کو بھینچتی مگر ہوا کتنی تیز تھی اور پائیں باغ میں بلیاں رو رہی تھیں' لڑ

غزل

کہاں کوئی بدن کا بوجھ اُتارے
سمندر کیا ہوئے تیرے کنارے

یہ پانی اب مُقدر ہو چکا ہے
مگر جو ساحلوں پر دِن گزارے

یہاں تو دُوسرا کوئی نہیں ہے
کوئی اپنے سوا کس کو پُکارے

رواں ہیں آخرِ شب کے مُسافر
مگر اب ڈُوبتے جاتے ہیں تارے

ظفر یہ باوباں ہی جانتا ہے
ہواؤں نے کئے ہیں کیا اشارے

صابر ظفر

رہی تھیں۔

مجھے لگا جیسے یہ سب تیسری دنیا کی عورتیں ہیں' یہ ہم سب ہیں' ہم سب رو رہی ہیں' کتنی صدیاں گزر گئیں' آسمان پر کتنے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے ہیں اور سب کے سب آنسو بن گئے ہیں' سفید چمکتے ہوئے۔ اب تک نجانے کتنے آنسو بہے ہوں گے' کتنے ستارے ٹوٹے ہوں گے اور آسمان پر سجے ہوں گے؟

دوسرے دن چھٹی تھی' بچوں اور گھر کے کاموں میں لگ کر میرا ذہن اندو کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔ شام میں اسے ٹیلی فون کرتی رہی' گھنٹی بجتی رہی' لگتا تھا' کوئی گھر میں نہیں ہے۔ دوسرے دن وہ آفس بھی نہیں آئی۔

اللہ جانے' کیا ہوا تھا اسے؟ دل خدشات سے بھرا تھا۔ میں اس کے کسی عزیز کو بھی نہیں جانتی تھی' جانے وہ کس حال میں ہوگی' مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔

اسی شام ایوننگ اسٹنڈرڈ میں ایک چھوٹی خبر دیکھی۔ اندو ویسٹ منسٹر ہسپتال میں تھی' راج نے اسے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا لیکن وہ بچ گئی تھی۔

میں نے سارے کام چھوڑے' تقریباً بھاگتے دوڑتے ٹرین' ٹیوب اور بسوں کا سفر کرتی ویسٹ منسٹر ہسپتال پہنچ گئی۔ ہسپتال کے سامنے والی ایک چھوٹی سی پھولوں کی دکان سے میں نے اس کے لیے گلاب خریدے۔ نجانے وہ کیسی ہوگی' بچے گی بھی یا نہیں اور اس کا بیٹا' اس کا کیا ہوگا؟

کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ مجھے سامنے والے پلنگ پر لیٹی نظر آئی۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی' یہ یقیناً ایک معجزہ ہے' وہ گلاب کی پتی کی طرح تر و تازہ لگ رہی تھی۔ شانے پر پٹی بندھی تھی اور سارا کمرہ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہنسی اور تکیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہی کلائی میں چھنکتی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کی کھنک' نجانے کتنی خون کی بوتلیں چڑھا کر انہوں نے مجھے بچالیا ہے' وہ بتا رہی تھی۔

''یہ سب تمہارا ہی کرا دھرا ہے۔'' میں نے کہا تھا۔ ''میں تو سمجھی......'' میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تم سمجھیں کہ مر جاؤں گی' یہی نا؟'' وہ پھر ہنسی۔ ''اطمینان رکھو' میں مروں گی نہیں۔''

''تم یہ پھول دیکھ رہی ہو' اتنے کہ ان کے لیے کمرے میں جگہ نہیں ہے' یہ سارے تحفے' یہ میرے بچے کے لیے بے شمار کھلونے' یہ سب کن لوگوں نے بھیجے ہیں' میں تو انہیں جانتی بھی نہیں' وہ سب میرے کون ہے' اس رشتہ سے پہلے میں کبھی واقف نہ تھی۔

میں اس کے پیچھے اس لیے بھاگ رہی تھی کہ سمجھتی تھی' میری خوشیاں اس کے دامن سے بندھی ہیں' یہ تو میرے اندر موجود تھیں۔ خزانے کی طرح میرے اندر چھپی تھیں' سو ہاتھ بڑھا کر میں نے انہیں لے لیا ہے۔ وہ کھڑکی سے باہر خلا میں گھورتی رہی پھر ایک دم جیسے اس کے پیر زمین پر آ گئے۔

''میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ بڑے پرسکون انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''میرا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے نا۔''

اور پھر وہی کلائی میں کانچ کی چوڑیوں جیسی کھنکتی ہوئی ہنسی جیسے کمرے میں دھنک کے ساتوں رنگ بکھر گئے ہوں۔

......☆☆......

اک ذرا سی غفلت

عائشہ سلطان

دنیا نے اس طرح سے ہے توڑا مرا یقیں
دریا پہ بھی گمان ہوا ہے سراب کا

گجرانوالہ سے [illegible] شعلہ ساماں تحریر

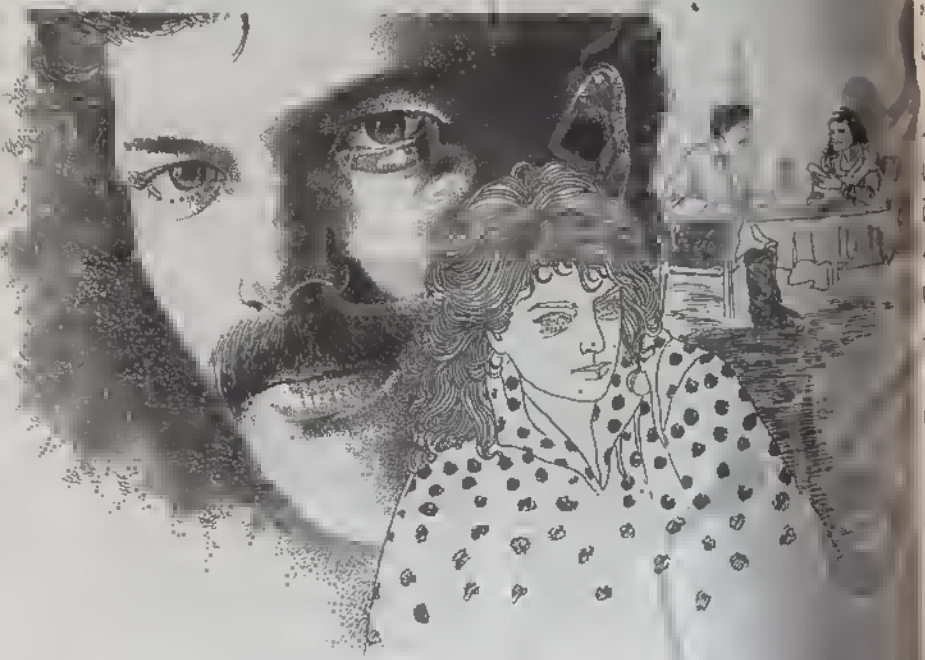

وہ گرمیوں کی سخت ترین دوپہر تھی۔ شائلہ کالج سے واپس گھر آ رہی تھی۔ اس کا کالج گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شائلہ کی امی اس پر بہت سختی کرتی تھیں اسی لیے کچھ گرمی کی شدت اور کچھ امی کا خوف تھا کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ جیسے ہی ایک گلی میں مڑنے لگی' اچانک سامنے آتی بائیک سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ بائیک چلاتے نوجوان نے فوراً بریک لگا دی تھی لیکن پھر بھی بائیک کا اگلا ٹائر شائلہ کے پاؤں پر چڑھ گیا جس سے اس کے پاؤں کا انگوٹھا زخمی ہو گیا تھا۔ نوجوان جلدی سے بائیک سے اترا۔

"سوری' سوری..... میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔"

"نہیں' شکریہ۔" شائلہ جلدی سے بولی۔

"دیکھیں' غلطی میری ہے اور میرا فرض ہے کہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں۔ آپ کو چوٹ لگی ہے۔ آخر ڈاکٹر کے پاس جانے میں حرج ہی کیا ہے؟"

"پہلے ہی مجھے مصیبت میں ڈال دیا' اب ایک اور مصیبت کھڑی کرنی ہے کیا؟" وہ زیرلب بڑبڑائی۔

"آپ نے کچھ کہا؟"

"جی نہیں۔" شائلہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور ٹشو سے پاؤں کا خون صاف کرنے لگی۔ ٹشو سرخ ہو گیا مگر خون رک ہی نہیں رہا تھا۔

"یہ..... اسی گلی میں میرا گھر ہے' آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔" نوجوان جلدی سے بولا۔

"جی نہیں' آ..... آپ..... کی مہربانی' میں کیوں جاؤں آپ کے گھر؟"

"اوہو' آپ غلط مت سمجھیں' اچھا' ایک منٹ رکیں' میں یہ سامنے دکان سے بینڈیج لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ نوجوان دکان کی جانب بڑھ اور تھوڑی دیر میں بینڈیج اور جوس کے پیکٹ ہمراہ واپس آیا۔

"پلیز' آپ یہ جوس پی لیں۔" اس نے جوس شائلہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا مگر اس نے انکار کر دیا حالانکہ گرمی بہت تھی اور اس کا دل بھی کر رہا تھا۔

"دیکھیے مس' لے لیجیے' گرمی بہت ہے' ویسے بھی آپ پسینے پسینے ہو گئی ہیں۔" اس نے جوس کا ڈبہ تھما لیا جبکہ نوجوان پاؤں پر بینڈیج کرنے لگا۔

"چلیں' میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔" بینڈیج کر کے اس نوجوان نے کہا۔

"میں چلی جاؤں گی' آپ کی مہربانی۔" شائلہ نے پریشانی سے گھڑی دیکھی۔ وہ کافی لیٹ ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک رکشہ قریب سے گزرا۔ اس نے فوراً رکشہ رکوایا اور اس میں بیٹھ گئی۔ وہ نوجوان تیزی سے اس کے پاس آیا۔

"پلیز' گھر پہنچ کر مجھے اپنی خیریت کی اطلاع کر دیجیے گا ورنہ میں پریشان رہوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا کارڈ شائلہ کو دیا۔ کارڈ پر اس کا نام محمد وقاص ملک لکھا تھا اور ساتھ ہی انجینئر آف ڈی اے ای فرسٹ ڈویژن لکھا تھا۔ یہ پڑھ کر وہ متاثر ہو گئی کہ وہ ایک انجینئر تھا جبکہ وہ تو اسے کوئی چھچھورا' لفنگا لڑکا سمجھ رہی تھی۔ بیس منٹ بعد وہ گھر پہنچ گئی تھی اور جیسے ہی رکشہ سے اتری' اماں گیٹ پر کھڑی تھیں۔

"کہاں تھی؟ پورے بیس منٹ لیٹ ہے؟" وہ خاموش رہی۔ "بیس منٹ لگتے ہیں تمہارے کالج سے گھر تک پھر مزید بیس منٹ کہاں گزارے ہیں تم نے؟" اماں کے استفسار پر وہ بے اختیار اپنے پاؤں کو دیکھنے لگی۔ اماں کی نظر بھی اس کے پاؤں پر پڑی۔

"ہائے..... کم بخت..... یہ کیا کر دیا تو نے؟"

"وہ..... انگوٹھا زخمی ہو گیا ہے' میرا پاؤں گلی میں پڑے پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔"

"کیا؟ اندھی تھی' دیکھ کے نہیں چل سکتی تھی؟ ایک اور مصیبت لے آئی۔ دھیان کہاں ہوتا ہے تیرا؟ پہلے ہی تیرا باپ خرچہ نہیں دیتا۔ ابھی کل تو بل جمع کروائے ہیں۔ اب تیری پٹیاں کہاں سے کرواؤں گی؟ چل جا کر پانی پی لے۔ باورچی خانے میں برتن پڑے ہیں' وہ بھی دھونے ہیں۔ تیرے چھوٹے بہن بھائی آتے ہوں گے۔" اماں کی جھڑکیوں پر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

شائلہ کے والد ایک مزدور تھے۔ ان کی معمولی مزدوری سے گھر کا گزارہ بمشکل ہوتا تھا۔ شائلہ نے جب میٹرک کیا تو اماں نے صاف کہہ دیا۔

"میٹرک کر لیا' بہت ہے۔ آج کل زیادہ پڑھائی نہیں دیکھی جاتی۔ لڑکی سگھڑ ہو' گھر سنبھالنا آتا ہو' حیا دار ہو' یہی دیکھا جاتا ہے۔ ویسے بھی ضرورت نہیں ہے زیادہ پڑھانے کا۔ لڑکیاں جتنا پڑھ جاتی ہیں' اتنا ہی ماں باپ کو چکر دے کر کالج کے بہانے گھومنے پھرنے جانے لگتی ہیں۔" شائلہ کو اماں کی باتوں پر رونا آ رہا تھا۔

"اماں.....! مجھ پر یقین نہیں ہے آپ کو؟"

"دیکھو' جب لڑکی بڑی ہو جاتی ہے تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے کہ اس پر نظر رکھیں' اس کا خیال رکھیں' جوانی بڑی بری ہوتی ہے' بندے کی خواہشیں بڑھنے لگتی ہیں اور وہ ان کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے پھر وہ نرم لہجے میں بولیں۔ "ٹھیک ہے' جہاں ہم نے تمہیں اتنا پڑھایا' وہاں دو جماعتیں اور پاس کرا دیں گے مگر خیال رکھنا' ذرا بھی کوئی ایسی ویسی خبر ملی' اسی دن گھر میں قید ہو جاؤ گی۔"

"امی! میں کبھی آپ کا بھروسہ نہیں توڑوں گی۔" اس نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔

یوں اسے آگے پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی جس پر وہ بے حد خوش تھی۔ وہ روز صبح تیار ہو کر کالج جاتی اور دوپہر میں وقت پر واپس آتی۔ کالج میں سب ہی اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے تھے۔ اس کی کلاس فیلوز اکثر کہتیں۔ "یار' تم اپنے چہرے پر کیا لگاتی ہو جو تمہاری اسکن اتنی دہائٹ ہے؟ ہمیں بھی بتا دو۔" یہ باتیں سن کر وہ خاموش رہتی اور سوچتی' 'ہم غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے لگانے کو۔'

جس دن سے اس نے کالج جانا شروع کیا تھا' امی نے بڑی سی چادر تھما دی۔ "پردے میں جانا ہے تو جاؤ ورنہ رہنے دو اور خبردار جو چادر ذرا بھی سر سے اتاری۔" یہ چادر دیکھ کر لڑکیاں اسے کہتیں۔

"یار' کیا تم آؤٹ فیشن کام کرتی ہو' ہر وقت چادر لیے رہتی ہو۔ ہمیں دیکھو۔" وہ بس خاموش رہتی۔ ان باتوں سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتی تھی۔ وہ امی کے ڈر کی وجہ سے سیدھی کالج جاتی اور سیدھی آتی حالانکہ کالج میں اس کی دوستوں کے بھائی انہیں گاڑیوں میں لینے آتے تھے۔ وہ اسے بھی بولتیں کہ ہمارے ساتھ چلو' ہم تمہیں گھر تک چھوڑ دیں گے۔ تمہاری امی کو پتا نہیں چلے گا لیکن وہ صاف منع کر دیتی اور پیدل ہی گھر آ جاتی۔ اماں کی بے جا سختیوں کی وجہ سے وہ انہیں اپنی سوتیلی ماں سمجھنے لگی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات کو پیاس کی وجہ سے آنکھ کھلتی اور وہ پانی پی کر مڑتی تو پیچھے اماں کھڑی ہوتی تھیں اور وہ خاموشی سے جا کر لیٹ جاتی۔ اب اسے یہ احساس ہونے

لگا تھا کہ دوسری لڑکیاں فیشن کرتی ہیں اور وہ سادہ کپڑوں میں رہتی ہے۔ اماں کی سختی کے باعث اس نے کبھی کسی لڑکے کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا مگر اس روز شائلہ کی وقاص سے ٹکر ہوئی تو اسے پہلی بار کوئی لڑکا اچھا لگا تھا۔ اتفاق سے اگلے دن ہی کالج کی چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ چھٹیوں کے بعد سالانہ امتحانات تھے لہٰذا وہ اپنی چوٹ وغیرہ بھول بھال کر پیپرز کی تیاری میں لگ گئی۔ پیپرز دینے وہ اپنی دوست حمنہ کے ساتھ جاتی تھی جو اسی کی گلی میں رہتی تھی۔ سینٹر چونکہ دور لگا تھا اس لیے شائلہ کی امی نے رکشہ لگوا دیا کہ لڑکیاں ہیں' اکیلی کیسے جائیں گی؟

اس روز بھی دونوں پیپرز دینے جا رہی تھیں کہ رکشہ ٹریفک جام میں پھنس گیا۔ وہ رکشے میں بیٹھی اپنے ہونے والے پیپر کی سوچوں میں مشغول تھی کہ حمنہ نے کہا۔ ''شائلہ' دیکھو یہ بائیک والا کب سے تمہیں گھور رہا ہے۔'' اس نے جیسے ہی گردن گھما کر دیکھا' وہ وقاص تھا جو اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''آپ کیسی ہیں؟ اینی وے' آپ نے مجھے اپنی خیریت نہیں بتائی؟ آپ کو معلوم ہے' میں کتنا پریشان ہو رہا تھا۔ ویسے ایک بات بتاؤں' آپ کو دیکھ کر لگتا ہے.....'' اسی وقت اس کا موبائل بج اٹھا اور وہ کال ریسیو کر کے بات کرنے لگا۔

''تم انہیں جانتی ہو؟ تمہارا کوئی دیوانہ لگتا ہے جبھی تو کہہ رہا تھا کہ تمہیں دیکھ کر لگتا ہے..... پھر کم بخت کال آ گئی.....'' حمنہ نے اس سے پوچھا تو وہ گھبرا گئی اور تیزی سے بولی۔

''نہیں حمنہ.....! ایسا نہیں ہے۔'' پھر اس نے مختصراً اسے تمام بات بتائی۔

''اوہ..... میں تو سمجھی' ویسے مجھے لگتا ہے' یہ تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ تم ہو ہی اتنی اچھی۔''

''حمنہ! پلیز' ہم..... ہم..... ہم.....''

''شرم آ رہی ہے جناب کو۔'' اس جملے پر وہ نے مڑ کر دیکھا تو وقاص جانے کب سے اُن باتیں سن رہا تھا۔ اس کے یوں دیکھنے پر وہ مسکرا لگا۔ اتنے میں رکشہ چل پڑا۔ وقاص بھی بائیک رکشے کے آگے چلنے لگا۔ سینٹر پہنچ کر وہ رکشہ سے اتریں تو وقاص کی بائیک اُن کے بالکل قریب آ رکی۔

''وقاص بھائی' کیا پھر ان کا ایکسیڈنٹ کرنے ارادہ ہے؟'' حمنہ کے اس جملے پر شائلہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''چلو شکر ہے' آپ نے مجھے اپنا بھائی تو مانا۔'' وقاص بولا۔ ''اور ایک آپ کی دوست ہیں' بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔''

''نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ وہ..... میں لوگوں سے کم ہی بات کرتی ہوں۔'' اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''وقاص بھائی' وہ..... آپ اُس وقت کیا کہہ رہے تھے کہ شائلہ کو دیکھ کر لگ رہا ہے.....؟''

''ہاں' یہی کہ آپ کا پیپر ہے اور آپ پیپر دینے جا رہی ہیں۔''

''اوہ اچھا' میں سمجھی کہ.....''

''ہائیں' آپ کیا سمجھیں؟'' وقاص کے جملے پر تینوں مسکرا دیئے۔ حمنہ کی عادت تھی' وہ بہت جلد گھل مل جاتی تھی۔

''حمنہ' ابھی لڑکوں کا رش کم ہو جائے تو ہم اپنا روم نمبر دیکھ لیتے ہیں کہ کہاں ہے؟'' شائلہ نے کہا۔

''لائیں' مجھے رول نمبر دیں' میں ڈھونڈ کے آتا ہوں۔'' وہ حمنہ سے مخاطب ہوا تھا۔

''ہم ڈھونڈ لیں گے' شکریہ۔''

''ارے' یہ کیا بات ہوئی' تم مجھے بھائی بھی کہتی ہو اور پھر یہ غیریت؟''

''اچھا وقاص بھیا' یہ لیں رول نمبر اور جلدی سے کلاس ڈھونڈیں۔'' پھر وقاص دس منٹ میں روم نمبر ڈھونڈ کے لے آیا۔ پیپرز کے دوران وقاص روز سینٹر آتا اور پیپر کے بعد دونوں کو اپنی بائیک پر لے جاتا۔ اس مختصر سے عرصے میں وہ وقاص کو دل دے بیٹھی تھی پھر پیپرز ختم ہو گئے اور شائلہ گھر بیٹھ گئی' تاہم اب اس کا گھر میں بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ وہ جلدی جلدی گھر کا کام ختم کر کے وقاص کے بارے میں سوچنے لگتی تھی۔ جیسے تیسے دن گزرے اور شائلہ کا کالج جانا دوبارہ شروع ہو گیا' یوں وقاص سے ملاقاتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ وہ اکثر کالج آ جاتا۔ اس میل ملاپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وقاص نے ایک دن اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ وقاص کی زبانی اقرار سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہا تھا کہ کوئی ہے جو اسے چاہنے لگا ہے۔ اس دن وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر آئی اور اپنے کمرے میں آ کر کنڈی لگا لی اور وقاص کے سپنوں میں کھو گئی۔

دوسرے دن پاؤں میں اچانک اٹھنے والے درد کی وجہ سے وہ کالج نہیں جا سکی۔ وقاص کی بائیک سے زخمی ہونے والے پاؤں کے انگوٹھے میں پس (puss) پڑ گئی تھی۔ غربت کے باعث شائلہ نے اپنا پاؤں کسی اچھے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا تھا اس لیے گھر میں اس کی ای پٹی کر دیا کرتی تھیں چنانچہ تکلیف کے سبب وہ کئی دن کالج نہیں جا سکی۔ دوسری طرف وقاص سمجھا کہ اس کے پرپوز کرنے کی وجہ سے شائلہ شاید میں کالج نہیں آ رہی یا پھر ان دونوں کے تعلق کے بارے میں شائلہ کی امی کو علم ہو گیا ہے۔ اس کے دل میں عجیب عجیب وسوسے آ رہے تھے لہٰذا اس نے اپنی امی کو شائلہ کے متعلق سب کچھ بتا دیا اور پھر اپنی امی کو کالج کی ٹیچر کے ہمراہ شائلہ کے گھر بھیج دیا۔ شائلہ کی امی اس کی کالج کی ٹیچر سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ کالج ٹیچر مس ریحانہ نے وقاص کی امی کو اپنی بہن کے طور پر متعارف کروایا تھا۔ وقاص کی امی جاتے ہوئے شائلہ کو کچھ پیسے دے گئیں اور شائلہ کی امی کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔

کچھ دن میں شائلہ کے پاؤں کو کچھ افاقہ ہوا تو اس کی امی نے کہا۔ ''شائلہ بیٹا! تمہاری مس کی بہن کے ہاں چلیں؟ وہ ہمارے گھر آئی تھیں تو ہمیں بھی تو جانا چاہیے۔ تمہیں اُن کا گھر معلوم ہے؟''

''جی امی.....! مجھے معلوم ہے۔ اکثر مس کو اُن کے گھر جاتے دیکھا ہے۔ کالج کے راستے میں ہی ہے۔'' شائلہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور تیار ہونے لگی پھر دونوں ماں بیٹی' وقاص کے گھر چلے گئے۔ اس وقت وقاص گھر پر نہیں تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر بیٹھ کر آ گئے۔ یوں شائلہ اور وقاص کی امی کی گہری دوستی ہو گئی پھر ایک روز وقاص کی امی شائلہ کا رشتہ لے کر اس کے گھر آ گئیں۔ شائلہ کی امی کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ اب دونوں گھرانوں میں خاصا میل جول ہو گیا تھا۔ اس طرح وقاص اور شائلہ کی منگنی ہو گئی۔ دونوں بہت خوش تھے کہ اُن کی محبت ایک خاص رشتہ میں بندھ گئی تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایک دن شائلہ کے ابو کا ایک ٹریفک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد شائلہ کو شدید جھٹکا لگا کیونکہ وہ اپنے ابو سے بہت محبت کرتی تھی۔ ایسے میں اسے وقاص نے سہارا دیا۔ انہی دنوں اس کی ٹانگ میں شدید درد ہونے لگا' یہ درد اتنا ناقابلِ برداشت تھا کہ اسے ہاسپٹل لے جانا پڑا جہاں اسے ایڈمٹ کر لیا گیا اور اس کے مختلف ٹیسٹ

غزل

بدن تو جل گئے سائے بچا لیے ہم نے
جہاں بھی دھوپ ملی گھر بنا لیے ہم نے

اس امتحان میں سنگین کس طرح اٹھتی
دعا کے واسطے جب ہاتھ اٹھا لیے ہم نے

کٹھن تھی شرطِ رہِ مستقیم کیا کرتے
ہر ایک موڑ پہ کتبے سجا لیے ہم نے

ہمارے بس میں کہاں تھا کہ ہم لہو دیتے
یہی بہت ہے کہ آنسو بہا لیے ہم نے

سمندروں کی مسافت پہ جن کو جانا تھا
وہ بادبان سرِ ساحل جلا لیے ہم نے

بڑے تپاک سے کچھ لوگ ملنے آئے تھے
بڑے خلوص سے دشمن بنا لیے ہم نے

محسن بھوپالی

وغیرہ بھی ہوئے۔ اس کی تکلیف اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی جس کی وجہ سے بار بار اسے ڈرپ لگ رہی تھی۔ دو دن بعد اس کی رپورٹس آ گئیں۔ ایک ہولناک انکشاف ہوا' ڈاکٹر نے بتایا کہ زخم جو اس کے انگوٹھے پر لگا تھا' وہ وقتی طور پر تو ٹھیک ہو گیا تھا لیکن اس میں پس پڑ گئی تھی اور مناسب care نہ ہونے کی وجہ سے وہ پس پوری ٹانگ میں پھیل گئی اور پھر مزید لاپروائی کے سبب یہ پس کسی طرح سے جگر میں چلی گئی اور وہ کینسر کی شکل اختیار کر گئی۔ جگر کے کینسر میں مریض کے بچنے کے بہت کم چانسز ہوتے ہیں لہٰذا شائلہ کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ ڈاکٹر کی زبانی یہ سب سن کر وقاص سکتے کی کیفیت میں رہ گیا اور بھاگا بھاگا شائلہ کے پاس آیا'

''شائلہ......! مجھے معاف کر دو پلیز شائلہ......! میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ شائلہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''کیا ہوا وقاص؟ میں ٹھیک ہو جاؤں گی وقاص' پھر ہماری شادی ہو گی۔ میں لال شرارہ پہنوں گی۔'' وقاص ڈبڈبائی آنکھوں سے شائلہ کو دیکھ رہا تھا۔ ''وقاص' ڈاکٹر آئے تھے' وہ کہہ رہے تھے' میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔ پر تم تو ایسے رونے لگے جیسے میں ہمیشہ کے لیے کہیں چلی جاؤں گی۔''

''نہیں...... نہیں...... پلیز...... ایسا نہیں بولو پلیز......'' وقاص تڑپ اٹھا۔ ''مجھے معاف کر دو پلیز' کاش میری بائیک تمہارے پاؤں پہ نہ چڑھی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

''اوہو اب چھوڑو بھی' میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی پھر ہمیں اپنی شادی کی تیاری بھی تو کرنی

ہے نا۔'' وقاص اسے حسرت سے دیکھنے لگا کہ شائلہ کو یہ خبر نہیں تھی۔

شائلہ کی امی کو جب پتہ چلا کہ اس کی بیماری بہت بڑھ گئی ہے تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں' تب شائلہ کو بھی پتہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ اب وقاص تمام دن شائلہ کے پاس رہتا اور اس کے غم میں اس نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا تھا۔ شائلہ کی بیماری نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت سوچوں میں گم رہنے لگا تھا اور ان ہی سوچوں کے سبب ایک دن اس کے سر میں شدید درد اٹھا۔ حالت اتنی بگڑی کہ اسے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر دیا گیا اور ڈاکٹر نے آپریشن کا کہہ دیا مگر آپریشن کے دوران ہی وہ زندگی ہار گیا۔ شائلہ کی تو دنیا ہی ختم ہو گئی...... چند دن پہلے اسے جس زندگی سے محبت ہو گئی تھی' اب اسی سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وقاص کے بعد اس کی زندگی ویران ہو گئی تھی۔ وقاص کی موت کے تیسرے دن وہ ہاسپٹل سے تھوڑی دیر کے لیے چھٹی لے کر اپنی امی کے ہمراہ بمشکل وقاص کے گھر گئی اور وقاص کی امی کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''امی......! وقاص چلا گیا ہمیں چھوڑ کر' اب میں کیا کروں؟''

وقاص کی امی نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''دفع ہو جاؤ...... یہاں کیا لینے آئی ہو؟ ڈائن...... کھا گئی میرے بیٹے کو...... اب سکون مل گیا تجھے؟''

''م...... مم...... میں نے کیا کیا ہے؟'' شائلہ نے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں ہاں' تو نے تو کچھ نہیں کیا' سب میں نے کیا ہے۔ جس دن سے میرے بیٹے نے تجھے دیکھا تھا' پاگل ہو گیا تھا تیرے لیے' مرتا نہیں تو کیا کرتا؟''

''بس...... بس...... کرو مائرہ بہن......! مارا تو تمہارے بیٹے نے ہے میری پھول جیسی بیٹی کو ہسپتال پہنچا دیا......'' اس طرح وقاص اور شائلہ کی امی میں لڑائی شروع ہو گئی۔ شائلہ آنکھوں میں آنسو بھرے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وقاص کی امی نے شائلہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

''بیٹا......! اب اس گھر کو بھول جاؤ......'' اس کی ماں نے بیٹی کو سمجھایا۔

''امی......! میں نے وقاص سے محبت کی تھی' مرنا تو مجھے تھا لیکن میری جگہ وقاص چلا گیا۔ میں بدنصیب ہوں......''

''نہیں میری بچی......! تو' تو بڑی بھاگوں والی ہے۔''

''نہیں...... میں بدنصیب ہوں۔ میرے ابو بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب وقاص بھی چلا گیا۔ میں جس سے محبت کرتی ہوں' وہ چلا جاتا ہے۔'' دونوں ماں بیٹیاں چلتی ہوئی سڑک پر آ گئی تھیں۔ ''اماں......! میں بھی چلی جاؤں گی...... ہاں' میں بھی چلی جاؤں گی......'' یہ کہتے ہوئے وہ بھاگتی ہوئی بیچ سڑک پر آ گئی...... وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی' اسی وقت سامنے سے آنے والا ڈمپر اسے کچلتا ہوا آگے نکل گیا اور شائلہ کی کربناک چیخ گونج کر رہ گئی۔ اس کا بے جان وجود خون میں لت پت پڑا تھا۔ یوں دو چاہنے والے دنیا سے چلے گئے۔

ادھر وقاص کے گھر میں اس کا سوئم ہو رہا تھا اور دوسری طرف شائلہ کی میت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی لاپروائی نے دو چاہنے والوں کی جان لے لی۔ دو گھر ویران ہو گئے۔ ساری فضا سوگوار تھی۔

......☆☆......

قسمت کا چکر

رئیسہ خالد

زندگانی کے سب نشیب و فراز
حلقہ چشم تر میں رہتے ہیں

اسلام آباد سے محترمہ [illegible]

اُس کا نام پیاری تھا لیکن وہ صرف نام کی ہی نہیں بلکہ حقیقت میں بہت پیاری تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اگرچہ اس کا رنگ بہت گورا نہیں تھا لیکن چہرے پر ایسی کشش تھی کہ نظر ہٹتی نہیں تھی' شاید اسی لیے اس کے والدین نے اس کا نام پیاری رکھا تھا۔

لمبے سنہرے بال' بڑی بڑی غزالی آنکھیں' سرو قد غرض کہ وہ ہر لحاظ سے پیاری تھی لیکن وہ کسی بڑے گھر میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک نوکرانی کی بیٹی تھی اور خود بھی ایک نوکرانی' ایک خدمت گار تھی۔ اس کا مزدور باپ کئی سال پہلے مزدوری کرتے ہوئے سیڑھیوں سے پھسل کر چل بسا تھا۔ اُس وقت پیاری کی عمر پانچ سال تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں اور بھی تھیں جن کی شادیاں باپ کی زندگی میں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے گھر میں ہنسی خوشی زندگی کے دن بتا رہی تھیں۔ ایک بھائی بھی تھا مگر نہ ہونے کے برابر۔ وہ کئی سال پہلے باپ کی زندگی میں ہی گھر والوں سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا تھا' اب اُس کا کوئی اَتا پتا نہ تھا۔ اس کی بوڑھی ماں پہلے بھی نوکری کرتی تھی لیکن اب تو دن رات کام کر کے بھی گزر بسر بہ مشکل ہوتا تھا۔ اسی کسمپرسی کے باعث اس نے پیاری کو ایک امیر کبیر گھرانے میں نوکری پر لگا دیا تھا۔ اُس وقت تک اُس کی عمر دس سال ہو چکی تھی۔ جہاں اس کی ماں نے اسے نوکری پر لگایا تھا' وہ گھرانا شہر کے چوٹی کے گھرانوں میں سے تھا۔ دولت کے ساتھ شرافت بھی اس معزز گھرانے کا خاصا تھی۔ گھر میں بچوں کی ریل پیل تھی۔ گاؤں میں اُن کی کافی زمینیں تھیں۔ صاحب تو بہت بڑے گورنمنٹ افسر تھے لیکن بیگم صاحبہ کو اکثر زمینوں کے کام کے سلسلے میں گاؤں جانا پڑتا تھا۔ پیاری بہت سمجھدار اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔ اب وہ دن رات اسی کوٹھی میں رہنے لگی تھی۔ اس کی ماں شروع شروع میں اسے اکثر ملنے آ جاتی تھی۔ پیاری کو کچھ پتا نہ تھا کہ اس کی ماں اس کی کتنی تنخواہ وصول کرتی ہے' تاہم وہ وہاں بہت خوش تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ بہت اچھی جگہ رہتی ہے۔ بیگم صاحبہ کی ایک بیٹی اس کی ہم عمر تھی جس کی خوب صورت فراکیں' سوئٹر اور جوتے کچھ دن استعمال کے بعد پیاری کو مل جاتے تھے۔ انہیں پہن کر وہ بہت فخر محسوس کرتی تھی۔ سال میں عید' بقرعید پر نئے جوڑے اور نئے چپل بھی مل جاتے۔ پیاری کے ذمے کوئی خاص کام بھی نہ تھا' صرف چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال' انہیں کھلانا' سنبھالنا اور اسکول جانے والے بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجنا' اسکول سے واپسی پر اُن کی یونیفارم بدل کر دوسرے کپڑے پہنانا اور انہیں کھلا پلا کر آرام کرنے کے لیے کمرے میں لے جانا' شام کو تیار کر کے لان میں اُن کے ساتھ کھیلنا۔ اُسے ان کاموں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ گھر والے بھی اس کا خاص خیال رکھتے تھے کیونکہ بچے ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

وہ بچوں کی صفائی ستھرائی کا بھی خیال رکھتی تھی اور اسے خود بھی صاف ستھرا رہنا پڑتا تھا کیونکہ یہ بیگم صاحبہ کا حکم تھا کہ وہ ہمیشہ صاف کپڑے پہنے' بالوں میں روز کنگھی کرے۔ اسے کنگھی' تولیا' صابن' شیمپو وغیرہ بھی الگ سے دیے جاتے تھے۔

اسی طرح ماہ و سال گزرتے گئے۔ وہ کوٹھی کے امیر کبیر بچوں کے ساتھ بڑی ہوتی گئی۔ پیاری اب سترہ سال کی ہونے والی تھی۔ اب وہ شباب کے دور میں داخل ہوچکی تھی' اس پر جوانی کی بہار خوب آئی تھی' وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے والے حسن کی مالک بن گئی تھی۔ اب اس کے کام کی نوعیت بھی بدل چکی تھی کیونکہ بچے بھی بڑے ہوچکے تھے۔ اب اس کے ذمے کپڑے دھونے' گھر کی صفائی اور استری کا کام لگا دیا گیا تھا پھر وہ بڑے' چھوٹے بچوں کی نگراں بھی بن گئی۔ گھر میں نوکروں اور ماسیوں کی کمی نہ تھی۔ کئی نوکر اور ماسیاں دوسرے کاموں پر مامور تھیں۔ اس کے ذمہ کوئی بڑا کام نہ تھا۔ چھوٹے بچوں کے کام کرتے کرتے وہ بڑی ہوتی گئی اور ساتھ اس کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ گھر میں آنے والے لوگ اسے اس گھر کا ہی فرد سمجھتے تھے کیونکہ صورت شکل' پہننے اوڑھنے اور رہن سہن کے لحاظ سے وہ کہیں سے بھی نوکرانی نہیں لگتی تھی۔ وہ حسین دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔

اب وہ زیادہ تر بیگم صاحبہ کی خدمت انجام دیا کرتی اور رات کو ان ہی کے کمرے میں قالین پر سوجاتی۔ سردیوں میں کمرا بڑے سے ہیٹر سے گرم ہوتا تو گرمیوں میں .A.C سے ٹھنڈا رکھا جاتا اسی لیے پیاری کو کبھی سردی' گرمی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی کہ اس کی زندگی کے پانی میں ہلچل سی مچی۔ بیگم صاحبہ اس کی خوب صورتی سے خاصی خوف زدہ رہتی تھی کیونکہ کئی رشتے ان کی بیٹی کی بجائے پیاری کے لیے آگئے تھے۔ لوگ ان کی بیٹی کو دیکھنے آتے اور پیاری کو پسند کر جاتے۔

ایک دن اس کی ماں' بیگم صاحبہ کے پاس آئی۔ وہ چاہتی تھی کہ پیاری کی شادی کر دی جائے۔ اس نے بیگم صاحبہ سے اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہا اور اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ بیگم صاحبہ خود یہی چاہتی تھیں' انہوں نے اس کی ماں کو رشتہ تلاش کرنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ شادی پر جو خرچ آئے گا' وہ کریں گی لیکن رشتہ اسے خود تلاش کرنا ہوگا۔

ماں نے اس کے لیے رمضان نامی شخص کا رشتہ تلاش کیا اور لڑکے والوں کو ہاں کردی۔ رمضان ایک قلی تھا جو اسٹیشن پر مزدوری کرتا تھا۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر جتنی آمدنی ہوسکتی تھی' وہ اس کی تھی۔ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا' معمولی صورت شکل کا' عمر میں بھی پیاری سے بڑا تھا البتہ اس کا کمرے کا اپنا گھر ضرور تھا جہاں وہ اپنی ماں اور کنواری بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ پیاری کی ماں نے بس یہی خوبی دیکھی تھی کہ لڑکے کا اپنا گھر ہے۔

بیگم صاحبہ اس رشتے پر راضی نہیں تھیں لیکن اس کی ماں اپنے فیصلے پر قائم تھی' اس نے کسی کی نہیں سنی۔ اس کی نظر میں یہ بہت اچھا اور مناسب رشتہ تھا۔ ظاہر ہے جب ماں راضی تھی تو بیگم صاحبہ نے بھی اس رشتے کو قبول کرلیا۔

پھر پیاری کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شادی کیا تھی' ایک فرض تھا جو نبھایا جا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ سے جو کچھ بن پڑا اسے جہیز میں دیا۔ چند جوڑے کپڑے' کچھ برتن' ایک پلنگ' ایک چادریں اور ایسی چھوٹی موٹی چیزیں جہیز کے نام پر اس کے ساتھ بھیج دی گئیں۔ بارات کی خاطر مدارات بیگم صاحبہ کی طرف سے ہوئی اور اس طرح پیاری پیا دیس سدھار گئی۔

حجلۂ عروسی میں جب اُس نے شوہر کو دیکھا تو دھچکا لگا کیونکہ وہ کسی طور بھی اُس کے لائق نہ تھا' صورت شکل معمولی' عمر میں اس سے کافی بڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی رہ گئی۔ اس کے خواب چکنا چور ہوگئے تھے۔ سہاگ کی وہ رات پیاری کی جیسے کانٹوں کی سیج پر گزری تھی۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ کمرا کہیں سے بھی حجلۂ عروسی نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر خون کے آنسو رو رہی تھی۔ کیا دلہنوں کا کمرا ایسا ہوتا ہے؟ نہ پھول' نہ چیتاں' نہ کوئی سجاوٹ۔ گھر کے نام پر دو چھوٹے چھوٹے کمرے' کچا صحن اور پردے کو گھیر کر بنایا گیا غسل خانہ' کچن کے نام پر ایک چبوترہ جہاں چند معمولی برتن اور مٹی کے تیل کا ایک چولہا رکھا ہوا تھا۔ یہ کُل کائنات تھی اس گھر کی جہاں اسے اب ہمیشہ رہنا تھا۔

صبح ہوتے ہی اس کی نند کمرے سے باہر کچے فرش کو گھیر کر بنے غسل خانے میں پانی کی بالٹی رکھ کر اسے نہانے کے لیے لے جانے آئی تو وہ حیرت سے غسل خانے کو دیکھتی رہی۔ وہ تو ایک مدت سے ایسے غسل خانے میں نہاتی رہی تھی جہاں چکنے ٹائلز' چمکیلے بیسن اور فوارہ ہوتا تھا۔ اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے رہے گی؟ اس کی زندگی کس طرح کٹے گی؟ اس کا جی چاہا کہ یہاں سے بھاگ جائے اور اسی دنیا میں واپس چلی جائے۔ یہاں تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ وہ جن چیزوں کی عادی ہوچکی تھی' اب ان کا وہ تصور ہی کرسکتی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ دنیا اس کی ہے یا وہ دنیا؟ وہاں تو وہ ملازمہ تھی' یہاں مالکہ ہے لیکن ملازمہ کا احساس تو اسے کسی نے دلایا ہی نہیں تھا' اسے تو وہ اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔

سارا دن وہ گم صم رہی۔ ایک عجیب سی بے زاری کا احساس اس پر چھایا رہا۔ یہاں کی ہر چیز اس کے معیار کی سطح سے کم تھی۔ اس سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر چیز الٹ پلٹ دے' توڑ پھوڑ مچا دے۔ اس نے تو کیسی کیسی دلہنیں دیکھی تھیں جو قیمتی زیورات اور کامدار جوڑوں سے لدی پھندی ہوتی تھیں لیکن خوبصورتی میں اس سے کہیں کم۔ وہ سوچ رہی تھی۔ 'میری قسمت ایسی کیوں؟' لیکن پھر خیال آیا کہ میں کسی امیر زادے یا رئیس کی بیٹی تو ہوں نہیں' میں تو ایک غریب بیوہ کی بیٹی ہوں جو ایک ملازمہ ہے'

پڑتال

کسی معروضی امتحان میں ایک طالب علم ہر سوال پر سکہ اچھالتا اور پرچے پر اُس کے مطابق صحیح یا غلط کا نشان لگا دیتا۔ ممتحن کافی دیر سے اُس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ طالب علم جب پرچہ مکمل کرچکا تو اُس نے یہی سلسلہ پھر سے شروع کردیا۔ ممتحن سے رہا نہ گیا۔

"اب تم کیا کر رہے ہو؟"

"اپنے جواب چیک کر رہا ہوں۔" طالب علم نے جواب دیا۔

تعاون۔ ڈاکٹر احمد نصیر

نوکرانی ہے جس کا باپ بھی مزدور تھا' جس کا کوئی بھائی بھی نہیں۔ اسے بڑے گھر کی بیٹی کی طرح سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ غریب تھی اور غریب ہی رہے گی۔ اللہ نے شکل صورت اچھی دی لیکن نصیب اچھا نہیں دیا۔ اب اسے خود کو اسی ماحول میں ڈھالنا تھا' چنانچہ اس نے عہد کرلیا کہ وہ حقیقت کا سامنا کرے گی خواہ اس کے لیے اسے خود پر کتنا بھی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہاں اس کا چاہنے والا شوہر ہے' ماں سے بڑھ کر پیار کرنے والی ساس ہے' وہ اپنا موازنہ اُس بڑے گھر سے کیوں کررہی ہے؟ اُس نے ہزاروں دلیلیں دے کر خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

شام کو اُس نے مسکرا کر شوہر کو بھی دیکھا اور کھانا بھی شوق سے کھایا۔ گھر اور شوہر کی خوشی کے لیے اُس نے خود کو کتنے فریب اور دھوکے دیئے اور اپنے اوپر خول چڑھانے میں کامیاب ہوگئی۔

ماں جب اُس سے ملنے آئی تو اُسے بڑے پیار سے گلے لگایا اور اُسے خوش دیکھ کر سوچنے لگی۔ 'میں نے بیٹی کے حق میں جو فیصلہ کیا' وہ صحیح تھا۔' اُس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اُس نے اپنی بیٹی کو ایک اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہ دیا ہے۔

اس طرح زندگی کے کئی سال گزر گئے' وہ کبھی پلٹ کر اُس گھر میں واپس نہیں گئی جہاں اُس نے اپنی زندگی کا بہترین دیا دگار وقت گزارا تھا۔ اب وہ چار بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ بچوں کو خوب پڑھا لکھا کر ایک اچھا انسان بنائے گی اسی لیے اُس نے بڑی بچیوں کو قریبی اسکول میں داخل بھی کرادیا تھا۔

لیکن اُس کا شوہر ایک مزدور تھا جس کی زندگی بہت کٹھن ہوتی ہے' بوجھ اٹھا اٹھا کر وہ بہت تھک چکا تھا۔ ان ہی حالات میں اُس نے دو بہنوں کی شادیاں بھی کیں۔ گھر کا خرچ بھی چلاتا رہا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اب اُس سے زیادہ محنت نہیں ہوپاتی تھی' تاہم پیاری کو کام کرنے کے لیے اُس نے کبھی باہر نہیں بھیجا تھا۔ وہ پیاری سے بہت پیار کرتا تھا اور پیاری کو خوش دیکھنے کے لیے وہ اپنی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام کرتا تھا لیکن ایک قلی کی کتنی آمدنی ہوسکتی ہے؟ آخر ایک دن اس شدید محنت نے گل کھلایا' بوجھ اٹھا اٹھا کر اُسے ٹی بی ہوگئی۔ اُن دنوں ٹی بی کا علاج اتنا آسان بھی نہ تھا اور مہنگا بھی بہت تھا۔ رمضان کی آمدنی تو تقریباً ختم ہی ہوچکی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ علاج ہوتا رہا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا مگر جاتے جاتے اپنی موذی بیماری پیاری کو منتقل کرگیا..... اب تو آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اس لیے مناسب علاج نہ ہونے کے باعث پیاری بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئی..... اب اُس کی بچیوں کی ذمے داری دادی پر آگئی۔ وہ بے چاری محنت مزدوری کرکے کسی طرح بچوں کو پالنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہ تھا کہ وہ چار چار بچیوں کی پرورش کرسکے اور آخر ایک روز اُس نے انہیں کسی نہ کسی بڑے گھر میں نوکری پر لگا دیا جس طرح اُن کی ماں پیاری کو لگایا گیا تھا۔ پیاری کے خواب تو بہت اونچے تھے لیکن اب پھر وہی کہانی دہرائی جانے والی تھی۔ پیاری نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ اُس کی بچیوں کی قسمت بھی اُس جیسی ہوگی۔

.....☆☆.....

کچھ تو کہا ہوتا

تسنیم منیر علوی

نفس نفس تھا قیامت نفس نفس ہے سکوں
غمِ تمام، سے پہلے غمِ تمام کے بعد

لاہور سے پہلی بار کہانی

ماسی زلیخا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں نے سامنے لگی وال کلاک پر نظر ڈالی' اف 8 بج چکے ہیں۔ پورا کچن الٹا پڑا ہے۔ میں نے برتن سنک میں ایسے ہی چھوڑ دیئے اور واپس بیڈروم آکر استری آن کردی۔ کل رات لائٹ کی آنکھ مچولی کی وجہ سے یہ کام بھی صبح کرنا پڑ رہا ہے۔ اسپتال کی گاڑی آنے والی ہے۔ شکر ہے' میں نے کیس ہسٹری تیار کر کے رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر آذر ٹائم کے بڑے پابند ہیں۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔ صبح پہلا راؤنڈ انہی کا ہے۔

میں جلدی سے کپڑے لے کر واش روم بھاگی۔ ذہن میرا اس سے بھی جلدی بھاگ رہا تھا اور وہ بھی ماسی زلیخا کی طرف' یہ تو کبھی عید بقر عید تک چھٹی نہیں کرتی' بیماری کی حالت میں بھی سر میں کپڑا باندھے ہانپتی کانپتی آجاتی۔ ''باجی' مجھے تیرے کام کی چھٹی کرنی۔ تو صبح صبح کام پر جاتی ہے' پھر تھکی ہوئی شام کو واپس آتی ہے اس لیے مجھے تو تیرے کام کو پہلے کرنا ہے۔'' وہ معصومیت سے کہتی۔

گاڑی کے ہارن نے خیالات کا سلسلہ منقطع کردیا اور میں دروازہ لاک کر کے وین میں جا بیٹھی۔

میں عرصہ تین سال سے کراچی کے ایک معیاری سیمی پرائیویٹ ہاسپٹل میں بحیثیت consultant ملازمت کررہی ہوں۔ یہاں کا ماحول اور ہاسپٹل کے مقابلے میں صاف ستھرا اور خوش گوار ہے۔ میرے میاں فضائی کمپنی میں سیلز مینیجر ہیں۔ ایک بیٹا ہے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ دراصل میری شادی بہت جلدی ہی ہوگئی جبکہ میرا میڈیکل کا دوسرا سال تھا۔ شارق کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا تھا' ہنگامی صورت حال میں شادی ہوگئی اور جلد بیٹے صاحب کی آمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی یوں میری زندگی ایک بھونچال کی نذر ہوگئی۔ گھر' پڑھائی' بچہ' ہاؤس جاب' سب نے مل کر مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اب ذرا زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا ہے۔

آج وارڈ بہت بزی تھا۔ دو تین مریض سیریس کنڈیشن میں تھے جنہیں I.C.U. میں شفٹ کرنا تھا۔ میری ڈیوٹی آج کل Kidney وارڈ میں تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ جس وارڈ میں بھی میری ڈیوٹی ہوتی ہے' یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں یہ مرض بہت عام ہے۔ پچھلے دنوں شوگر (ذیابیطس وارڈ) میں ڈیوٹی تھی تو وہاں بھی ہر روز وارڈ مریضوں سے بھر جاتا تھا۔ اب یہ ہی حال کڈنی وارڈ کا ہے۔ آج ایک نئے سیکشن کا افتتاح ہے' کافی گہما گہمی ہے' نامی گرامی سرجن جناب ادیب رضوی صاحب کی نگرانی میں یہ شعبہ کام کرے گا۔ دنیا بھر سے مندوبین کی آمد ہے۔ پہلے سیمینار ہوگا پھر (Dialysis) ڈائی لائسز کی نئی اور ماڈرن مشین کا افتتاح' اس کے بعد لنچ' شام تو ہو ہی جائے گی۔ شارق شام کو مجھے پک کرلیں گے۔ گھر کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا' آج جاتے ہی مجھے پورا بکھرا گھر بھی سمیٹنا ہے۔

☆......☆

''نرگس' اب آ بھی جاؤ' بس ہوگیا کام' رات کو کہیں باہر جا کر کھا لیں گے' تم کچھ نہ بناؤ' بس بھئی اب آ بھی چکو۔''

شارق مسلسل مجھے آواز پہ آواز دیئے جارہے تھے۔ آخر گھر آکر سامان بھی سمیٹنا ہے' میں بڑبڑاتی ہوئی چائے کی پیالی تھامے شارق کی آواز پر لپکی۔

''توبہ ہے شارق' آپ تو بس بوکھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ آخر یہ گھر ہے' اس کو سمیٹنا' سنبھالنا بھی پڑتا ہے۔'' میں نے قدرے ناگواری سے کہا اور چائے کا گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔

''شارق' نامعلوم کیا بات ہوگئی ہے' پرانی ماسی نہ جانے شاید بیمار ہوگئی ہے یا اپنے گاؤں چلی گئی ہے۔ کسی نئی ملازمہ کو رکھنا ہی پڑے گا۔ برتن تو خیر' دو آدمیوں کے کتنے ہوتے ہیں مگر یہ صفائی ستھرائی اور دھلائی وغیرہ میرے بس کے کام نہیں۔''

میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا تو شارق کو شرارت سوجھی۔ وہ ایسا اکثر کرتے ہیں' جب کبھی الجھتی' پریشان ہوتی تو یہ شعر پڑھنا شروع کردیتے اور لطف کی بات یہ تھی کہ وہ بھی ترنم سے۔ ان کا ترنم غضب کا ہے۔ شعراء کی ہو بہو نقل کرتے اور میں سب کچھ بھول کر ان سے پوری غزل کی فرمائش کر بیٹھتی۔ اس وقت بھی ان کو شاعری کی سوجھ گئی۔ اپنے لمبے بالوں کو جھٹک کر جون ایلیا کو پڑھنے لگے۔

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے؟

روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے

میں نے فوراً ان کے اتنی دیر اکیلے بیٹھے رہنے پر چوٹ کی۔

اکیلے ہیں وہ اور جھنجلا رہے ہیں

میری یاد سے جنگ فرما رہے ہیں

جواب میں ارشاد ہوا۔

''ہم کب کہتے ہیں کہ آپ کوئی ملازمہ نہ رکھیں بلکہ کل وقتی رکھیں تاکہ آپ یکسوئی سے اپنی پریکٹس جاری رکھ سکیں اور ہم کو بھی یاد رکھ سکیں' خود اکیلے ہی چائے پیے جارہی ہیں اور ایک ہم بے چارے......''

''اوہ سوری شارق' ویری سوری۔ توبہ ہے' میں تو کام میں ایسی الجھی کہ بے خیالی میں آپ کی پیالی کچن میں ہی چھوڑ آئی۔ ابھی آتی ہوں' جسٹ اے منٹ ویٹ۔'' میں کچن کی طرف بھاگی۔

اب مجھے دوسری چائے بنانا پڑے گی' یہ رکھی رکھی ٹھنڈی ہوئے گرم کر کے دوبارہ نہیں پی سکتے۔ میں نے پانی کی کیتلی چولہے پر رکھ دی اور ٹی بیگ سے چائے بنانے لگی۔

اب میرا دھیان دوبارہ ماسی کی طرف چلا گیا یا یوں کہیے کہ بھٹک کر زلیخا کی طرف محو پرواز ہوگیا۔ مجھے یاد آیا' جب وہ نئی نئی آئی تو کیا حسین ہوا کرتی تھی' بھوری بھوری آنکھیں' اس پر سنہری بال' خوب گوری لیکن اپنے حسن سے بیگانہ' حسن سے بے نیاز...... کھلکھلا کر ہنستی تو گالوں پر گڑھے پڑ جاتے۔

''ہاں باجی' میں تیرے ہی پاس کام کروں گی۔ میرا گھر یہاں سے کریب پڑے......''

اور میں نے سحر زدہ سی ہو کر اس کو ہاں کردی۔ ''صبح سویرے آجانا' میں ساڑھے نو بجے نکل جاتی ہوں' سمجھی؟''

''جی' سمجھی' ٹھیک۔''

وہ سر پر پلو کو ڈالتی انداز بے نیازی سے روانہ ہوگئی اور میں جاتی قیامت کو دیکھتی رہ گئی۔

پھر تو وہ واقعی صبح آجاتی۔ ایک گھنٹے میں سارا گھر چمکا دیتی لیکن اب یہ کہاں چلی گئی ہے؟ مجھے تو اس کا گھر بھی نہیں معلوم ورنہ جا کر خود بلا لاتی۔ ہوسکتا ہے' کوئی بچہ بیمار ہو' بچہ کوئی ایک ہے' کبھی نہ کبھی کسی بچے کے بیمار ہونے کی باری آجاتی ہے۔ خیر اب آئے گی تو ضرور ساری معلومات حاصل کروں گی یا پھر شام کو پڑوس والی آنٹی سے جا کر ان کی ماسی کے لیے بات کروں گی۔

☆......☆

میں آج جلدی گھر آگئی تھی۔ کال بیل کی آواز پر میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ بڑی ویران' اجڑی اجڑی سی......

''ارے زلیخا' تو...... یہ تو ہے؟'' میں نے اس کے کمزور اور لاغر وجود پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوگیا تھا تجھے؟ کچھ بیمار ہوگئی؟ بول؟''

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں' چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اچانک

اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا۔ آنسوؤں سے لبریز ڈبڈباتی اور کچھ کہتی آنکھیں...... میں نے ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ محبت کے دو بول سن کر وہ ضبط نہ کر سکی اور بری طرح سسک پڑی' اس کی سسکیاں کمرے کی فضا میں پھیل گئیں۔

''ارے اب کچھ بول بھی یا روئے جائے گی؟ ہوا کیا؟ میاں نے لگتا ہے' اب کے پھر مار لگائی ہے۔''

میری نگاہ میں اس کے کبڑے میاں کا سراپا گھوم گیا۔ دبلا پتلا دانت نکوسے اکثر نظر آتا۔ کباڑیے کا کام کرتا ہے۔ ایک ہاتھ بھی مڑا ہوا ہے۔ ہر وقت جو تم بیزار رہتی ہے۔ اکثر زلیخا' بھائی کے پاس لڑ کر چلی جاتی پھر دیکھتی تو ہنستی مسکراتی چلی آتی۔ عجیب بے حس عورت تھی یہ زلیخا بھی...... جواری الگ ہے' سارا پیسا بیوی بچوں سے ہتھیا لیتا ہے۔ اکثر اپنے پیسے وہ میرے پاس رکھوا دیتی تھی۔ کئی بار پولیس پکڑ کر لے جا چکی ہے۔ یہ بے چاری پھر جمع جتھا مجھ سے لے جاتی اور چھڑا کر لاتی۔ میں تو اس وقت بھی یہ ہی سمجھی' میاں کی مار اب کی شاید زیادہ شدید تھی مگر بظاہر مجھے اس کے جسم پر کوئی مار یا چوٹ کے نشان نظر نہ آئے مگر اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب زلیخا نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

''نی باجی' مار تو کوئی نہیں لگائی' بس میرا جی ہی ٹھیک نہیں ہے' اوپر سے چھوٹا بہت بیمار ہے۔'' اور یہ کہہ کر پھر بے اختیار ہو کر رو پڑی۔

میرا دل بھی اس کی حالت دیکھ کر کڑھ سا گیا تھا۔ ''چلو آؤ' اندر آ کر میرے پاس بیٹھو' میں دوا منگوا دوں گی۔ یہ تو نے دو تین دن میں کیا حالت بنا لی ہے؟'' میں نے اس کو تسلی دی۔

''باجی' تیرے کو معلوم ہے' ہم غریب محنت مزدوری کرنے والے لوگاں ہیں۔ ایک کمرہ' ٹین کی چھت ہے' گرمی بوت پڑے ہے' کئی دن سے میاں بک بک کر رہا ہے کہ تو سارے دن کام کرتی ہے' کوئی باجی تیرے کو ایک پنکھا نہیں دے سکتی۔ سن باجی' میں محنت تو کر سکتی ہوں پر بھیک نہیں مانگ سکتی۔ میری ایسی عادت نہیں' منگتی نہیں ہوں مگر ہاتھ پھیلا نہیں سکتی۔ کوئی خوشی سے دے تو دے۔ میں کام پہ نکلی' چھوٹے والے کا پنگوڑا منجی سے باندھ دیا' بہن اس کو ہلاتی جاتی' وہ سو جاتا۔ شام جب تھکی ہوئی پہنچی تو بچے کو دیکھ کر میں تو چیخ پڑی۔ پورا منہ گیا لال بوٹی ہو رہا تھا۔ چھوٹی روئے جائے' بھاء کو اماں' کچھ ہو گیا۔ بوتل بھی نہیں لگاتا' لال ہوا جا رہا ہے۔ قریب ہی ڈاکٹرنی کے گئی' وہ بولی' اس کو کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے یا پھر زہریلے مچھر نے۔ اب اس کو داخل کرنا پڑے گا' بوتل بھی لگے گی' سوئی بھی لگائی جائے گی۔''

میں اس کی داستان الم کے بیچ ہی میں بول پڑی۔ ''اچھا ٹھیک ہے' اب تم یہ پیسے رکھ لو' اور ضرورت پڑے تو مجھے بتانا' میں اپنے اسپتال لے جاؤں گی' ٹھیک۔ اب تم چھٹی کر لو۔ جب تک بچہ ٹھیک نہ ہو' تم اس کے پاس ہی رہنا۔'' وہ آنچل سے آنسو پونچھتی' دعائیں دیتی رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے اطراف کا ہوش آیا اور میں اپنی دنیا میں واپس لوٹ آئی۔ شارق نے ہارن دیا تو گیٹ پر بھاگی۔

☆......☆

آج کل میرے وارڈ میں بہت رش ہے۔ آج ایک غیر معمولی میٹنگ ہے' تمام ڈاکٹرز جمع ہیں۔ سنا ہے' افلاس کے مارے لوگ اپنے اعضاء فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی ایسا ہی کیس اسپتال پہنچا ہے۔ آئی سی یو میں مریض کی حالت غیر ہے۔ میڈیا میں آؤٹ کرنا ہے تا کہ گورنمنٹ کچھ ایکشن لے۔

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ہماری قوم خط غربت سے کتنے نیچے سفر کر رہی ہے۔ اخباری رپورٹر' کیمرا مین' صحافی حضرات کا جم غفیر لگا ہے۔ مائیک ملک کے ہاتھ یہ ناز سرجن کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے دائیں جانب ایک نہایت خستہ حال یہی کوئی بیس بائیس سالہ نوجوان جس کو جوان کہنا بھی جوانی کی توہین ہے' وہیل چیئر پر دو وارڈ بوائے کے سہارے بیٹھا ہے۔ زرد چہرہ' اندر کو دھنسی آنکھیں' نہ کچھ بول سکتا ہے نہ پیروں سے چلنے کے قابل ہے۔ اس نے اپنی جو کہانی یہاں ڈاکٹر کو سنائی تو کچھ یوں تھی' اس کے محلے میں ایک خدا ترس آدمی نے اس کے حالات سن کر اس کی مدد کا وعدہ کیا کہ تم کو پندرہ ہزار روپے مل جائیں گے' تمہارے بچے کا علاج بھی ہو جائے گا اور بہن کی شادی کا تھوڑا بہت بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اس نے ایک اچھے سے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ عمدہ اور بہترین کھانا مہیا کیا۔ پندرہ کی بجائے بیس ہزار روپے دیئے اور پھر اس کو پتہ نہیں' کیا ہوا۔

''دو دن بعد میرے پیٹ میں شدید درد شروع ہوا تو مجھے پتا چلا کہ میرا گردہ نکال لیا گیا ہے۔ اب بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچ گیا ہوں تو معلوم ہوا ہے کہ انفیکشن ہو گیا ہے۔'' صحافیوں کے سوالات تو وہ کیا دیتا بلکہ اس کی حالت بگڑنے پر اس کو فوراً آئی سی یو میں شفٹ کرا دیا گیا۔

مجھ پر تو سراسیمگی سی طاری ہو گئی۔ تیسری دنیا کے ممالک میں غربت اور افلاس نے تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تو لرز کر رہ گئی۔ اخبارات دھڑا دھڑ اسٹوریاں چھاپ رہے تھے۔ ریڈیو' ٹیلی ویژن...... پروگرام نشر کر رہے تھے۔ انکوائری ہو رہی ہے۔ سنا ہے' کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ ایک کثیر الاشاعت اخبار میں خاص طور پر بڑے چونکا دینے والے انکشافات ہوئے ہیں۔ ایسے غریب اور مفلس لوگوں کو ہوائی سفر تک کرایا جاتا ہے۔ بعض مال دار شیوخ یورپین اور امریکی' بھارت' فلپائن' پاکستان کے غریب لوگوں کو چند دن عیش کا جھانسہ دیتے ہیں اور چند دن عیش کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں جہاں بعد میں کئی پیچیدگیوں کا شکار ہو کر موت کی وادی میں جا سوتے ہیں۔ اخبار نے سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ اس کاروبار کو اخلاقی اور مذہبی بنیادوں پر روکا جائے۔

رات بڑی بے کیف اور کرب انگیز گزری۔

رہ رہ کر مجھے ان بھیڑیوں نما انسانوں پر غصہ آتا رہا اور اپنے وارڈ میں داخل وہ بے بس مریض جو زندگی اور موت سے لڑ رہا ہے۔ بار بار اس کی بے کسی پر رونا آتا رہا۔ شارق تو میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

''اگر تم اسی طرح اپنی راتیں جاگ کر گزارتی رہیں تو تمہیں نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کچھ دن چھٹی کر لو۔ ہم لوگ کہیں گھوم آتے ہیں۔ ذرا ریسٹ مل جائے گا۔'' انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں' اب میں ٹھیک ہوں۔ کیا کروں اپنے اس حساس دل کا جو کسی کی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے۔ مجھ سے کولیگ اکثر کہتے آپ ڈاکٹر کیسے بن گئیں۔ بہرحال اب میں خود کو مصروف رکھوں گی۔ دو دن سے بیٹے سے بات نہیں ہوئی ہے۔ اس سے ذرا گپ شپ کر دوں گی۔ طبیعت بحال ہو جائے گی۔'' شارق کو تسلی دے کر میں نماز کے لئے اٹھ گئی۔

صبح آنکھ دیر سے کھلی۔ گیٹ پر ہارن بج رہا ہے۔ میں سرپٹ بھاگی۔ ویں والے کو بتایا میں خود آ جاؤں گی۔ گھڑی پر نظر ڈالی نو بج گئے تھے۔ اوہ نو ماسی زلیخا

کہاں رہ گئی۔ ہاں یاد آیا وہ تو چھٹی پر ہے۔ کسی دوسری ماسی کو ہی بھیج دیتی۔ نامعلوم اس کا بچہ کیسا ہے۔ میاں تو اس کا بڑا ہی خراب آدمی ہے۔ ایک پنکھے کے لئے اس کو تنگ کر رہا ہے۔ کل کس قدر لٹی پٹی سی نظر آ رہی تھی۔ جو کماتی ہے بارہ بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ باقی جواری میاں اڑا لے جاتا ہے۔

تیسرے دن وہ آ گئی مگر میں نے دیکھا کہ بڑی بے دلی سے کام کر رہی ہے۔ کبھی ٹاکی لگانا بھول جاتی ہے۔

''ارے زلیخا' پونچھا تو پھیر دے تیرا دھیان کدھر ہے۔'' میں اس کو ٹوکتی۔

''اوں...... ہاں...... باجی ابھی لگاتی ہوں۔ ابھی آئی۔'' بڑی تھکی تھکی آواز میں کہتی۔

میں نے پوچھا۔ ''بچہ اب کیسا ہے؟''

''آں جی باجی......'' جیسے چونک سی گئی۔ ''اب کچھ ٹھیک ہے پر کمزور بہت ہے۔ آج صبح گھر لے آئے ہیں۔ پنج ہزار لگ گئے۔ ڈاکٹرنی بولتی ہے اس کو اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔ صاف ستھرا رکھو۔ صاف پانی دیئو۔ سب باجیوں نے تھوڑا تھوڑا دیا ہے۔ مولوی سے پانی پر پڑھوایا بھی ہے اور تعویذ بھی لائی ہوں۔ باجی' میلوں میل پہاڑی پر بیٹھا ہے۔ سارے پیسے سب دے دیئے پر شکر ہے بچہ بچ گیا۔ لیکن باجی' اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ ہڈیاں لگتا ہے ٹوٹ جائیں گی اور پھر میرے پیٹ میں ہر وقت درد ہوتا ہے۔'' وہ باتیں کرتی جاتی اور بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی جاتی۔

''جا پہلے پانی پی۔ چائے روٹی کھا لے۔ میں آج ذرا دیر سے جاؤں گی جب تک سارا کام نمٹا لے۔''

''اچھا باجی......! سارے دن کے بعد گھر پہنچوں تو سب ہی جان کو آ جاویں۔ اماں' کھانا' روٹی ابھی تو چھوٹے کی دوائی بھی ایک مہینے چلے گی۔''

زلیخا کی یہ عادت بھی خوب ہی تھی کہ داستان غم ایسے المیہ انداز میں بیان کرتی کہ اکثر بیشتر تو میں بھی اس کے ساتھ ہی رو پڑتی مگر یہ بات خدا لگتی تھی کہ کبھی مانگتی کچھ نہ تھی جو دے دو' دعائیں دیتی اور زیادہ ہی جی جان سے میری خدمت میں لگ جاتی۔ ''باجی' تم دروازے کھڑکیاں نہ صاف کرنا میں شام کو آ کر جھنکی مار دوں گی...... آج باجی سارے پنکھے صاف کر دوں گی۔ کچن میں دوائی ڈال دوں گی......'' اور واقعی وہ کام میں بری طرح جت جاتی۔ یعنی میری دی ہوئی امداد کو وہ ہر طرح سے حق حلال کر لیتی۔

اس کی اسی خوبی کی بدولت وہ ایک طویل عرصے سے میرے پاس کام کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے یہ میری وقتاً فوقتاً مالی امداد اس کو مزید کام کے لئے اکساتی رہتی ہے۔ شارق تو بہت ناراض ہوتے ہیں۔

''یہ تم نے اس کو بہت سر پر چڑھا لیا ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ دیتی رہتی ہو کہ اب اس کی عادت ہی بن گئی ہے۔ بھئی اتنے بچے ہیں تو بیمار بھی ہوں گے۔'' روز نیا فسانہ نئی تشبیب کے ساتھ......'' افتخار عارف کے شعر کا بیڑہ غرق کرتے ہوئے مجھے مزید تنگ کر رہے ہیں۔

''سچی وہ ایسے غم انگیز انداز میں گریہ کرتی آنسو اس کے میلے بوسیدہ دوپٹے پر ایسے موتی جیسے برستے ہیں کہ میں خود کو بے بس سا محسوس کرتی ہوں۔'' میں نے اپنا دفاع کیا۔

''ارے چھوڑ' یہ سب اس کی چال ہے۔ اس کو معلوم ہے تم ایک حساس عورت ہو' آنسو نہیں دیکھ سکتی اور بس اس لئے وہ روز تم کو قصے سناتی رہتی ہے۔'' انہوں نے گویا مجھے مزید بھڑکا دیا۔

''ہاں' نہیں دیکھ سکتی۔ مجھ سے کسی کی مجبوری نہیں دیکھی جاسکتی۔ مجھے اعتراف ہے' مجھ میں یہ خامی ہاں ہے۔'' میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوتے ناگواری سے کہا۔

شارق نے جو یوں میری حالت دیکھی تو لگے مداوا کرنے۔

''ہاں بھئی' جو حال دل سنائے' اس پر عنایت اور ایک ہم ہیں جانے کب سے پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ......! آپ کی اسی کرم فرمائی کی وجہ سے ماسی دولت نے کافی ریزگاری جمع کر رکھی ہے کیونکہ جیسے ہی گاڑی رکتی ہے آپ اپنا پرس کھولنے لگتی ہیں۔ کسی دن پورے سالم پرس سے جائیں گی۔ فقیروں پر کرم ہم پہ ستم...... یہ بندہ تو بھی جانے کب سے جھولی پھیلائے صدا دے رہا ہے۔ منتظر ہے نگاہ کرم کا۔''

لیجئے' اب شارق کی باری ہے۔'' مجھے ستانے اور رلانے میں تو آپ ماہر ہیں۔''

''چلیے آپ نے کسی بھی مہارت کا اعتراف تو کیا۔'' اب شارق نے میرا موڈ دیکھ لیا ہے اس لئے اپنی پرانی عادت کے مطابق آگئے چالوں پر۔

''اچھا بابا' اب ماسی آئے گی تو کچھ بھی نہ کہوں گی۔ چپ رہوں گی۔ نہ ہمدردی نہ غم گساری۔'' گویا میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ میں نے کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز پر میں نے جھنجلا کر کھڑکی بند کر دی اور اے سی آن کر دیا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ اب عمر کے اس حصے میں آ کر یہ عجیب سی عادت ہو گئی ہے۔ ذرا بھی کوئی غیر معمولی بات ہو جائے' نیند آنکھوں سے غائب۔ کیا واقعی یہ عورت میری ہمدردی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے؟ میں اس کے ہاتھوں میں بے وقوف بن رہی ہوں......؟ میں نے کروٹ بدلی لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے' کوئی اتنی دل سوز ایکٹنگ کر لے کہ دھاروں دھار آنسو بہے جائیں کہ آنکھیں سوج جائیں...... میرے برابر شارق کے خراٹے مجھے اس وقت مزید مضمحل کر رہے تھے۔ خود تو آرام سے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں اور مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں سونے کی ناکام کوشش کرتی ہوں۔ ساری دعائیں جو یاد تھیں' پڑھ ڈالیں جانے کب آیت الکرسی پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ فجر کی نماز بھی قضا ہوئی۔ یہ تو آفس کی تیاری میں مصروف ہو چکے ہیں۔ میں بوجھل قدموں سے کچن میں جلدی جلدی ناشتا بنانے لگی۔

شام اسپتال سے واپس آئی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو گئی۔ ہاں' یاد آیا' آج میں نے شام کو بلایا تھا۔ آج بھی وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہی تھی اور خلاف توقع کوئی بات چیت بھی نہیں کر رہی تھی۔ سلام باجی کر کے کچن صاف کرنے لگی۔ میں اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ خاموشی سے اپنا کام نمٹا کر جانے لگی۔

''باجی' گیٹ بند کر لیں۔''

''اوں اچھا' آتی ہوں۔'' میں اچنبھے میں آ گئی۔ آج کیا ماجرا ہو گیا۔ خاموش گم صم...... میرا تو پلان ہی ختم ہو گیا۔

یہ بات میں کئی دن سے نوٹ کر رہی تھی کہ بچے کی بیماری کے بعد سے یہ خاموش رہنے لگی ہے۔ اس کی ساری شوخی رخصت ہو گئی ورنہ تو جوا کھیلنے پر اس کے میاں کو پولیس پکڑ کر لے گئی تو مجھ سے خوب ہنس ہنس کر بیان کر رہی تھی۔ ''اچھا ہے' ذرا مار پڑے گی تھانے کی' دال اور پولیس کے بٹھڑ کھائیں گے تو دماغ کھل جائے گا۔''

ایک دن میں نے پوچھا۔ ''برابر میں رحیماں

نہیں آرہی' کیا گاؤں چلی گئی ورنہ مہینے دو مہینے میں میرے پاس بھی آجاتی تھی۔"

"باجی' رحیماں کا کیا آنا جانا' گھر میں بیٹھی اپنی کسمت (قسمت) کو رو رہی ہے۔ میاں سوکن جو لا رہا ہے۔" وہ اکثر ایسی اطلاعات دیتی رہتی ہے۔

"زلیخا' تیری مت ماری گئی ہے۔ اس کا میاں ایک بیوی کو تو کھلا نہیں سکتا' دوسری کہاں سے لائے گا۔"

"لو باجی' تم کیا بولی۔ دوسرے آئے گی تو کمائے گی' ایک سے وارہ نہیں پڑتا۔"

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ہے ان جاہل مردوں کی سوچ...... ان کے مردوں کی غیرت اس وقت سوئی رہتی ہے جب یہ غیر گھروں میں گھر گھر کام کرتی ہیں اور سارا پیسا نکھٹو مردوں کے ہاتھ پر رکھتی ہیں۔ جوتے کھاتی ہیں' خدمت کرتی ہیں لیکن اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی ہیں......

مگر آج یہ اتنی بدلی اور سہمی سہمی کیوں تھی......؟ جانے کیوں مجھے اس سے خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ آپ سوچیں ایک ورکنگ وومن وہ بھی ڈاکٹر' ایک معمولی کام کرنے والی کے اتنے زیر اثر آجائے کہ ہر لمحے اسی کے متعلق سوچے' ہے نا حیرت کی بات...... لیکن کیا کروں اس کھوجی طبیعت کا' جو کسی طور چین نہیں لینے دیتی...... کیوں؟ کب؟ کیسے؟ ان سب سوالات کے حصار میں قید خود کو بڑا بے بس و مجبور محسوس کر رہی تھی۔ اس پر شارق کی تنبیہہ' کچھ سرگرداں کچھ پریشاں سے میرے لیل و نہار ہو گئے تھے۔ شارق تو میری اس عادت سے انتہائی نالاں تھے۔

"آخر تمہیں دوسروں کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کوئی بیمار ہے' تو ٹھیک ہو جائے گا' ہر وقت کسی نہ کسی بات پر کڑھتی رہتی ہو تم اپنی صحت خود تباہ کر رہی ہو اسی لیے بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے۔ تمہارے فکر کرنے سے ساری دنیا ٹھیک نہیں ہو جائے گی......

ایک لمحہ جو پاؤ غم ہستی سے فراغ
ایک نیا رنج پکارے ہے کہ تنہا کیوں ہو

اس شعر کی تفسیر بننے کی آپ بالکل کوشش نہ فرمائیں ورنہ ہم مریض محبت مارے جائیں گے وہ بھی بے خبری میں۔" شارق نے ماحول کا بوجھل پن کافی حد تک دور کر دیا تھا۔

بہرحال زندگی کچھ روٹین کے مطابق گزر رہی تھی۔ زلیخا گھر کا کام نمٹا دیتی۔ میں اسپتال چلی جاتی شام کو ہم اور شارق ساتھ چائے پیتے' رات کو واک کرتے اور مستقبل کے خاکے بنتے۔ چھ مہینے کے بعد بیٹے صاحب کی وطن واپسی ہے۔ ان کی نئی زندگی شروع ہو جائے گی۔ جاب کے لیے تگ و دو پھر شادی بیاہ...... لیکن زندگی کے اس ٹھہراؤ میں اچانک بھونچال سا آگیا۔

ایک دن میں اسپتال سے واپس گھر آئی تو دیکھا کہ گیٹ پر کوئی انجانی عورت کھڑی ہے۔ میں نے سوچا کہ ان بھیک منگوں نے بھی مصیبت کی ہوئی ہے اب اس نے دیکھ بھی لیا ہے کہ تالا پڑا ہوا ہے پھر بھی جانے کیوں کھڑی ہوئی ہے...... جانے کوئی چورنی ٹائپ عورت نہ ہو...... ابھی اتر دوں' پرس گھسیٹ لے' زنجیر اڑا بھاگے...... آج کل شہر میں اس طرح رہزنی کے واقعات بہت ہو رہے ہیں...... میں نے ڈرتے ڈرتے آگے قدم بڑھائے اور گیٹ کھولنے لگی۔

"باجی' زلیخاں آپ کے پاس کام کرتی ہے؟" ایک منمنی سی آواز آئی۔

"ہاں' تو کیا ہوا اس کو؟" میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "لو اب کچھ اور نئی اسٹوری

شروع......" میں بڑبڑاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

"باجی' اس نے بولا ہے کہ میں کام کر لوں۔ میں امینہ' اس کی پھوپی لگتی ہوں۔ وہ بیمار ہے' ادھر میرے ساتھ ہی ہوتی ہے۔" وہ عورت پھر گویا ہوئی۔

"کیا تم لوگ ایک ساتھ ہی رہتے ہو؟" میں نے اس کے مشکوک سے حلیے پر نظر ڈال کر ذرا تصدیق کرنا چاہی کہ قابل بھروسا بھی ہے کہ نہیں۔ "اچھا' تمہارا آدمی کیا کام کرتا ہے؟ کتنے بچے ہیں؟"

میں نے پولیس مین کی طرح تفتیش شروع کر دی کہ پتا نہیں کون اجنبی عورت ہے' سچ بھی بول رہی ہے کہ نہیں؟ میں سر سے پیر تک اس کا جائزہ تو لے ہی چکی تھی۔ چلو ٹھیک ہی لگتی ہے' کچھ دن کی تو بات ہے' ان بے چاروں کی بیماری ہی کیا' ابھی دو دن نہیں گزریں گے' لوٹ پوٹ کر بھلی چنگی ہو کر آجائے گی۔ میں تو جانو اس وقت خود غرض سی بن گئی۔ سوچا' کون روز ہاسپٹل سے آکر گھر کی صفائیاں کرتا پھرے گا۔ یہ عورت بھی کام کے لیے غنیمت ہے...... میں نے کافی غور و خوض کے بعد پوچھا۔ "ہاں' کیا نام بتایا تم نے؟"

"جی امینہ!" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' تم کام شروع کرو۔" میں اس کو کام سمجھانے لگی۔

یہ خزاں کی زرد اور اداس شام تھی۔ لان میں جا بجا سوکھے پتے کھڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ سورج بھی ڈوبنے کو آگیا۔ شارق آج آفس میں بزی ہیں پھر فون آیا کہ ابھی اور دیر ہوگی۔ میں نے خالی الذہن ہو کر آنکھیں موندنا چاہیں تو ہاسپٹل کا وہ لاغر مریض نگاہوں میں گھوم گیا۔ جانے کون لوگ ہیں جو اتنے درندے بن جاتے ہیں۔ انسانیت کی اتنی تذلیل! چند روزہ عیش اور کچھ ٹکوں کی خاطر انسانی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر تو اس مریض کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ لگتا ہے' لمحوں کی بات ہے۔ ابھی تک پاکستان میں تو ایسا کوئی گروہ پکڑا نہیں گیا مگر اخبارات لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں اور این جی اوز کے نمایندوں نے اس مذموم کاروبار کے متعلق بتایا۔ فلپائن وغیرہ میں تو 40 سے 50 کیسز سالانہ سامنے آرہے ہیں۔ سنا ہے' گردوں کی مانگ دنیا بھر میں بڑھ رہی ہے۔

فون کی گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی' میں تقریباً بھاگتی ہوئی اندر کو لپکی۔ اسپتال سے ڈاکٹر ارسہ تھیں۔ آخر وہ ہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ وہ بے چارہ مریض اپنی جاں سے گزر گیا۔ میں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اپنے وارڈ کے اور مریضوں کا حال پوچھا اور بوجھل قدموں سے لوٹ آئی۔

میرا دل گھبرا رہا تھا۔ نئی ماسی بھی دو تین دن سے اپنا کام ٹھیک ٹھاک نمٹا رہی ہے۔ نجانے کن حالوں میں ہوگی بے چاری زلیخا...... کہ اچانک آہٹ سی ہوئی۔ گیٹ پر نظر پڑی تو کوئی کھڑا تھا۔ میں نے جھانکا تو وہ تھی۔ میں نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ بہار کے جھونکے کی طرح اچانک اس کو پا کر خوشگوار احساس جاگزیں ہوا۔ چلو' ٹائم اچھا گزر جائے گا مگر وہ تو بڑی کمزور اور لاغر ہو رہی تھی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کو تو میں بھی پریشان ہوگئی پھر یکدم مجھے یاد آیا۔

"زلیخا' اب ٹھیک تو ہو نا؟ تمہارے لیے کچھ کپڑے رکھے ہیں' لیتی جانا' ہاں' ذرا میرا ایپرن دھو دو۔ مریض کو دیکھتے ہوئے دوائی الٹ گئی تھی۔"

"جی باجی......!" وہ اندر جا چکی ہے۔ میں بالکل الجھ سی گئی۔ یہ کچھ بولتی کیوں نہیں...... میں نے بے دلی سے کتاب اٹھا لی پھر میں نے اس کو متوجہ کرنے کے لیے یوں ہی بلاوجہ آواز دی۔ "اری زلیخا' ذرا ادھر میرا نظر کا چشمہ پڑا ہے' اٹھاتی لانا۔"

جانے اس وقت مجھے کیا ہوگیا تھا؟ جواب میں خاموشی طاری رہی۔ اب پریشان ہونے کی باری میری تھی۔ میں اندر کو لپکی تو دیکھا‘ کپڑے تو دھو رہی ہے مگر روتی بھی جاتی ہے۔

’’کیا ہے زلیخا‘ جب ابھی بیمار تھی تو آئی کیوں؟ وہ تیری پھوپی آ تو رہی ہے۔‘‘

’’نی...... نی باجی‘ آ گئی ہوں۔ ٹھیک ہوں۔‘‘

’’اچھا‘ کیا ہوا تمہارے بچے کا؟ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں‘ قسطوں پر ایک پنکھا لے لو‘ ویسے بھی دو تین ہزار میں آ جائے گا۔ میں بھی اس میں اپنا حصہ ڈال دوں گی۔‘‘

اس نے بے بسی سے دیکھا۔ میں نے نگاہیں چرالیں۔ اس کی نگاہوں میں ہزاروں سوال پوشیدہ تھے۔

وہ جلدی جلدی کپڑے الگنی پر ڈالنے لگی۔ میں نے کتاب دوبارہ اٹھائی مگر ایک لفظ بھی پڑھا نہیں جا رہا ہے۔ دل و ذہن دونوں زلیخا کی کیفیت کا جائزہ لینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ عجیب کشمکش سی ہے‘ دل تو یہ ہی چاہ رہا ہے‘ اس سے خوب باتیں کروں‘ ذہن یہ کہتا‘ اس کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ یہ شارق بھی چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت سختی سے منع کر دیا ہے......

اب وہ آہستگی سے میرے سامنے سے گزر رہی ہے۔ میں نے جاتے جاتے پوچھا۔

’’زلیخا‘ اب تمہیں کام بھی کرنا ہے کہ نہیں؟ تمہاری حالت تو ابھی بھی ٹھیک نہیں لگتی۔ کچھ دن اور آرام کر لو اور پنکھے کے لیے مجھ سے پیسے لے لینا۔‘‘

اس کی خاموشی سے مجھے الجھن ہونے لگی۔ اوں‘ اب یہ چاہ رہی ہوگی کہ باجی پورے دو ہزار ہی دیں۔ شارق ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

میرے پنکھے کے لیے پیسے دینے کا سن کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کو روتا دیکھ کر میرا پارہ چڑھ گیا۔

’’دیکھو‘ تمہارا ہر وقت کا رونا دھونا اب نہیں چلے گا۔ اگر تم محنت کرتی ہو تو ہم اس کی اجرت بھی دیتے ہیں۔ تمہارے سر میں درد بھی ہو تو ایک گولی پیناڈول بھی تم نہیں خرید سکتیں۔ تمہارے بچے ویسے ہی سردی گرمی ننگے پاؤں سڑکوں پر ٹائر چلاتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے بچے کو ڈائریا ہوگیا تھا۔ دوائی کے ساتھ نمکول تک میں نے منگوائی۔ آخر تم کمائی کس کے لیے ہو؟ کیا میاں کے لیے جو نشے میں اڑا دیتا ہے یا جوئے میں لگا دے؟ اور جب پکڑا جائے تو پولیس کو بھی تم ہی پیسے دے کر چھڑا کر لاؤ؟‘‘

وہ ہونق سی میرا منہ تک رہی تھی۔ اس کو شاید مجھ سے اس سلوک کی امید نہیں تھی مگر میں نے بھی آج شارق کا پڑھایا ہوا سبق پورا پورا سنا ڈالا تھا‘ نتیجے سے بے خبر...... مگر دل میں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

جب میری بھڑاس نکل گئی تو وہ پلو سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بڑی آہستگی سے بولی۔

’’باجی‘ میں نے تم سے کچھ مانگا......؟ تم پنکھے کے پیسے مت دینا‘ وہ کبھی لگ ہی جائے گا۔ رب رکھاں...... اللہ مالک!‘‘ اور وہ چلی گئی۔

لو میرا تو منصوبہ ہی خاک میں مل گیا۔ میں تو سمجھی تھی‘ ابھی ایک ایک تکلیف پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دے گی اور میں پگھل کر موم بن جاؤں گی مگر آج ایسا کچھ نہ ہوا۔

دوسرے دن وہ پھر کام پر آ گئی۔ اپنا کام کیا اور جانے لگی۔ میں نے کپڑے اور پیسے نکال کر پہلے ہی سے رکھ لیے تھے۔

’’یہ رکھ لو‘ پنکھا لے لینا۔‘‘

’’باجی‘ پنکھا تو آ گیا۔‘‘

میں ایک دفعہ پھر ہار گئی۔ میں نے بناوٹی غصے سے کہا۔ ’’تو اب کیوں منہ بسور رہی ہے؟ اب تو خوش ہو جا۔‘‘

مگر میں نے دیکھا‘ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کئی راتوں کا رت جگا لو دے رہا تھا۔

’’ارے‘ کیوں پریشان ہوتی ہے‘ بچے تو پھول جیسے ہوتے ہیں‘ ذرا سی میں کملائے‘ ذرا سی میں کھل اٹھے۔‘‘ میں نے تسلی دی۔ ’’جاؤ‘ تم اب جاؤ‘ مجھے بھی ہاسپٹل جانے کی دیر ہو رہی ہے۔‘‘

تو یہ ہے‘ میں نے بھی شارق کے کہنے میں آ کر جانے کیا کیا کہہ ڈالا لیکن اس کے معاملے میں کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے...... میں اپنا ذہن جھٹک رہی ہوں مگر ہر بار ناکامی ہو رہی ہے۔ اگر اس وقت شارق نہ آ جاتے تو شاید میرے دماغ کی رگیں پھٹ جاتیں۔ یہ غنیمت ہی ہوا اور میں جلدی چائے بنانے اٹھ گئی۔ اسی اثناء میں شارق نے آواز لگائی۔

’’رات کے لیے کچھ نہ بنانا۔ شبلی نے رات کھانے پر بلایا ہے۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ’’ذرا گھر سے باہر نکلوں گی تو ذہن کا بوجھ ہلکا ہوگا۔‘‘

شبلی کے وہاں سے واپسی پر میرا سر بھاری سا محسوس ہو رہا تھا‘ شاید بلڈ پریشر ہائی ہوگیا ہے۔ سخت ٹینشن میں مجھے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بوجھل ہو چکی ہیں۔ شارق سے میری حالت نہ دیکھی گئی۔ انہوں نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

’’سنو‘ تم میڈیسن لے کر سو جانا۔ اسپتال فون کر دینا‘ صبح ہرگز مت جانا۔‘‘ میں خاموش رہی۔

’’مجھے اس وقت کچھ نہیں سوجھ رہا‘ دل بیٹھا جا رہا ہے۔‘‘

آپ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے‘ ایک معمولی کام والی نے ایک پڑھی لکھی عورت کو اس درجے ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے کہ اس کی روٹین کی زندگی متاثر ہو کر رہ گئی لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں؟

میری پوری میڈیکل کی تعلیم بھی اسی طرح مکمل ہوئی ہے۔ میرے ساتھی مجھے سمجھاتے‘ گھر میں والدین پریشان ہو جاتے‘ امی تو اکثر کہتیں کہ ہم تو باز ہی آئے تمہاری ڈاکٹری سے۔ چلو‘ ختم کرو اپنی ڈاکٹری‘ بس تمہاری شادی کر دیتے ہیں اور جہاں میں یہ سنتی‘ فوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ‘ پڑھائی میں جٹ جاتی۔ اپنا رونا دھونا بھول جاتی اور یقین جانیے‘ ابھی تک یہ ہی حال ہے‘ جہاں شارق نے کہا‘ اب تم ایسا کرو پریکٹس چھوڑ دو‘ تم بہت ٹینس ہو جاتی ہو اور میں فوراً بستر سے اٹھ کھڑی ہوتی۔

ابھی میں کچن میں چائے بنا رہی تھی کہ کال بیل کی آواز نے مجھے گیٹ پر جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زلیخا کی بجائے امینہ کھڑی ہے۔

’’اب کیا ہوگیا؟‘‘ میں نے غصے سے پوچھا۔

’’وہ گاؤں چلی گئی۔‘‘

’’کیوں‘ کل تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔‘‘

’’باجی‘ وہ کیا بولتی‘ رات گھر میں بوت جھگڑا پڑ گیا۔ مرنے مارنے کی بات چل پڑی۔ ہم غریبوں کے پاس ایجت (عزت) ہی ہووے۔ اس کا ہڈ حرام آدمی اس بے چاری پر شک کرے۔ وہ دو جی سے تھی نا‘ بولتا تھا‘ یہ بچہ میرا نہیں۔ مالک مکان پر شک پڑ گیا اسے۔ وہ تو محنت سے کام کرنے والی عورت تھی‘ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتی‘ روز گھر میں لڑائی‘ مار پیٹ......‘‘

اب میں کچن میں امینہ کے ساتھ ہی آ گئی۔ حیرت سے میں نے پوچھا۔ ’’اس کا تو ابھی بچہ چھوٹا ہے‘ اور اب پھر......‘‘

’’ہاں باجی‘ بس اسی وجہ سے روز اس کو مارے‘ بتا تجھے پیسے کس نے دیئے؟ وہ مجھ سے کہتی تھی‘ باجی نے دیئے ہیں۔ کیوں باجی‘ تم نے پنکھے کے پیسے دیئے تھے؟‘‘ اس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا۔

''میں...... ہاں...... وہ......'' میں گڑبڑا کر رہ گئی۔

''بس وہ یہ مانتا ہی نہیں تھا۔ مالک مکان پر شک کرتا' کہتا' ایک کمرا کیا دیا ہوا ہے' ہم کو خرید کرلیا ہے۔ اب تو نے ایک پنکھے کے بدلے اِجّت بیچ دی۔''

وہ سب کچھ کہہ رہی تھی اور میں جیسے بالکل سن سی رہ گئی تھی۔

آج مجھے ذرا جلدی اسپتال پہنچنا تھا کیونکہ آپریشن ڈے تھا۔ مریض کا پورا چیک اپ کرنا پڑا ہے۔ وہاں بھی میرا دھیان زلیخا کی طرف رہا۔

شارق ٹھیک ہی کہتے ہیں' تم سوچتی زیادہ ہو' اسی لیے ہر بات کا زیادہ اثر لیتی ہو۔ دیکھو' اپنی صحت کا کیا حال کرلیا ہے۔ کل ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ نقرئی قہقہے' گدگداتی لطف انگیز باتیں سب کہاں کھو گئی ہیں؟ نہ وہ البیلے لمحات رہ گئے ہیں' نہ وہ شراروں کی طرح مسکراتی' اجالے بکھیرتی آنکھیں' ہماری راہ تکتی نگاہیں رہ گئی ہیں......

ہاں' میں مانتی ہوں' شاید میں نے شارق کو بھی نظر انداز کردیا ہے۔ چہار طرف پھیلے دکھوں کی چادر کو سمیٹنے کی فکر میں خود بکھرنے لگی ہوں۔ ان کا شکوہ بجا...... ٹھیک ہے' آج میں گھر جا کر پہلے ان کے لیے کوئی اچھی سی ڈش بناؤں گی پھر ان کے پسندیدہ رنگ کے کپڑے پہن کر ان کی فیورٹ خوشبو بکھیروں گی۔ بیٹے سے خوب باتیں کروں گی......

یہ سب سوچ کر میں خود کو پرسکون محسوس کررہی تھی۔ ادھر دو تین دن سے محاذ پر خاموشی تھی لیکن یہ زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ ایک دن امینہ روتی' پیٹتی' اپنے بال نوچتی آ کھڑی تھی' بدحواس سی بین کرتی۔

''مر گئی باجی...... وہ مر گئی...... میری زلیخاں گزر گئی۔''

میں سکتے میں آگئی۔ ''ارے' کیا بک رہی ہے' ہوا کیا؟'' میں نے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''بی بی' ہونا کیا تھا۔ گیرت (غیرت) کی ماری تھی' اِجّت کی خاطر جان سے گئی۔ ادھر میرے والی دوائی' کیڑے مارنے والی ہوئے' وہ پی لی۔ اس کا آدمی بس یہ ہی بولے' تیرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟''

وہ ذرا ٹھہر گئی اور میرے بالکل قریب کھسک آئی۔ اپنا سر دائیں بائیں گھماتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''باجی...... تجھے ایک بات بولوں' وہ جو بات بات پر پیٹ میں درد کا بولے' باجی...... اس نے کسی کے ہاتھ دس ہزار میں اپنا...... وہ کیا ہووے ہاں' گردہ بیچ دیا تھا' بس جب سے بیمار تھی۔ سارا پیسا بچے کی بیماری میں لگا دیا۔ میاں کے لیے پنکھا خرید کر لائی پھر پولیس سے چھڑا کر لائی اور خود کبر (قبر) میں جا سوئی۔'' اس نے دو ہتڑ سینے پر مارے۔

میری آنکھوں تلے غم کا اندھیرا سا چھانے لگا۔ کاش' وہ مجھے اپنا رازداں بنا لیتی' میں اس کا اور اس کے بچے کا اپنے اسپتال میں مفت علاج کرا دیتی...... اس کی مشکلات و مسائل کا حتی الامکان مداوا کرتی۔

''باجی...... وہ اِجّت والی تھی' اِجّت کے لیے مر گئی مگر اس نے ہاتھ نہ پھیلایا......'' وہ روئے جا رہی تھی اور جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔

مجھے لگا' باہر ہوائیں بھی بین کررہی ہیں۔ ذہن میں جھکڑ سے چلنے لگے اور بے اختیار ہو کر میں رو پڑی۔ شاید ایک بے بس عورت کی بے بسی پر یا شاید اپنی بے حسی اور بے خبری پر...... اب ایک احساس ملامت مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ کاش...... اے کاش اس نے مجھ سے کچھ تو کہا ہوتا...... کچھ تو......

......☆☆......

جیتے جاگتے کھلونے

مینا تاج

برہم ہے کائنات مگر جی رہے ہیں ہم
مشکل سہی حیات مگر جی رہے ہیں ہم

کراچی سے دوسری پُر اثر کہانی

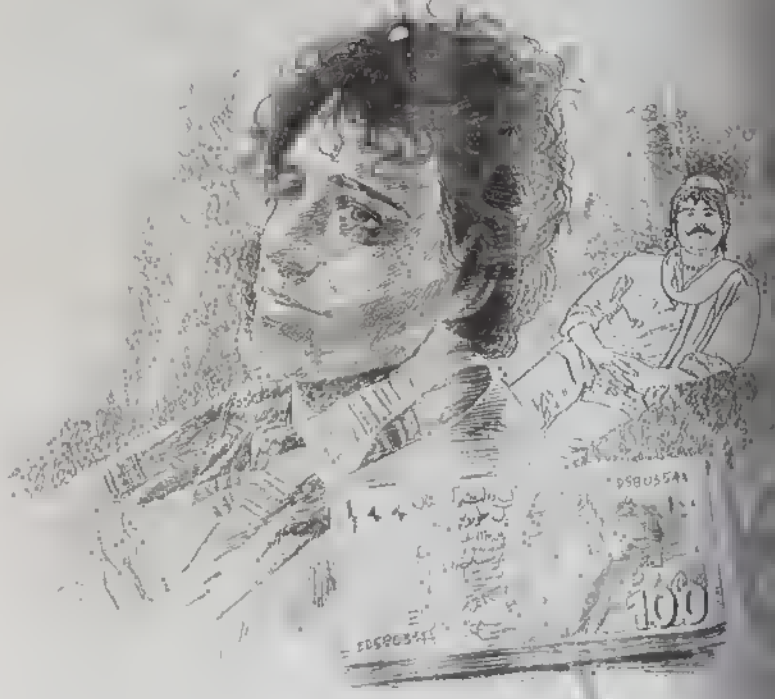

اُسے نوکری تلاش کرتے اور گھر میں فاقے ہوتے چار روز ہو گئے تھے۔ اُس کی ابا کی موت کے ساتھ ہی گتہ فیکٹری کی نوکری بھی چلی گئی تھی۔ جس ملک میں غربت اور بے روزگاری عام ہو وہاں موت کا سوگ منانا بھی ناقابلِ معافی جرم ہوتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی دوسرا بندہ خالی جگہ پُر کر دیتا ہے۔ رہی مالک لوگوں کی بات' ان کو تو بس بندے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کسی کے گھر کا سائبان اٹھ گیا۔

پہلے ابا کے ساتھ چند سو روپے کی آمدنی سے ملا جلا کر زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ اب سارا بوجھ اُسے اکیلے ہی اٹھانا تھا۔ روز گھر سے ایک نئی آس کے ساتھ نکلنا اور واپس مایوسی کے ساتھ لوٹنے اُسے چوتھا روز تھا۔ آج تو گھر جانے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

ابا کے سوئم تک تو پتا نہیں چلا۔ محلے داروں نے تین روز تک مسلمانیت پر عمل کرتے دال روٹی کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ یہ غریب طبقہ متحمل نہیں تھا۔ گھر میں بچا کھچا راشن بھی ختم ہوئے تین روز گزر چکے تھے اور اب......

"ارے شوکت! کس سوچ میں مگن ہے میرے یار؟" سامنے کھڑے اپنے محلے دار ناصر کے مخاطب کرنے پر اس کی سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"کچھ نہیں یار......"

"کچھ تو ہے ورنہ کب سے تیرے پاس کھڑا ہوں اور تجھے ہوش تک نہیں' بتا کیا بات ہے؟"

"کیا بتاؤں یار! ابا کیا گئے دنیا سے' میرے سامنے تو مصیبتوں کی اونچی فصیل کھڑی ہو گئی' نوکری بھی چلی گئی' چار دنوں سے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں' پیدل چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ دو قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا ہے اس لیے یہاں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ گھر جاتے ہی ماں بہنوں کی امید بھری نگاہوں کا سامنا کرنا اور پھر ان کی امید کی شمع بجھتے دیکھ کر دل ... پڑتا ہے۔"

"مت پریشان ہو یار' بس یہ سب آزمائش ہوتی ہے اوپر والے کی طرف سے۔"

"ہونہہ! ساری آزمائشیں ہم غریبوں پر ہوتی ہیں' کبھی کسی امیر آدمی پر یہ آزمائش کی گھڑی کیوں نہیں آتی؟ اب تو برداشت کی حد ہی ختم ہو گئی ہے اور......"

"اللہ اپنے بندے کو اُس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔"

"ہاں بھئی' تم تو نصیحت کرو گے۔ ذمے داریوں سے تمہیں نجات جو مل گئی ہے۔ دو بہنیں تھیں' وہ بھی اپنے گھر کی ہو رہیں' بڑا بھائی الگ رہتا ہے۔ رہ گئے چاچا ہاشم' اُن کے اپنے گزر بسر کے لیے ابا کے پان کے کھوکھے کی آمدنی کافی ہے۔ اب ایک میں تم...... خیر' چھوڑو ان باتوں کو ویسے بھی ہماری قوم میں نصیحتیں کرنے کا جذبہ سب سے زیادہ ہوتا ہے' بچارے ہم جیسے اُن کی نصیحتوں کی زد پر ہوتے ہیں۔"

"اچھا بس! اب زیادہ پریشان مت ہو۔ چل میرے ساتھ' کچھ حل ڈھونڈتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں' لالا کے چائے خانے چلتے ہیں۔"

"نہیں یار' میں نے کہیں نہیں جانا۔ میری پریشانی کا حل صرف نوکری ہے' لالا کے ہوٹل کی چائے نہیں۔ اگر تو میری پریشانی حل کرنا چاہتا ہے تو مجھے کوئی نوکری دلا دے تو جہاں کام کرتا ہے' کوشش کر کے مجھے بھی وہیں لگوا دے۔"

"میں جہاں کام کرتا ہوں' وہ جگہ تیرے مطلب کی نہیں۔ میں انشاء اللہ' کسی اور جگہ کوشش کرتا ہوں۔"

"کیوں' جہاں تُو کام کرتا ہے' وہاں کیوں نہیں؟"

"کہا نا' میں جہاں کام کرتا ہوں' وہاں بڑا مشکل کام......"

"کیوں' کیا قتل کرواتے ہیں؟ کیونکہ یہی سب سے مشکل کام ہوتا ہے اور مجھے اتنا یقین ہے تُو ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا کیونکہ تُو' تو ایک مکھی نہیں مار سکتا' قتل جیسا سنگین کام......"

"ہاں' قتل ہی تو ہوتا ہے انسانیت کا' انا کا' مردانگی کا۔" ناصر کی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ اس کی نظریں خلاؤں میں بھٹکنے لگیں۔

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے؟ سیدھی طرح بتا' کیا کام کرواتے ہیں؟"

"ماڈل بننا ہوتا ہے۔"

"او یار' یہ تو بڑا اچھا کام ہے اور پھر آج کل اس کی ڈیمانڈ بھی بہت ہے۔ اچھا ہے' نت نئے کپڑے پہننے کو ملیں گے' چاہے لمحے بھر کو ہی۔ خود تو ہماری اوقات ہی نہیں ہوتی کئی سالوں تک کوئی نیا کپڑا بنانے کی۔ کچھ تو تشنگی دور ہو گی۔"

"یار' وہ لیڈیز کپڑوں کا ماڈل بننا ہوتا ہے جیسے غرارے' ساڑھی' لہنگے اور......"

"کیا؟" شوکت کی آنکھوں میں حیرت اور کرب کے آثار نمایاں تھے۔ "پر آج تک تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم یہ کام......"

"کون سا قابلِ فخر کام ہے جو میں اعلان کرتا پھروں؟ یہاں محلے میں سب کو یہی پتا ہے کہ میں ایک بڑی دکان میں سیلز مین ہوں' بس میرے بہت! مجبوری انسان سے سب کچھ کروا دیتی ہے اب تو میں عادی ہو گیا ہوں اور اچھا برا سوچنے کی مہلت ہی نہیں رہی' بس ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ابا کو گرم دھوپ سے بچاتے اُن کے اصل گھر کی چھاؤں میں پہنچا دیا۔"

"یہ اپیا کہاں سے بیچ میں آ گئیں؟"

"جو حالات ابھی تمہارے گھر کے ہیں' کبھی ہم بھی اُن سے گزر رہے تھے۔ جب ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا' بھیا علاقے کی دکان پر پچاس روپیہ ہفتہ کام کر رہا تھا۔ میں کوئی کام کرتا نہیں تھا' ایسے میں اپیا کی کسی دوست نے گھریلو آئٹم گھروں میں سیل کرنے کی جاب بتائی۔ وہ خود بھی یہ کام کر رہی تھی۔ اپیا کو کام کرتے دو روز گزرے اور تیسرے دن وہی ہوا جو اس معاشرے میں ہوا کرتا ہے۔ اپیا کی قسمت اچھی تھی جو برائی سے خود کو بچاتے نکل گئی' پر ہم خود کو شرمندگی کے دلدل سے نہیں نکال پا رہے تھے۔

میں نوکری کی تلاش میں پھر رہا تھا اور آخرکار میری ملاقات سیٹھ جبار سے ہوئی جو کہ ایک لیڈیز بوتیک کا مالک تھا۔ اس نے مجھے اپنی شاپ پر ماڈل بننے کی آفر دیتے ہوئے کام سمجھایا۔ گھر کے حالات اور کئی روز کی ناکامی پھر سب سے بڑھ کر چند روز قبل ہوئے اپیا والے واقعے کے بعد مجھے سیٹھ جبار کی آفر قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی۔ میرے گھر کی عزت کے کوئی دام لگائے' اس سے کہیں بہتر تھا کہ میں اپنے دام کھرے کر لوں۔"

"سوری یار! میں نے اپنی پریشانی میں تیرے زخموں کو......"

"ارے نہیں یار' میں تیری پریشانی سمجھ سکتا ہوں' بس ذرا صبر کر لے۔ میں جلد کوشش کرتا ہوں تجھے کسی ڈھنگ کی نوکری دلوانے کی۔"

"کیوں' جہاں تو کام کرتا ہے' وہاں آس پاس کی دکانوں میں کسی ماڈل کی جگہ نہیں ہے؟"

"ک...... ک...... کیا مطلب' تُو اب بھی یہ کام کرنا چاہتا ہے؟"

"کیوں نہیں' جب تُو یہ کام کر سکتا ہے تو میں

کیوں نہیں؟''

''تو پھر ٹھیک ہے جب تم نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر صبح میرے ساتھ چلنا۔ اچھا شوکت! رک' یہ کچھ پیسے رکھ لے' گھر کیا خالی ہاتھ جائے گا؟ ارے یار' ادھار دے رہا ہوں' نوکری پر لگنے کے بعد واپس کر دینا۔''

''شکریہ یار!'' شوکت بوجھل قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔

•......•......•......•

''ارے ناصر بابو' آج کسے ساتھ لیے پھر رہے ہو؟'' شہر کے مشہور شاپنگ سینٹر میں داخل ہوتے ہی لیڈیز بوتیک کے شیشے کے دروازے کو چمکاتے ہوئے ایک شخص نے صدا لگائی۔

''سلام ماموں! اپنے یار کو ساتھ لایا ہوں' اسے نوکری کی سخت ضرورت ہے' اسلام دین سیٹھ کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

''اچھا...... اچھا' اللہ بھلا کرے۔'' کہتے ہوئے وہ شخص پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

شاپنگ سینٹر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شوکت اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے' پر اب بھی کچھ دکانیں کھلیں اور کچھ بند تھیں۔ کچھ دکان دار دکان کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔

''ناصر' کیا آج کوئی خاص بات ہے جو دکانیں اتنی دیر میں کھل رہی ہیں؟''

''ابے یار' یہ کورنگی نہیں ہے' زمزمہ کی مارکیٹ ہے۔ یہاں کی دنیا مختلف ہے۔ یہاں کاروبار آدھا دن گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور رات گئے تک چمکتا دمکتا ہے۔ تُو نے علاقے کے آس پاس کی فیکٹریوں میں ہی کام کیا ہے جہاں سورج کے ساتھ کام شروع اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ختم۔ اچھا سن' سیٹھ اسلام دین دل کا اچھا ہے' پر زبان کا بڑا خراب ہے۔ اپنے ورکرز کا خیال بھی خوب رکھتا ہے مگر کوئی ورکر اگر کام میں ڈنڈی مارے تو بالکل نہیں بخشتا۔''

''او تیری خیر' آج سالے کا موڈ بڑا اچھا ہے' بس تو اپنی نوکری پکی سمجھ۔'' شیشے کے دروازے کے پار بھاری بھرکم وجود کو کرسی میں دھنسے سفید کاٹن کے شلوار قمیص' اس پر میرون واسکٹ میں ملبوس' موبائل فون پر ہنس ہنس کر بات کرتے شخص کو دیکھتے ہی ناصر نے سرگوشی کی۔

''ہاں بھئی بلونگڑے' آج ادھر کا رخ کیسے کر لیا؟ کیا جبار کی طرف سے لات پڑ گئی؟'' فون سے فارغ ہوتے ہی سیٹھ مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''ارے نہیں سیٹھ' آپ کی یاد آ رہی تھی' سوچا سلام کرتا چلوں۔''

''بس کر' بس' سب چالاکیاں جانتا ہوں تم چھوکروں کی' بتا' کیا کام ہے؟''

''وہ...... سیٹھ......! بات یہ ہے کہ یہ میرا دوست شوکت ہے' اسے نوکری کی سخت ضرورت ہے' بس آپ اسے اپنی دکان پر کام دے دو۔ بندہ بڑے بھروسے کا ہے۔ میں گارنٹی لیتا ہوں۔ بارہویں پڑھا ہے۔''

''دیکھ بھیے' اس کی بارہویں جماعت کو تو رکھ اس کی جیب میں۔ اب رہ گئی بات ضرورت کی جو کہ مجھے بھی ہے' اسے نوکری چاہیے اور مجھے نوکر۔ آج وکی کا آخری دن ہے۔ اس کی جگہ اسے رکھے لیتے ہیں' پر یہ کام کر بھی لے گا یا صرف بارہویں کی ڈگری کا گھمنڈ لیے گھوم رہا ہے؟''

''بالکل کر لے گا سیٹھ' میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔''

''اچھا! بابا...... چلو بھئی' تو بسم اللہ کرو۔ ہم آج سے ہی اسے کام پر رکھ لیتے ہیں۔'' اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے سیٹھ اسلام دین نے اسے کام پر

•......•......•......•

''ہاں بھئی' کیا نام بتایا تھا؟''

''جی شوکت۔''

''اس سے پہلے کوئی کام کیا ہے؟ میرا مطلب ہے' کوئی کام دھندہ بھی آتا ہے؟''

''جی میں تو یہ فیکٹری میں کام کرتا تھا کورنگی میں' وہیں رہائش بھی ہے۔ ابا کے انتقال کے دوران چھٹیاں ہو گئی تھیں' مالک نے جرمانے کے طور پر نوکری سے نکال دیا۔''

''اچھا' اچھا' پر ہم لوگ بھی کیا کریں' ہمارا کام بھی تو رک جاتا ہے۔ ہم لوگ کوئی ظالم تھوڑے ہوتے ہیں' پر بھیے' ہمیں بھی تو کام چاہیے۔ اچھا چل' بہت ہو گئیں باتیں' جا تو اپنا کام سمجھ لے نا۔ او وکی! ذرا اسے کام سمجھا دے۔ میں ذرا مارکیٹ کا چکر لگا آؤں۔''

•......•......•......•

بدرنگ سی جینز اور گھسی ہوئی آسمانی بش شرٹ پر جھلمل کرتی نارنجی ساڑھی جو نیلے سنہری ستاروں سے سجی ہوئی تھی' وکی نے ساڑھی کی فال بٹھا کر کمر کے گرد اڑس دی اور لمبا سا آنچل اس کے گردانے سینے پر ڈالا تو ایک لمحے کو اسے جھٹکا سا لگا۔

''اوئے ہوئے! تُو تو بڑا سوہنا لگ رہا ہے یار' یہ آئیڈیل فگر ہے۔ کیا جچ رہی ہے ساڑھی' کسٹمر تو دیکھتے ہی خریدنے میں دیر نہ لگائے گا۔'' وکی نے اس کے دبلے پتلے وجود کو ساڑھی میں لپٹا دیکھ کر داد دی۔

''صحیح کہہ رہا ہے وکی! تو۔ میں اگر ساڑھی پہن کر کھڑا ہوں تو کسٹمر لیتا ہوا مال بھی خوف کے مارے رکھ دے کہ وہ بھی پہن کر ایسا ہی نہ لگے۔'' سامنے سے فربہی مائل سانولے لڑکے نے وکی کو مخاطب کیا۔

''یہ سونو ہے' اس کا کام تمام مال سیٹ کرنا اور مال کا حساب کرنا ہوتا ہے۔'' شوکت تمام باتوں سے بے خبر اپنے سُن ہوتے وجود کے ساتھ سامنے لگے قدِ آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر نظریں جھکا گیا۔

''اب اتار بھی دو یار' کیا پہنے رہنے کا ارادہ ہے۔ دوسرا ڈریس بھی بتانا ہے کہ کیسے......''

''دوسرا ڈریس......!''

''اور نہیں تو کیا بھولے بادشاہ' ابھی شرارہ باقی ہے جو ذرا مشکل ہے کیونکہ کام کی وجہ سے اس کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔ فال سمیٹ کر بیٹھنا اور دوپٹہ کیری کرنا۔ اگر کسٹمر کو ڈریس پسند نہ آئے تو فوراً دوسرا پہننا ہوتا ہے۔ سونو' ذرا وہ ریڈ والا شرارہ اٹھانا۔'' ساڑھی اتارتے ہی جھٹ ایک بار پھر خوبصورت سلمٰی ستاروں' نگوں اور موتیوں سے سجا برائیڈل شرارہ اس کے تن پر سجا دیا گیا۔

''اب کیا کھڑے رہو گے؟ بیٹھنا نہیں ہے کیا؟''

''بیٹھنا......!''

''اے لو بھیا' بیٹھے گا نہیں تو فال کیسے پتا چلے گی؟ چل بیٹھ یار!'' اور ایک چھوٹے پیڑھی نما اسٹول پر کاندھوں سے پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ ساتھ ہی زرتار بھاری دوپٹہ سر پر اوڑھا دیا۔

''شوکت! اب ذرا گردن نیچی کر اور یہ دوپٹے کے دونوں پلو ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھنا اور تجھے اسی پوزیشن میں تب تک بیٹھنا ہے جب تک کسٹمر ڈریس کے ہر اینگل سے مطمئن نہ ہو جائے۔ سمجھ رہا ہے نا؟''

''ہاں' پہلے بتا رہا ہوں' تو بھولا بادشاہ ہے نا' ایسا نہ ہو کہ کسٹمر ابھی دیکھ ہی رہا ہے اور بھائی صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔''

"ابے یہ ابھی تلک تم لوگوں نے کام نہیں سمیٹا۔" سیٹھ اسلام دین نے دکان میں قدم رکھتے ہی اردگرد بے ترتیب پڑے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی سمیٹ دیتے ہیں سیٹھ وہ ذرا ہم شوکت کو ماڈل بننے کی پریکٹس کرا رہے تھے۔" وکی نے جواب دیتے ہوئے ڈبے اٹھانے شروع کر دیے۔

"چلو اچھا کیا۔"

شوکت جو ابھی تک دلہن کے سے انداز میں بیٹھا تھا' اُس نے اکتائے لہجے میں سونو سے اٹھنے کی اجازت مانگی۔

"ابے رک جا دو منٹ' سیٹھ ذرا ایک نظر ادھر بھی ڈال لیں' آپ کا نیا ماڈل ایک دم فٹ فاٹ تیار۔" سونو نے شرارے میں لپٹے بیٹھے شوکت کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے واہ بھیئے' یہ تو خوب جچ رہا ہے' بس آج ایسا کریو وہ جو دبئی والی آنٹی ہیں' انہیں آج آنا ہے اپنے بیٹے کی بَری کی خریداری کے لیے' بس اسی کو ماڈل بنانا۔ اب تو بھی اپنا وزن کم کرلے بالکل اس نئے چھوکرے کی طرح۔ کم بخت' کوئی کپڑے کی فال ہی صحیح نہیں بیٹھتی تجھ پر۔"

"سیٹھ' شروع میں تو میں بھی شوکت کی طرح اسمارٹ ہوا کرتا تھا۔ اب کیا تین سالوں میں اتنا بھی وزن نہیں بڑھتا؟"

"تو یوں کہہ نا' بے روزگاری نے حالت پتلی کر رکھی تھی۔"

"سلام سیٹھ!" شیشے کے دروازے سے ایک نیا چہرہ نمودار ہوا۔ اسلام دین نے اُسے دیکھتے ہی چہرے کا زاویہ بدل لیا اور لہجہ بھی۔

"یہ دیکھو سونو اس کی حالت بھی تیرے جیسی پتلی تھی۔ میں نے نوکری پر رکھا۔ جب سوکھی ہڈی پر بوٹی اور چربی چڑھ گئی تو نخرے بڑھ گئے اور چلنے لگے۔ بھیئے' نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔"

"پر سیٹھ' میں نے تو دوسری چوکھٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پانچ سالوں سے بس ایک ہی چوکھٹ پکڑے بیٹھا ہوں۔" سونو نے سیٹھ کو مسکا لگاتے ہوئے کہا۔

"نا تو کون سا احسان کیا' میں جتنی تنخواہ دیتا ہوں' مارکیٹ میں کوئی نہیں دیتا پھر ضرورت کے وقت خیال بھی رکھتا ہوں۔ اب دیکھ' یہ وکی نے مجھے تین روز پہلے کام چھوڑنے کا بتایا تھا' میں نے کوئی ٹینشن نہ لی' بس اتنا کہا کہ جب تک دوسرے بندے کا انتظام نہ ہو جائے' میں تیری تنخواہ روکے رکھوں گا اور اسی وقت تلک تو کام کریو جب تک دوسرا بندہ نہ آ جائے اور دیکھ' ادھر بیٹھے ہی بیٹھے دوسرا ماڈل بھی مل گیا۔"

"سیٹھ صاحب' وہ میری تنخواہ؟" آنے والے نے عاجزانہ انداز میں اسلام دین سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"ہاں..... ہاں..... صبر کر لے' کیا میری باتیں سننا کھل رہا ہے؟ کرتا ہوں تیرا حساب۔ تیری قسمت اچھی تھی جو آج نیا ماڈل آ گیا ورنہ آج پھر تجھے ہی روک لیتا تھا۔"

"مہربانی سیٹھ.....!" سر جھکائے جھکائے ایک بار پھر عاجزی بھرا لہجہ گونجا اور اپنی تنخواہ کے ملنے کا انتظار کرنے لگا۔

"اب اتار بھی دے' کیا سارا دن یہ شرارہ پہنے رہے گا؟" سیٹھ کا رخ اب شوکت کی طرف تھا۔

شوکت جو بت بنا پل پل حالات کا جائزہ لے رہا تھا' اسلام دین کی آواز پر چونکا اور تیزی سے جنتر میں اڑسے اَن سلا شرارہ اتارنے لگا۔

"ابے..... احتیاط سے' موتی اور نگ نکالے گا کیا؟"

"سوری سیٹھ.....!"

"سوری.....!" یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "اسے درست کرنے کے لیے کیا ایک اور نوکر رکھوں گا؟"

"سیٹھ صاحب.....!" شوکت نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہاں' ہاں' یہی تہمد لگائے گا' میں اسے بتلاؤں گا کیسے سیٹ کیا جاتا ہے۔" شوکت کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھتے ہی اس کے الفاظ پورے ہونے سے قبل سونو نے بات اچک لی۔

"ہاں' اچھی طرح سمجھا دینا۔ ادھر آ بھئی' تیرا بھی حساب کتاب کر دوں۔" اب سیٹھ ملازمت سے برخاست ہوئے وکی سے مخاطب تھا۔

"سونو' یہ کیسی جگہ ہے' کیسی نوکری ہے جہاں عزتِ نفس کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی؟"

"چھوڑ بھائی! پریشان مت ہو' چند دنوں کی بات ہے پھر تیرا یہ شکوہ بھی ختم ہو جائے گا تو بھی نارمل ہو جائے گا۔"

•.....•.....•

بس سے اترتے ہی اپنے کمزور وجود کو سمیٹے تیز قدموں سے گھر کی جانب بڑھتے ہوئے شوکت کو اپنا سایہ آج انجانا سا لگ رہا تھا۔ کیوں نہ لگتا' آج پورے دس گھنٹے اُس علاقے میں گزار کر آیا تھا جہاں کی دنیا اس بستی سے ہر طور مختلف تھی۔ ہر سُو چھائی اداسی اور غریبی۔ اکا دکا اسٹریٹ لائٹ کی پیلی مدہم روشنی مایوسی کی غمازی کرتی تھی۔ بجلی کے کھمبے سے لگے مونگ پھلی والے کا ٹھیلا اور اُس پر رکھی گیس بتی سے نکلتی سرخ روشنی سرد موسم کی شدت کو مات دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ٹھیلے کے آس پاس کچھ بچے اور بڑے کھڑے چھوٹے چھوٹے کاغذ کے بنے ٹھونگے میں مونگ پھلیاں خریدنے میں مصروف تھے۔

کچھ عمر رسیدہ افراد چادر کی بکل مارے موسم کے زیرِ اثر کھانستے اور بلغم تھوکتے گلی کا کچرا اکٹھا کر کے اسے جلا کر ہاتھ تاپ رہے تھے۔

"سلام چچا.....!" ادھیڑ عمر پڑوسی کو اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔

"جیتا رہ بیٹا! کہاں سے آ رہا ہے اس وقت؟"

"کام پر گیا تھا۔ چچا' یہ کچرا جلا کر آگ تاپ رہے ہو۔ آپ لوگوں کو پتا ہے' کتنی بیماریوں کو آپ دعوت دے رہے ہو جبھی آپ کی کھانسی ٹھیک نہیں ہو رہی۔"

"ارے شوکتے' غریبی خود سب سے بڑی بیماری ہے' اسے کسی دعوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بیماری تو ہماری جندگیوں سے آسیب کی طرح چمٹی رہتی ہے۔ جنا مرضی چاہو' پر اس سے جان نہیں چھڑا سکتے۔"

اس کے رکے قدم ایک بار پھر حرکت میں آ گئے۔ قطار در قطار بنے چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانوں کے درمیان بنے ایک خستہ حال مکان میں وہ داخل ہو گیا۔

"سلام اماں!"

"آ گئے بیٹا! بڑی دیر لگا دی۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی اور تُو سوئٹر بھی پہن کر نہیں گیا تھا۔ کیسا رہا تیرا کام کا پہلا دن؟"

"سب بتاتا ہوں اماں! تھوڑا صبر تو کر لے۔"

"ہاں بیٹا! میں بھی باؤلی ہوں' بیٹھ' میں کھانا نکالتی ہوں۔"

پتلی سی دال اور ساتھ میں روٹی اور پیاز کے چھوٹے چھوٹے نوالے توڑتے ہوئے سرگوشی میں ماں کو کام' تنخواہ اور دن بھر کی تمام روداد سنا ڈالی۔

"پر بیٹا.....! تُو نے تو بارہویں تک پڑھا ہے۔ اپنے سیٹھ کو بتایا کیوں نہیں؟"

"اماں.....! وہاں بارہویں پاس کی نہیں بلکہ اپنے کپڑوں کی نمائش کے لیے ایک سانس لیتے مجسمے

کی ضرورت ہوتی ہے۔ چھوڑ اماں......! ویسے بھی کون سا علاقے میں یہ کام کر رہا ہوں' کسی کو کیا پتا چلے گا۔ اتنے دنوں کی بے روزگاری کے بعد یہ نوکری ملی ہے۔ ابھی ضرورت ہے گھر کے حالات سنبھالنے کی۔ بعد میں کوئی دوسرا کام بھی انشاءاللہ ڈھونڈ لوں گا۔"

"اللہ تجھے اس کا صلہ دے گا بچے! تو نے......"

"بس اماں! چپ کر جا' کشف' صدف اور فرحت کو پتا نہ چلے۔" تھوڑی دیر بعد ماں بیٹے کی سرگوشیاں گہرے سناٹے میں تبدیل ہو گئیں۔

رات اور دن اپنا سفر طے کرتے ہوئے دو سالوں پر محیط ہو گئے مگر لاکھ تگ و دو کے باوجود شوکت کو دوسری نوکری حاصل نہ ہو سکی۔ جو ملتی تو اس کی اجرت موجودہ سے کم ہوتی اس لیے مزید کوششیں ترک کر کے وہ صبر شکر سے ایک ہی کھونٹے سے بندھے رہنے میں عافیت جان کر زندگی کی گاڑی گھسیٹتا رہا۔

فرحت کی پہلے سے طے شدہ منگنی نے شادی کا روپ دھار کر اگلی منزل کی طرف گامزن کیا تو ساتھ ہی صدف کی اٹھان اور روپ رنگ کی مہربانی نے اُسے بھی جلدی اگلے ٹھکانے تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ وہ میٹرک پاس ڈرائیور کے سنگ خود کو کافی معتبر سمجھتی۔ اسی وجہ سے کافی مغروریت مزاج میں آ گئی تھی کہ کم از کم پیٹ بھر کھانے اور پہننے کو بہتر مل رہا تھا۔ ساتھ میں شوہر نامدار کے مالک کی گاڑی اکثر فارغ وقت میں زیرِ استعمال رہتی۔ آئے دن اپنے سابقہ ٹھکانے پر دھاوا بول دیتی۔ اپنے نئے کپڑوں کی نمائش کرنے یا پھر سیر سپاٹے کا ذکر کرتے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کو دریائے حیرت میں غوطہ زن کرتے خوشی محسوس کرتی تھی۔

•.....•.....•.....•

اُن دنوں عید کے ساتھ شادیوں کا سیزن بھی چل رہا تھا۔ مارکیٹ دیر تک کھلی رہتی۔ کاروبار عروج پر تھا۔ مالکان مسرور نظر آ رہے تھے۔ شوکت سرعت کے ساتھ ایک کے بعد ایک ڈریس اپنے تن پر سجائے کسٹمرز کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ مسلسل سات آٹھ ڈریسز کی ایک کے بعد ایک تبدیلی اور دن بھر کے روزے کی نقاہت سے طبیعت میں بے زاری پیدا ہو گئی تھی جبکہ سیٹھ اسلام دین کسٹمرز کی ڈیمانڈ کے پیش نظر ڈریسز نکلوا کر اُس پر سجانے پر تلا ہوا تھا کہ کسٹمرز بس ساری شاپنگ اسی بوتیک سے کرے اور آخر اس کی کوششیں رنگ لائیں جب کسٹمر نے اسلام دین کے بوتیک سے سات ڈریسز کی خریداری کر لی۔

"ٹھیک ہے آپ یہ ڈریسز پیک کروائیں' میں ڈرائیور کو بھیجتی ہوں یہ باکس اٹھوانے کے لیے۔ بے بی! تم اِدھر ہی بیٹھو ڈریسز اپنی نگرانی میں پیک کروانا۔" آنے والی کسٹمر بیک وقت سیٹھ اسلام دین اور اپنی بیٹی دونوں سے مخاطب تھی۔

وکی جلدی جلدی ڈبوں میں ڈریسز پیک کرنے لگا جبکہ اسلام دین سابقہ کسٹمر سے رقم وصول کرنے کے بعد نئے کسٹمر کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

ایک بار پھر نئے سرے سے شوکت بھاری پوشاک تلے دب گیا۔

"ارے وحید' آ گئے' یہ تمام پیکٹس اٹھاؤ۔ ایسا کرو' پہلے یہ چار ڈبے اٹھا لو پھر بعد میں دوسرے لے جانا اور...... کیا دیکھ رہے ہو؟ سنا نہیں' میں کیا کہہ رہی ہوں؟" کسٹمر کی بیٹی نے آنے والے شخص کی سرزنش کی۔

"جی...... جی باجی......!" اور آنے والا شخص جھک کر بند ڈبے اٹھانے لگا مگر نگاہوں کا زاویہ پھر بھی نہ بدلا۔ وہ سامنے کھڑے سنہری شیفون کی ساڑھی میں لپٹے وجود کو بے یقینی کے عالم میں تک رہا تھا۔

"چل شوکت بیٹا! آنٹی کو یہ نیلی ساڑھی بھی پہن کر دکھا۔" اسلام دین کی آواز پر واپس جاتے

قدم ایک بار پھر تھم گئے اور پلٹ کر سیٹھ کے مخاطب کو خورد دیکھتے بوتیک سے باہر نکل گئے۔

•.....•.....•.....•

"سیٹھ' مجھے دو گھنٹے کی چھٹی دے دیں' بڑی مہربانی ہو گی۔"

"کیا بات ہے شوکت! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تیرے تو چہرے کا رنگ ہی بدلا ہوا لگ رہا ہے۔ کیا ہو گیا اچانک؟ ایسا کر' ادھر تھوڑا دیر آرام کر لے اور گرما گرم چائے پی لے۔ سونو سے میڈیکل اسٹور سے دوا منگوا دیتا ہوں۔"

"نہ...... نہیں...... سیٹھ' مہربانی۔" شوکت سرد ہوتے وجود کے ساتھ لڑکھڑاتی زبان سے التجائیہ انداز لیے ایک بار پھر چھٹی کی درخواست کرنے لگا۔

"چل' ٹھیک ہے' تو جا پر بیٹا......! میرا بھی خیال رکھنا' سیزن چل رہا ہے' تیرے بغیر کام...... تو سمجھ رہا ہے نا' میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل سیٹھ' آپ بے فکر رہیں' میں وقت پر آ جاؤں گا۔"

•.....•.....•.....•

گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی گہرے سناٹے نے شوکت کا خیر مقدم کیا۔

"اوہ' شکر خدا کا۔ وقت سے پہلے آ گیا۔ اب اماں کو سمجھا دوں کہ صدف کو کس طرح سمجھانا ہے۔ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے غرض سے دروازے کو بند کر کے قدم آگے بڑھائے تھے کہ [illegible] کمرے سے سر جھکائے نکلتے پایا جبکہ تمتمائے [illegible] کے ساتھ صدف واپسی کی راہ لینے کی تیاری کر رہی تھی۔

"اماں! میں جا رہی ہوں۔" شوکت پر نظر پڑتے ہی صدف نے صدا لگائی۔

"ارے' آ گئے بیٹا! اس وقت خیریت؟"

غزل

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تُو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تُو بھی دل کو اِک لہو کی بُوند سمجھا ہے فراز
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

احمد فراز

''خیریت ہی ہوگی اماں! پر میری اب سسرال میں خیریت نہیں لیکن تمہیں کیا' تم تو لاڈ اٹھاؤ اپنے لاڈلے کے۔''

''صدف......! ادھر آؤ' بیٹھو۔''

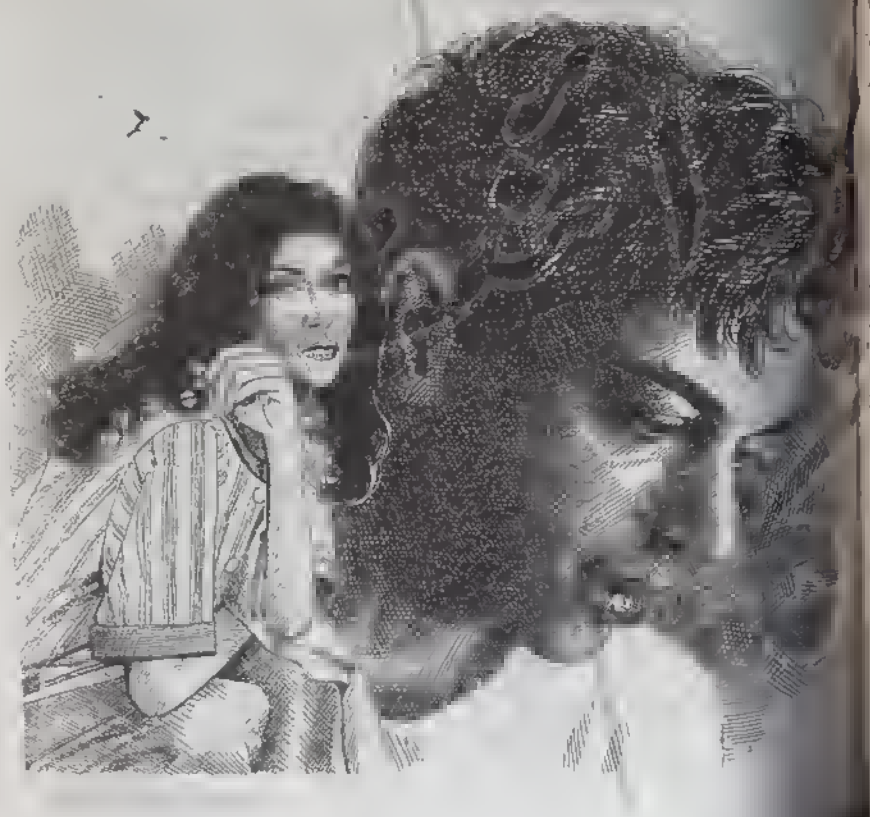

''کیا بیٹھوں؟ ساری عزت خاک میں ملادی۔ تھوڑی دیر پہلے وحید کا فون آیا تھا' کتنا مذاق اڑا رہا تھا میرا کہ سالے صاحب زنانیوں کے کپڑے پہن پہن کر لوگوں کو دکھا رہے تھے بالکل خسروں کی طرح جن کی دنیا میں کوئی عزت نہیں۔ میں خوامخواہ اتنے دنوں سے سالے صاحب کی عزت کیے جارہا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ اماں نے خسروں کے گھر سے میرا ناتا جوڑا ہے۔ میں نے وحید سے کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی تو وہ ناراض ہوگیا۔ اگر مجھ پر یقین نہیں تو چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ بڑی مشکل سے اسے منایا' پر اماں......! وحید یہاں آنا نہیں چاہتا۔ اسے بھائی کے کام پر بہت غصہ ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں۔ اسے ناراض کرکے یہاں ملنے نہیں آؤں گی۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میرا یہاں آنا نہ رکے تو بھائی یہ کام چھوڑ دے اور کوئی ڈھنگ کا مردوں والا کام کرے جس سے ہماری ناک سلامت رہے۔''

''دیکھ صدف......! تیرے بھائی نے ہم لوگوں کی خاطر ہی یہ کام......''

''اماں......! اب بس بھی کرو' کون سا احسان کردیا' دنیا کے سارے بھائی ہی ذمے داریاں اٹھاتے ہیں' پر ہمارے بھائی کی طرح زنانیوں کے کپڑے پہن پہن کر نہیں۔ میں جارہی ہوں۔ اب میں اُس وقت ہی قدم رکھوں گی اس گھر میں جب یہ نوکری چھوڑ کر دوسرا عزت والا کام کرے گا ورنہ سمجھ لینا' میں اس دنیا میں ہوں ہی نہیں......''

''صدف......! سنو تو سہی۔'' شوکت نے بہن کو روکنا چاہا مگر لکڑی کا بوسیدہ دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز ساعت سے ٹکرائی۔

اسی وقت فون بجنے لگا۔ موبائل فون پر اسلام دین کا نام ہلکی روشنی کے ساتھ چمک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ آنکھوں میں آئی نمی کو روکنے کے گلے میں گولہ سا بنا جارہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے سیل فون اٹھایا۔

''سلام سیٹھ......!''

''ابے......کہاں مرگیا؟ دو گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا تین گھنٹے سے زیادہ ہوگئے۔ چل جلدی آ۔ کسٹمر کے آنے کا وقت ہورہا ہے۔ ماڈل کیا تیرا باپ بنے گا؟ اب آ گیا تُو بھی اپنی اوقات پر؟ تیرے اوپر بھی چربی چڑھ گئی؟ سیزن چل رہا ہے اور تیرے نخرے ختم نہیں ہورہے؟ چل' تجھے آج زیادہ پیسا دوں گا۔ اب تُو زیادہ مجھے بلیک میل مت کر غائب ہوکر۔ کسٹمرز کے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔ چل' جلدی پہنچ۔''

''سیٹھ......! میں یہ کام نہیں......'' اُس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اماں نے فون لے کر کال کاٹ دی۔

''یہ کیا کیا اماں؟''

''جہاں تُو نے اتنا احسان کیا بیٹا......! تھوڑا اور کردے۔ کشف کا بیاہ ہونا ابھی باقی ہے۔'' ماں کے اس جملے میں دنیا بھر کی التجا سمٹی ہوئی تھی۔

مجبوریوں اور انسانیت کی تذلیل کا بوجھ اٹھائے شوکت آج بھی لال' گلابی' بنفشی عُروسی جوڑوں کو تن پر سجائے گھونگھٹ نکالے کسٹمر کا جیتا جاگتا کھلونا بنا بیٹھا ہوتا ہے اور یہ تذلیل بھرا کام اُسے اُس وقت تک کرنا ہے جب تک اُس کی اپنی بہن یہ عُروسی جوڑا نہیں پہن لیتی مگر کون جانے بہن کی وداعگی کے بعد جانے کون سی مجبوری اُسے اس شرم ناک کام کو کرنے پر مجبور کرتی رہے؟

......☆☆......

کالی رات

عزیز احمد

اجل بھی اس کی بلندی کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احساسِ زندگی ہوجائے

دہلی سے تیسری پُراثر کہانی

گرینڈ ٹرنک ایکسپریس دس گھنٹے لیٹ تھی۔ سکندر آباد کے پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا اور جب سگنل گرا تو دلوں کی دھڑکن کئی گنا تیز ہوگئی اور بالآخر قاضی پیٹھ سے وہ گاڑی آ ہی گئی جس میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کے دو ڈبے کٹ کر حیدرآباد تک آئے ہیں۔ وہ تینوں اس ڈبے کی طرف لپکے جس پر سفید تختے پر حیدرآباد لکھا ہوا تھا۔ ڈبے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ ان تینوں کے دل ڈوب گئے۔ کسی کا جھانکتا ہوا چہرہ کسی کھڑکی سے نظر نہ آیا۔ گاڑی دھکا کھا کے ٹھہری تو ایک کمپارٹمنٹ کا دروازہ جو اچھی طرح بند نہیں تھا' جھٹکے سے خود بخود کھل گیا۔

تینوں میں سب سے چھوٹے بھائی نے لپک کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ اوپر کی ایک جالی پر ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری رکھی تھی۔ اس کے سوا کسی قسم کا سامان نہ تھا۔ کوئی جاندار' کوئی آدمی اس ڈبے میں نہ تھا اور فرش پر' نشستوں پر' لکڑی کی دیوار پر خون کے دھبے ہی دھبے تھے' جمے ہوئے سیاہ خون کے جس پر راستے بھر خاک اور غبار نے استرکاری کی تھی۔

اب باقی دونوں بھائی بھی اندر جھانک کے یہ منظر دیکھ چکے تھے۔ ناامیدی سے آخری مقابلے کے لیے اس امید کو برقرار رکھنے کے لیے ممکن ہے' وہ لوگ دلی سے روانہ ہی نہ ہوئے ہوں۔ تینوں نے مسافروں کے نام پڑھنے شروع کیے۔ دھول سے اٹے ہوئے کارڈوں پر نام صاف نمایاں تھے۔ مسٹر باقر علی خان۔ مسز باقر علی خان۔ مس باقر علی خان۔ مسٹر سکندر علی خان اور قریب۔ ہی فرسٹ کلاس کوپے کا جو کارڈ تھا' اس پر دلہا دلہن کا نام صاف صاف درج تھا۔ مسٹر اینڈ مسز تہور علی خاں۔ کوپے کا دروازہ کسی رحم دل گارڈ نے مقفل کر دیا تھا۔

گارڈ آیا اور اس نے بیان کیا۔ ''دہلی اور متھرا کے درمیان گرینڈ ٹرنک ایکسپریس پر حملہ ہوا تھا۔''

تینوں بھائیوں کے دل ڈوب گئے۔ جب صدمہ ایسا شدید ہو تو نشتر کی تیزی اپنا اثر کیا نہیں کرتی۔ پہلے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعصاب اور دماغ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' امید' ناامیدی کے مقابل ایک دھندلا سا چراغ جلتا رکھنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے' ان سب کے نام کے کارڈ لگ گئے ہوں مگر یہ اس ٹرین سے روانہ نہ ہوئے ہوں۔

دہلی میں تین چار دوستوں' پاکستان کے ہائی کمشنر اور حکومت ہند کے ایک افسر کو جوابی تار دے کے تینوں بھائیوں نے یہ تصفیہ کیا کہ ان میں سے ایک سب سے چھوٹا غضنفر ہوائی جہاز سے دہلی جائے شاید کچھ سراغ ملے اور جس وقت یہ تینوں بھائی اسٹیشن کے تار آفس سے تار دے رہے تھے' ایک سکھ ایک بابو سے پوچھ رہا تھا۔ ''بابو جی' بنگلور کی گاڑی کس پلیٹ فارم سے جاتی ہے؟''

بابو نے اسے جلدی سے کچھ جواب دیا۔ اس سکھ کے کپڑے میلے تھے۔ کیس اور پگڑی پر دھول جمی ہوئی تھی' صرف قمیص اور شلوار پہنے تھا۔ کمر کے گرد ایک پٹکا تھا جس سے کرپان بندھی ہوئی تھی۔ وہ چلتا ہوا دوسرے سکھ کے پاس آیا جس کا حلیہ اس سے ملتا جلتا تھا اور اس سے پنجابی میں کچھ کہنے لگا پھر دونوں نے گٹھڑیاں اٹھائیں اور دو جھکی ہوئی برقع پوش خواتین جو ان کے ساتھ تھیں' انہیں کہنیاں ماریں۔ دونوں خواتین ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ خفیہ پولیس کے دو جوان دیر سے ان کی طرف تاک میں تھے۔ اب وہ ریلوے پولیس کے دو کانسٹیبلوں سمیت ان کے سامنے آ گئے۔

''سردار جی' تم سکھ ہو نا؟ تمہارے ساتھ یہ برقع والیاں کیسی؟''

اکھڑ پنجابی میں ایک سکھ نے جواب دیا۔ ''ہماری عورتیں پردہ کرتی ہیں۔''

مگر پولیس والوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے انسپکٹر کو پہلے ہی اطلاع کر دی تھی۔ کانسٹیبلوں نے کہا۔ ''ہم ان عورتوں سے پوچھنا چاہتے ہیں یہ کون ہیں؟''

اس مرتبہ سکھ نے اردو میں جواب دیا۔ ''یہ ہماری پنجابی جانتی ہیں' اردو نہیں جانتیں۔''

اس پر حجت ہونے لگی۔ خفیہ پولیس کا ایک نوجوان ایک اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کو بلا لایا جو پنجابی تھا۔ اس نے پنجابی میں پوچھا مگر عورتوں نے جواب نہیں دیا اور اب دونوں سکھ ذرا ذرا بوکھلانے لگے۔ ریلوے پولیس کے انسپکٹر نے موقع پر پہنچ کے ان دونوں عورتوں کو زنانہ ویٹنگ روم بھجوایا۔ وہاں جب اُن عورتوں کے برقع اتارے گئے تو وہ خوبصورت جوان لڑکیاں نکلیں جن کے ہاتھ پیچھے کر کے بندھے ہوئے تھے اور جن کے منہ کو رومالوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک تو وہیں بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ دوسری نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے زنانہ ویٹنگ روم کی عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بی بی......'' اور پھر اُن لڑکیوں نے اپنی بپتا سنائی۔

وہ فیروز پور کے ایک زمیندار گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ شام تک افواہیں ہی افواہیں تھیں۔ رات کو ست سری اکال کے نعرے لگے۔ شور ہوا' برچھے اور کرپان چمکے' باپ بھائی سب مارے گئے۔ یہ دونوں مال غنیمت بن گئیں اور اس کے بعد یہ دونوں سکھ انہیں شہر سے شہر لیے پھرتے تھے۔

پولیس کی سختی پر دونوں سکھوں نے بھی اقبال کیا۔ وہ چکلالہ کے قریب بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائی تھے۔ مسلمانوں سے ان کا یارانہ تھا پھر توڑ پھوڑ شروع ہوئی۔ وہی جوان کے دوست تھے' انہوں نے ان کا گھر لوٹا' ان کی عورتوں کو ان کے سامنے بے عزت کیا' ایک سکھ نے سسکیاں لے لے کر کہا کہ اس کے سامنے اس کی عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی گئی اور اس کے بعد ان باقی ماندہ زخمی سکھوں کا سفر شروع ہوا۔ میلوں کا سفر' ہزاروں کا سفر جس میں بھوک تھی' موت تھی' طلب تھی پھر آزاد پاکستان کی سرحد ختم ہوئی۔ آزاد ہندوستان کی سرحد شروع ہوئی۔ یہاں فیروز پور کے قریب لوٹ ہو رہی تھی' یہ بھی لوٹ میں شریک ہوگئے اور ان دو مسلمیوں کو لوٹ کا مال بنا کے لے چلے۔ انہوں نے سنا تھا کہ بنگلور میں فرنیچر اچھا بنتا ہے اور وہ ادھر ہی کے ارادے سے نکلے تھے۔

تینوں بھائیوں نے رات کو کھانا نہیں کھایا۔ تینوں کو یا تو نیند نہیں آئی یا ایسی آئی جس میں اور بیداری میں کوئی فرق نہیں۔ ہر چیز غیر یقینی اور مبہم تھی۔ ہندوستان کے اخبارات سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ دلی میں معمولی فساد ہے۔ پاکستان ریڈیو احتیاط برت رہا تھا' صرف بی بی سی سے دہشت ناک خبریں آتی تھیں اور ہندوستانی بھائی بی بی سی کی بدبختی کا دکھڑا رو رہے تھے کہ دہلی کے اتنے معمولی سے واقعے کو افسانہ بنا دیا۔ یہ سب تھا مگر تینوں بھائی غیر جانبداری سے دہلی کے واقعات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس مرتبہ ان کی اپنی رگیں' نبضیں' اعصاب' خون کی گردشیں متاثر تھیں۔ اس سے پہلے کلکتہ میں فساد رہا' بمبئی میں فساد رہا۔ وہ افسوس کرتے رہے۔ غضنفر بمبئی میں تھا۔ فساد ہوا۔ وہ سینما سے باہر نکلا تو چاروں طرف پتھر برس رہے تھے۔ ہندو پتھر اور مسلمان پتھر' بت پرستوں کے پتھر اور خدا پرستوں کے پتھر...... اس نے یاعلی! مشکل کشا مدد کہہ کر ایکسی لیٹر دبایا۔ ایک پتھر ونڈ اسکرین سے کوئی نصف انچ فاصلے سے نکل گیا۔ اس نے ایکسی لیٹر اور زور سے دبایا اور لالہ یا نہ فارسی کا ایک فقرہ اس کے ذہن میں آیا جس پر وہ بچپن میں ہنسا کرتا تھا۔

"یک ڈھلان سنات من منات رسید کرم کہ
اگر گچیا نہ منکائے لیت تو سر شکستہ بود۔"

سوڈے کی بوتلوں اور تیزاب سے البتہ ڈر معلوم ہوتا تھا مگر یا علی مشکل کشا مدد۔ بمبئی میں فساد ہوا تو کیا ہوا؟ یہی نا کہ بسوں نے راستہ بدل دیا۔ بی روٹ کی بسیں میرین ڈرائیو کے راستے چلیں۔ چلو سمندر کی ہوا کھاؤ، گلیوں میں کہیں فساد ہو رہا ہوگا، ہونے دو پھر پنجاب میں فساد ہوا، کیا مارا ہے، کیا مارا ہے۔ اس وقت تک یہ تین بھائی نہیں تھے، پانچ بھائی تھے۔ پانچوں خوش تھے کہ واہ واہ مسلمانوں نے سکھوں کو کیا مارا ہے، ہندوؤں کو کیا مارا ہے۔ یہ سب پنجاب کی مسلم لیگ کا کارنامہ ہے۔ افتخار حسین خان ممدوٹ کا۔ ان کا نہیں؟ اچھا تو پھر میاں افتخار الدین کا؟ اچھا وہ بھی نہیں تو بیگم شاہنواز کا اور سر فیروز خاں نون کی انگریز بیگم۔ بھئی وہ تو غضب کی دلیر عورت نکلی۔ اچھا ان میں سے کسی کا نہیں تو پھر یہ میجر خورشید انور کا کارنامہ ہے۔ بھئی ہم مان لیتے ہیں، یہ پنجابی مسلمان کا کارنامہ ہے اور اپریل میں جب غضنفر لاہور گیا تھا کیا دھاک تھی مگر ہندو اور سکھ جوابی حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ روپ شوری کا اسٹوڈیو دیکھنے ملتان روڈ پر لاہور سے سات میل دور گیا۔ اسٹوڈیو وغیرہ سے دلچسپی کسے تھی۔ ان دنوں وہ کلجیت کور کے چکر میں تھا جس نے منورما کی جگہ سنبھالی تھی۔ بے چارے شوری نے ایک اسٹوڈیو جلنے کے بعد دوسرا بنایا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دینا ضروری تھی۔ کیا اب بھی اس کی جورو ایکٹرسوں سے اتنا ہی جلتی تھی؟ اور پھر سروپ شوری نے اسے دوسرے دن کھانے پر بلایا۔ مال پر اس چھوٹے سے ریستوراں میں، کیا نام تھا اس کم بخت ریستوراں کا، وہاں وہ عجیب و غریب جوڑا تھا۔ سعید جس نے اس سکھ لڑکی شیلا سے پندرہ برس ہوئے شادی کی تھی اور شیلا کا ہسٹریا گرٹن کی تعلیم کو کیمبرج کی تاثی کو جو الفرقہ جاتی شادی اور متاہل زندگی کو صرف چھ ہفتوں کی اس لڑائی نے ملیامیٹ کر دیا تھا جس میں اس کے ماں باپ کے فرقے پر اس کے شوہر کے فرقے نے عارضی فتح پائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ غضنفر کم سے کم نام کی حد تک مسلمان ہوگا پھر بھی اس نے پورک پر اصرار کیا۔ اس نے غضنفر سے پوچھا۔ وہ کس قسم کا مسلمان ہے؟ کرویان اعتقاد والا یا پرانیگال (عمل والا) اس نے کہا۔ "اس مرتبہ وہ کلو وادی جائے گی جہاں تھینک ہیون ایک بورڈنگ ہاؤس کا اشتہار آیا ہے کہ صرف اعلیٰ درجے کے ہندو اور سکھ خاندان رہ سکتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ سعید بھی مسلم لیگی ہے حالانکہ آپ کو معلوم ہے، ہم دونوں کا کوئی مذہب نہیں۔ ہماری سول میرج ہوئی ہے، ہم انسان ہیں پھر ایک مشہور مسلمان لڑکی کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگی۔

"جانتے ہو، وہ سعید سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر میں نے سعید کو چھین لیا اور جانتے ہو، سکھ جو چاہتے ہیں، لے کے رہتے ہیں۔" اور اسی پارٹی میں رومیش چندر سے "جی، میں وہ رومیش چندر نہیں جس کے مضامین پیپلز ایج میں آئے ہیں۔ وہ بمبئی والے رومیش چندر ہیں مگر میں بھی پارٹی کارکن ہوں، پارٹی آفس آیئے" روپ کی بیوی کہہ رہی تھی۔ "بھائی نان وائیولنس کے متعلق آپ کا خیال ہے، ایک پارٹی اگر وائیولنس کرے تو دوسری پارٹی وائیولنس کرے یا نان وائیولنس، بے چارے روپ کی جلتی بھنتی ہوئی ایکٹرسوں کی بازاری کشش کی دائمی رقیب گریجویٹ بیوی سے باتیں کرتے کرتے رومیش چندر نے غضنفر سے کہا۔

"آج میرے پاس بھی کچھ لوگ آئے تھے،

...تھے، مسلمانوں سے بدلہ لینا ہے۔ چار ... چندہ دے دو۔ میں نے پہلے تو انہیں سمجھایا، جب انہوں نے کسی طرح نہیں مانا تو میں نے کہا۔ "مجھے تو تمیں روپے تنخواہ ملتی ہے، اس میں سے تمہیں کیا دوں؟" پھر باتوں باتوں میں کسی نے کہا۔ "نہنگ۔"

غضنفر نے پوچھا۔ "نہنگ کیا؟"

رومیش نے جواب دیا۔ "جی، یہ ذرا سر پھرے سکھ ہوتے ہیں۔ معلوم ہے، امرتسر کے ہنگامے کے متعلق یہ کیا کہتے ہیں جب مسلمانوں نے حملہ کیا، یہ لوگ کسی میلے میں گئے تھے ورنہ مزہ چکھا دیتے۔" اور پھر رومیش پورے ہندوستان کی مجموعی حماقت پر ہنسا اور سکھ مسز سعید نے کہا۔

"اور اب یہ دعویٰ ان کانوں سے سننا پڑتا ہے کہ مسلمان بھی بہادر ہو سکتے ہیں۔"

"وائیولنس، نان وائیولنس۔"

"پروتما داس گپتا۔"

"میں نے اپنے کانوں سے "پاکستان ٹائمز" کے دفتر میں سردار شوکت علی خاں کو میاں افتخار الدین سے یہ کہتے سنا کہ سکھوں نے بارہ لاکھ کی جیپ اور لاریاں خریدی ہیں۔ پٹیالہ۔ بہاول پور۔ ہم لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ تانگوں ہی پر بیٹھو، پیدل چلو، لاہور کے سارے سب تانگے والے مسلمان ہیں۔"

"کلجیت کور۔"

"نہیں، کانی نہیں، کچھ نہیں۔"

"اور ٹرین پر جب وہ فرضی نام ڈی سلوا بتا کے شملہ جا رہا تھا تو وہ لالہ جی کس مزے سے تیاریوں کا ذکر کر رہے تھے۔ "لاہور میں ہم صرف دفاعی لڑائی لڑیں گے لیکن امرتسر سے لے کر دہلی تک ایسا مزہ چکھائیں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔"

شملہ میں غضنفر کا اصلی نام سب کو معلوم تھا۔ لالہ جی اسے آخر تک مسٹر ڈی سلوا ہی کہتے رہے۔ خیریت ہوئی ورنہ بے چاروں کو کیسا صدمہ ہوتا کہ دشمن سے سارا کچا چٹھا کہہ دیا تھا۔

رات کو غضنفر کو باقی دونوں بھائیوں کی طرح نیند نہیں آئی۔ کس قدر واہیات، بے معنی، مہمل سی بات تھی کہ شام کو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کا ڈبہ اس کے ماں باپ، بھائیوں کے خون سے رنگا ہوا تھا اور وہ سروپ شوری کے پارٹی اور پنجاب کے ہنگاموں کی دوسری قسط کی تیاری کے قصے یاد کر رہا تھا لیکن نشتر چبھتا رہا اور دماغ کو بے معنی، مہمل چیزوں کی یاد آتی رہی اور اگست کی آخری تاریخوں میں امجد، اپنے آپ کو آزاد مسلمان کہتا ہے نیشنلسٹ۔ کسی نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آزاد مسلم کیا ہوتے ہیں؟ میں نے کہا۔ "مادر پدر آزاد......"

امجد نے کہا۔ "دیکھو اب مشرقی پنجاب میں تمہارے مسلمان پٹ رہے ہیں۔ اب دیکھو ہندو اور سکھ کیسی مار مار رہے ہیں۔"

امجد پر اس کا خون کھولنے لگا اور نشتر پھر جگر کے آر پار ہو گیا۔ ماں باپ، بھائی بہن ریل کے ڈبے میں خون کے چھینٹے، خون کے چھینٹوں پر گرد، کارڈوں پر نام، ناموں پر گرد۔

ہندوستان کی تمام ریل گاڑیوں میں کوئی گرینڈ ٹرنک ایکسپریس سے زیادہ نامعقول نہیں۔ جس طرح ترکی یورپ کا مردِ بیمار تھا، یہ گریٹ انڈین پے نن شلا جڑیل ریل گاڑیوں کی زن بیمار ہے۔ کوئی سیاسی بحران ہو، کوئی ہنگامہ سب سے زیادہ اثر اس پر ہوتا ہے۔ اس کے وجود کی ذمہ داری اور کئی حماقتوں کی طرح مرحوم سر اکبر حیدری پر ہے جنہوں نے قاضی پیٹھ اور بلہار شاہ کے درمیان لائن بنوائی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک تو یہ ایکسپریس بنگلور سے مدراس ہوتی ہوئی پشاور تک سسکتے ہوئے سانپ کی

طرح رینگ جاتی تھی پھر انتہائی شمال اور انتہائی جنوب کی کمپنیاں اس کے رینگنے، اس کی مکوڑا چال سے عاجز آ گئے۔ یہ صرف مدراس سے دہلی تک لنگڑاتی ہوئی چلتی رہی۔ ہر قدم پر بیمار، کوئی اور ٹرین گزرنے والی ہو، یہ بے چاری چھوٹے موٹے اسٹیشن پر بھکاریوں کی طرح کھڑی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تو اس کا حال ہی نہ پوچھو، چوبیس چوبیس گھنٹے لیٹ ہو جاتی تھی۔ بھلا کہیں یہ ممکن تھا کہ بھارت ماتا کو آزادی کا سرسام ہو جائے اور گرینڈ ٹرنک ایکسپریس اس سے متاثر نہ ہو۔

پرانی دلی کے اسٹیشن پہنچ کر میر باقر علی خاں اور ان کے اہل و عیال کی جان میں ذرا سی جان آئی کہ اب دلی سے نکلنے اور جان بچنے کی امید بندھی۔ وہ کیا پلیٹ فارم نمبر ۹ پر ان کے وطن جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ وہیلر کے بک اسٹال پر سستے رسالے اور ان سے زیادہ سستے ناول اسی طرح پڑے تھے۔ قلی اسی طرح ٹھیلے دھکیل رہے تھے۔ مدراسی رجمنٹ کے سپاہی پتوں میں دال چاول کھا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر اسی طرح تھوک، قے اور ہر طرح کی مرکب غلاظت کا لیپ تھا۔ ای آئی آر کے ہرے ڈبے اور بی بی اینڈ سی آئی کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں کو دیکھا، دیکھ کے یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں بھی تمدن دم توڑ رہا ہوگا۔ ان سب کی نشستیں محفوظ تھیں۔ وہ دو دن کے بھوکے پیاسے تھے مگر اسٹیشن پر انہیں کچھ کھانے کو تو ملا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ سکھ اور کچھ غنڈے جو غالباً راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہوں گے۔ ڈبوں کے اطراف چکر مار رہے تھے مگر اب وہ ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ کوئی دم میں ریل چلے گی اور وہ ان غنڈوں کی دسترس سے باہر ہو جائیں گے۔

وہ خود بچ گئے تھے، یہ ایک معجزہ تھا۔ ان دنوں میں انہوں نے کیا کیا دیکھا اور کیا کیا سنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص واقعے سے دلچسپی، عبرت اور وحشت تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے ہولناک واقعے کو اس پورے خواب پریشاں کی انتہا سمجھ کے چن لیا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کے سپاہی جو انہیں موت کے منہ سے نکال لائے تھے، انہیں کیسے کیسے واقعات سنا گئے تھے۔ سکینہ کا دل لرز اٹھا۔ وہ ریل کے ڈبے کے کارنر کی مس باقر علی خاں تھی، بیس سال، مثنویوں اور غزلوں کی معشوقہ سے چھ سال بڑی۔ اس چھ سال کے عرصے میں اس نے بی اے کر لیا تھا اور بی ٹی کی تیاری کر رہی تھی۔ ان فسادات کے زمانے میں وہ اکثر سوچتی رہتی کہ ابسن کی ہلڈا کی طرح کیا سچ مچ اٹھا کر لے جائے جانے میں لطف آتا ہوگا پھر اسے مزید تفصیلات کا علم ہوا اور یہ لطف ختم ہو گیا مثلاً ایک بلوچی سپاہی نے اس کی موجودگی میں اس کے باپ کو یہ قصہ سنایا کہ اکثر عورتوں کو خراب کرنے کے بعد ان کی چھاتیاں کاٹ ڈالی جاتی ہیں یا کرپان سے ان کے شکم کو چیرا جاتا ہے یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت کے سامنے اس کے مرد یا باپ، بھائی کو مارا جاتا ہے اور ان کے اعضا اس کے منہ میں گھسیڑے جاتے ہیں۔ ابسن کی ہلڈا کے وائکنگ بہت شریف تھے، وہ عورتوں کو اٹھا کے چھوٹی چھوٹی طاؤس نما کشتیوں میں امریکہ کی سیر کرانے لے جاتے تھے جہاں سے ابھی تک ہالی وڈ کے فلم آتشک کے جراثیم اور امریکی سیاح پرانی دنیا نہیں آئے تھے۔

سکندر پر ایک اور خاص واقعے کا اثر تھا۔ میر درد روڈ پر ایک چھوٹے سے مکان میں دو بہنیں اکیلی رہ گئیں۔ دروازے ہی پر عابدہ کا شوہر مارا گیا۔ عابدہ حمل سے تھی، وہ کہیں بھاگ نہ سکی لیکن زاہدہ کوٹھے پر چڑھ کے منڈیر سے دبک گئی اور نیچے تماشہ دیکھتی رہی۔ کچھ لوگ سامان نکالتے اور لوٹتے رہے۔

چبوترے پر عابدہ ننگی کی گئی۔ اس کے پاس سات آٹھ وحشیوں کا ہجوم تھا جن کی داڑھیاں اور پگڑیاں ان کی خباثت کا جزو معلوم ہوتی تھیں۔ عابدہ حمل سے تھی۔ ایک ایک کر کے انہوں نے عابدہ کو خراب کیا یہاں تک کہ اس کی چیخیں گھٹ گئیں، سسکیاں بند ہو گئیں، آنکھیں ساکت ہو گئیں، وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔ زاہدہ سے دیکھا نہیں گیا مگر وہ دیکھتی رہی، وہیں اوپر سے منڈیر کی آڑ سے اور جب وہ ساتوں، آٹھوں اپنا منہ کالا کر کے چلے تو دو تین تو ہائیں ہائیں کرتے رہے مگر ان میں سے ایک نے گریبان کھینچ کر شرم گاہ سے حلق تک عابدہ کا جسم چاک کر دیا۔ زاہدہ کی نگاہوں کے نیچے دنیا گھوم گئی، زمین، یہ دھرتی ماتا چکر کھانے لگی اور چکر ذرا تھما تو اس نے ایک ہی لحظہ کے اندر طے کر لیا کہ تھمے کیوں؟ مگر وہ گرے تو اس طرح گرے کہ کسی کے ہاتھ نہ آئے۔ خون میں لت پت ہونے کی وجہ سے عابدہ کتنی کراہت بھری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سگی بہن۔ یہی عابدہ، میری آپا، چشم زدن میں زاہدہ نے سب طے کر لیا۔ چبوترہ پتھر کا تھا، اگر وہ سر کے بل کودے تو بھیجہ پاش پاش ہو جائے گا ان حیوانوں میں سے تو کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے گا۔ چشم زدن میں اس کا بھیجہ پاش پاش ہو گیا۔ ایک فاتح نے دوسرے سے سونی کڑی کے متعلق کچھ کہا۔ دوسرے نے اسے جواب میں ماں کی گالی دی کہ اس کی صورت تو پہچانی نہیں جاتی، تجھے کیا معلوم سونی تھی یا کیسی تھی؟ جب بلوچ سپاہی تخلیہ کرانے پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی اور سکندر نے ان دو نامعلوم بہنوں کے نام عابدہ، زاہدہ رکھے۔ یہ نہیں تو کوئی اور نام سہی۔ اصغری، اکبری، جمال آراء، حسن آراء، ناہید جہاں، خورشید جہاں، کوئی نام سہی، ان کا انسانی حافظے میں زندۂ جاوید ہونا ضروری ہے۔

دہلی اور متھرا کے درمیان ریل گاڑی رکی، روک لی گئی، اس سے پہلے بھی ریل گاڑیاں رکی ہیں ہزاروں مرتبہ، سگنل نہیں گرا۔ ٹرینیں گزر رہی ہیں، کسی نے زنجیر کھینچ لی۔ کیا ہوا، ہوا یہ کہ سینکڑوں رہزن تھے، چمکتی ہوئی کرپانوں کا میلہ لگا ہوا تھا، راشٹریہ سیوک سنگھ والے اسٹاف کا کام کر رہے تھے۔ اہم ترین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو ریل سے اتار لیا جائے۔ معلوم ہوتا تھا، چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ہزاروں بار سفر اتارنے والے کیڑے سے ابل آئے اور انہوں نے انسانوں کی ہیئت اختیار کر لی۔ جے ہند، ست سری اکال، جے بلی دیو، شور پکار، شکار کا شور، شکاریوں کا شور، قصابوں کا نعرہ، بکروں کی آوازیں جو اتر نہیں رہے تھے، ان پر ویسے ہی کرپانوں اور تلواروں کے وار ہو رہے تھے۔

تہور نے اپنے کوپے کو اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ کھٹ کھٹ کھٹ اور گالیاں...... اس کی نئی نویلی دلہن جو ہفتہ بھر پہلے بیاہ کے آئی تھی، اس سے چمٹ گئی۔ معرکۂ کربلا میں شادی کا سماں تھا، ہزاروں انیس اور دبیر مرثیے پڑھ رہے تھے۔ مرثیے، نوحے، سوز، کربلا ہی کربلا۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد...... مگر اس وقت زندگی کے کوئی آثار نہ تھے، کوئی امید نہ تھی، چھن سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا، دلہن جس کی مانگ کی افشاں پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے ابھر آئے تھے جیسے تارے غرقاب ہو جائیں، تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اب تہور اور اس کی دلہن اور ان باہر کے وحشیوں کے درمیان صرف دبیز شیشین کھڑکی حائل تھی۔

تہور نے اپنا ریوالور کٹ بیگ سے نکالا۔ دو چار کو مارے بغیر تو یار لوگ مریں گے نہیں، نظام الملک آصف جاہ کی فوج کا نام بدنام نہ ہوگا، صرف چار گولیاں تھیں۔ یہ ریوالور بھی دلی میں کس مصیبت سے بچا تھا۔ ایک اور یورش میں دبیز شیشین بھی نیچے

گری۔ ایک شخص نے کھڑکی کے اندر منہ ڈالا اور تہور سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”اترو......“

تہور نے اسے ڈانٹا‘ ایک اور سکھ نے کرپان کھینچ کے مارا‘ جو تہور کے بائیں ہاتھ میں لگا۔ تہور نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دو آدمی گرے لیکن دو گولیاں بھی ختم اور کچھ لوگ اس کے ڈبے کی طرف جھپٹے۔ اس نے خود کھڑکی سے دیکھا کہ وہ آدمی اس کی بہن کو پکڑے لیے جا رہے ہیں۔ جھپٹ کے اس نے وینےشین پھر جلدی سے بند کر لی اور جو حملہ آور جھپٹے تھے پھر وینےشین کو گرانے کی کوشش کرنے لگے۔

”بتول......!“

دلہن نے اس کی طرف دیکھا۔ دلہن کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے محبت کی کپکی تھی۔ اب خوف کی اور موت کی......

”تم موت سے تو نہیں ڈرتیں؟ یہ لوگ بہرحال تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔“

اور دلہن نے صرف اتنا کہا۔ ”میں عزت کے لیے ڈرتی ہوں۔“

”ابھی دو گولیاں باقی ہیں۔“

دلہن نے آہستہ سے سر ہلایا۔ وینےشین پر حملہ آوروں کی یورش بڑھ گئی۔ اس نے اپنے پورے جسم کا بار وینےشین پر ڈالا کہ وہ نہ کھلنے پائے پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کی دلہن اس سے لپٹ گئی اور اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا کے اس نے آہستہ سے کہا۔

”تمہیں جناب امیر علیہ السلام کے سپرد کیا۔“

”اللہ حافظ!“

”اللہ حافظ!“

اس نے ریوالور کی نال اپنی دلہن کی کنپٹی پر رکھ کر لبلبی دبا دی۔ دلہن کے دونوں ہاتھ جو اس کی گردن میں حمائل تھے‘ چھوٹ گئے‘ خون اور بھیجہ ملا جلا اس سے دیکھا نہیں گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی خوبصورت تھی‘ میں نے اسے چاہا اور مٹا دیا اور اتنے میں اس کے جسم کے بار کے باوجود وینےشین گری اور ایک کرپان پیچھے سے اس کی پسلیوں کے آر پار ہو گیا۔ حملہ آور سکھ نے اسے ماں کی گالی دی اور جھک کے کوپے کے بند دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ سامان کی لوٹ شروع ہو گئی اور تہور علی خاں کے ریوالور کی آخری گولی بے فائدہ باقی رہ گئی۔

اس کے والد میر باقر علی خاں کے کمپارٹمنٹ کا زیادہ برا حشر ہوا۔ جب اس ڈبے میں سکھ گھسے تو پہلا وار انہوں نے سکندر پر کیا۔ وہ گھائل ہو کے گرا پھر انہوں نے باقر علی خاں کی بیوی کو مارا اور آخر میں باقر علی خاں کو۔ جب ایک نے سکینہ پر کرپان اٹھایا تو راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایک سورما نے کہا۔

”نہیں جی‘ یہ بڑی سندر لڑکی ہے‘ اسے رہنے دو اسے ہم شدھ کریں گے۔ کیوں ری لڑکی‘ چلے گی تو؟“

لڑکی اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی اور ماں کے خون سے اس کے کپڑے تر تھے پھر راشٹریہ سیوک سنگھ کا وہ سورما اور اس کا ایک اور سورما ساتھی اس لڑکی کو پکڑ کے جھاڑیوں کی طرف لے گئے۔

وہ زندہ ہے یا مردہ‘ احساس کی رو اس قدر سست تھی کہ سکندر کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا‘ اسے مردہ جان کے ریل گاڑی سے کھینچ کے کسی نے نیچے ڈال دیا تھا کہ سامان لوٹنے میں اس کی لاش حائل نہ ہو۔ احساس کی رو اس قدر سست تھی کہ اسے زندگی کا کم ہی کم احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ ہلانا چاہا‘ معلوم ہوا سیدھا ہاتھ اب کبھی اس کا ساتھ نہ دے گا۔ سر میں برابر دھماکے ہو رہے تھے‘ مسلسل دھماکے... آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا لیکن کچھ کچھ اندھیری رات کا بھی تھا جس میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پستہ قد بھوتوں کی طرح دور دور کھڑی تھیں۔ اس نے سیدھے ہاتھ سے ناامید ہو کے بائیں ہاتھ کو منانا چاہا۔ اس نے کچھ دیر قوتِ ارادی کا ساتھ دیا پھر بے جان ہو کے کسی چیز پر گر پڑا گھاس جیسی ریشہ ریشہ چیز پر۔ یہ کسی لاش کی داڑھی تھی‘ اس نے لاش کے منہ پر‘ ہونٹوں پر‘ آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ غیر ارادی طور پر اور عین اُس وقت گیدڑوں کی آواز آئی۔ ’ہوا لیجیے‘ انسان کے مہمان آ پہنچے۔‘ کس زبردست پیمانے پر ان کی ضیافت کی تیاری کی گئی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ خوف کی تیز لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی کے اِس سرے سے اُس سرے تک محسوس کی جب اپنا سیدھا ہاتھ بغاوت کرے اور بایاں ہاتھ پوری طرح قبضے میں نہ ہو اور ٹانگیں (غالباً) کسی مری ہوئی عورت کی زلفِ گرہ گیر میں الجھی ہوئی ہوں تو گیدڑوں کے تیز دانتوں کا مقابلہ کون کرے گا؟ اس سے تو کرپان ہی اچھے تھے۔

آسمان پر چار پانچ تارے تھے اور یہ کالی رات خوبصورت تھی۔ ایک بانکی تلنگن سی تھی جس کا کالا کالا روپ اس پورے خون آشام منظر پر چھایا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا اور سب پر کیا حشر ہوا؟ سر کے دھماکے تیز ہو گئے‘ اتنی تکلیف تھی‘ اتنا رنج تھا پھر بھی ایک حد آ گئی تھی جب یہ تکلیف‘ یہ رنج انتہا کو پہنچا اور پھر احساس کند ہو گیا اور سب کا کیا حشر ہوا؟ ماں باپ کا‘ بہن کا‘ بھابی کا‘ بھائی کا؟ اس تاریک رات میں اتنی لاشیں پڑی ہیں‘ کون سی لاش کس کی ہے؟ اس نے سر گھمانا چاہا اور ایسا سخت درد ہوا‘ گویا کسی نے گردن مروڑ دی اور اتنے میں گیدڑوں کی آوازوں سے زیادہ بھاری ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ کوئی اور ریل گاڑی تھی پھر سنئے قاتل‘ نئے مقتول‘ نہیں‘ یہ چھوٹی سی ٹرین فوجیوں کی تھی جو زخمیوں اور مردوں کو لے جانے آئی تھی۔ اس نے انجن کی روشنی دیکھی‘ معلوم ہوتا تھا‘ سر کے اندر ریل کے پہیے گھسے جا رہے ہیں۔ سر میں پھر ایک زور کا دھماکہ ہوا اور احساس کی رو کہیں ڈوب گئی۔

دو لالٹینیں اس کے قریب بھی رکیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ مرا نہیں۔“ اسٹریچر پر اٹھا کے اس کی زندہ لاش وہاں سے ہٹائی گئی اور اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

وہ رات‘ وہ بانکی تلنگن پشاور سے لے کر سہارن پور تک بڑے خون آشام حسن سے چھائی ہوئی تھی۔ ایسی تاریک راتوں کو غلام ہندوستان کے بیٹے رنڈیوں کے کوٹھوں پر جایا کرتے تھے۔ اب پشاور سے سہارن پور تک کسی کو رنڈی کے کوٹھے پر جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ عورت جو پیسے سے خریدی جاتی تھی‘ اب تلوار کے زور سے خریدی جا رہی تھی۔ سینکڑوں‘ ہزاروں‘ لاکھوں‘ محبت کے لیے‘ نفرت کے لیے‘ انسانیت کے لیے‘ بہیمت کے لیے‘ عورت کے بغیر سفر نہیں‘ اب اس کے بچوں کی کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ وہ بالوں‘ سنگینوں‘ برچھوں‘ تلواروں سے چھد کر تڑپ تڑپ کر سو گئے تھے۔

اب دفعتاً کالی رات بانکی تلنگن اپنا تاروں بھرا افشاں لہرا کے سمٹی‘ اس نے انگڑائی لی۔ ہوا چلی‘ جھاڑیوں کے پتے سرسرائے‘ رات نے لاشوں سے اپنا تعارف کرایا۔ ’مجھے پہچانتے ہو؟ میں قرونِ وسطیٰ سے اور اس سے پہلے کی صدہا صدیوں سے آئی ہوں۔ میری آغوش میں تمہارا نطفہ قرار پایا‘ تم نے جنم لیا‘ تم رینگے‘ تم گھٹنوں کے بل چلے‘ تم کھیل کود کے پڑھ لکھ کر جوان ہوئے‘ تم نے بیاہ کیے‘ جھوٹ بولا کیے‘ اپنے ساتھیوں کو‘ اپنے آپ کو دھوکہ دیا کیے اور آج میری ہی آغوش میں تم اس طرح پڑے ہوئے ہو کہ کبھی نہ اٹھو گے کیونکہ میں صرف دائمی‘ تاریخی مدامی عدالت نہیں‘ میں والپرگس رات ہوں جب بھتنیاں ناچتی ہیں اور جادوگرنیاں جھاڑوؤں پر سوار ہو کے ملاء اعلیٰ کی سیر کرتی ہیں۔ میں والپرگس رات

ہوں اور میرا شباب ابھی بہار پر ہے۔ ابھی تم نے کیا دیکھا ہے' تم جو شخص ایک معمولی سر راہ گزار حادثے سے فنا ہو چکے۔ میں جادو بھری رات ہوں' والپرگس رات ہوں' میں ہندوستانی معشوقہ کی زلف ہوں' اس کی آنکھ کی پتلی ہوں' میں مشرقی شاعر کی شب دیجور ہوں' شب فراق ہوں' میں تم سے کیا بتاؤں کہ اپنی ہزاروں آنکھوں سے میں نے ملتان' راولپنڈی' لاہور' امرتسر' جالندھر' گڑگاؤں' دہلی اور ڈیرہ دون میں کیا کیا دیکھا۔ ابھی میں اور کیا کیا دیکھوں گی؟'

ہسپتال میں جب سر اور گردن کے زخم پر پٹی باندھی جا رہی تھی اور ایک سو پانچ کے قریب بخار تھا' سکندر کے لاشعور نے اس تاریک رات کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک' ایک تاریکی سے دوسری تاریکی تک' یہاں تک کہ سیڑھی ختم ہو گئی اور آسمان ابھی بہت دور تھا' تب والپرگس رات سے اس نے گڑگڑا کے کرسمس کا ایک جرمن کیرول دہرایا۔ ''ہائی لی گا ناخٹ' شون ناخٹ'' (مقدس رات' خوب صورت رات) ہسپتال کی دیوار پر کوئی تیز روشنی پڑی' ممکن ہے' اس روشنی کی کرن اس کے دماغ ہی سے نکلی ہو۔ وہ سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا تھا اور سیڑھی ہوا میں اِدھر سے اُدھر جھول رہی تھی کہ اتنے میں جادوگرنی کی جھاڑو رات نے اس کے حوالے کر دی اور بھی کتنی لاشیں تھیں جو جھاڑوؤں پر بیٹھی آسمان کی نیلاہٹ کی طرف جا رہی تھیں' نہیں مگر اسے تو نیچے زمین کی طرف اترنا تھا۔

اس کا پورا جسم پلاسٹر میں بندھا تھا۔ وہ کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ دہنی طور پر اس نے کروٹ لی اور تکیے کو ٹانگ کے نیچے دبا کے پلنگ کی پٹی کو بھینچ کر سو گیا۔ کالی رات کی طرح اس کے لاشعور نے اس کے بیمار جسم سے تھوڑی دیر کے لیے بچ نکلنے کے لیے ایک انگڑائی لی اور عام انسان کے لاشعور میں ضم ہو گیا۔

اب وہ پھر سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا جھول رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سیڑھی اب گری کہ اب گری۔ دور تک کسی جادوگرنی کی جھاڑو کا پتہ نہ تھا یہاں تک کہ سیکینہ کا' بتول کا' کسی کا پتہ معلوم نہ تھا۔ تمام لاشیں جو جھاڑوؤں پر بیٹھی آسمان کی نیلاہٹ کی طرف جا رہی تھیں' اب وہاں پہنچ گئیں۔ تمام طائرانِ بامِ حرم اپنے کابکوں میں بیٹھے آرام سے غٹرغوں کر رہے تھے اور وہ اسی طرح سیڑھی کے سرے پر اب گرا' اب گرا اور عام انسان کا لاشعور اس کے بیمار لاشعور کو پھر ہسپتال اس کے پاس بھیج کے سیڑھی پر اکیلا جھولنے لگا۔ اس سیڑھی پر وہ کتنے ہزار سال کی مشقت سے چڑھا تھا' اس نے کتنے حربے ایجاد کیے تھے' کیسے کیسے اوزار تراشے تھے اور اب یہ سیڑھی جھول رہی تھی' گرنے کے قریب تھی' پشاور سے سہارن پور تک' بیروشیما سے لیک سکس تک۔

اس خطرے کے عالم میں جبکہ سیڑھی ٹوٹ کر گرنے کے قریب تھی' اس عام انسان نے اعتراف کیا۔ میں انسان ہوں' میں وہی ہوں جو ارتقاء کی سیڑھی کی اتنی منزلیں طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔ زندگی کے مرکز سے حیات کے کتنے مظہر نکلے لیکن ایک محیط پر پہنچ کر سب کے سب رک گئے۔ میں اکیلا تھا جس نے اس محیط کو پار کیا۔ میں نے جبلت کو چھوڑ کے عقل کا راستہ پکڑا' میں نے موٹی کھال اتار دی' کپڑے بنائے' میں نے سانپوں کی پرستش کی اور سانپوں کو مارا۔ میں نے بیل کو' گھوڑے کو' بھاپ کو' بجلی کو' جوہر کو اپنا اپنا غلام بنایا لیکن میں نے اپنے آپ کو بھی اپنا غلام بنایا۔ میں نے اتنا سب کیا پھر بھی میں کتنا مجبور ہوں۔ اس وقت ایک اسپیشل ٹرین شرنارتھیوں سے بھری گوجرانوالہ سے آ رہی ہے۔ میں ہی اس ٹرین میں ہوں اور آزادی' خودارادیت اور

یہاں کی طرف جا رہا ہوں۔ میں ہی اس ٹرین پر برین گن' اسٹین گن' مشین گن سے موت کی بوچھاڑ کر رہا ہوں۔ میرے ہی دماغ سے' میرے ہی ارادے سے وہی تمام قیاسات' حسابات' اعمال' افعال پیدا ہونے ہیں جن سے فطرت میری غلام ہے اور میرے ہی ارادے سے تلوار اٹھتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے اور ایک لمحے کے اندر سب غائب' فنا ہی فنا..... اور تب انسان کے ارادے اور عمل اور قوت اور تخیل نے اپنی جڑیں ساری کائنات میں پھیلائیں نہ صرف روشنی بلکہ ہر قسم کی توانائی جیسے حرارتی' برقی مقناطیسی توانائی کا بھی وزن ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر کہ توانائی اور مادہ اصل میں ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہیں اور ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں' یہ کہہ کے آئن اسٹائن کا شاگرد خاموش ہو گیا۔

کیسی توانائی' کیسا مادہ' پناہ گزینوں کی ٹرین ایک اندھیاری گلی سے دوسری اندھیاری گلی جا رہی تھی۔ جو فوجی افسر حفاظت کے لیے مامور تھا' اس نے اپنے صوبیدار میجر سے کہا۔

''یار اس ڈبے میں وہ عورت بڑی خوبصورت ہے۔''

اگلے اسٹیشن پر دو چار سپاہیوں کی مدد سے صوبیدار پچاس بیس سال کی حسین عورت کو اپنے افسر کے لیے اور سترہ اٹھارہ سال کی ایک اور سانولی سی لڑکی کو اپنے لیے اتار لایا اور اس کے ساتھی روتے' گالیاں دیتے رہ گئے اور جب ٹرین سرحد کے پار پہنچی تو ڈاکٹروں نے معائنہ کیا کہ دونوں عورتوں کے جسم نوچ گئے ہیں۔

اے انسان..... دیکھ' کسی دن یہ ذی مفاصل کرّے' یہ چیونٹیاں' یہ شہد کی مکھیاں' یہ ٹڈیاں تجھے تہمت دیں گی۔

اخلاقی فضیلت نہ انسان کے اندر جوں کی توں ودیعت کی گئی ہے اور نہ اس کی فطرت کی مخالف ہے۔ اخلاق انسانی فطرت کے بنے بنائے موجود ہوتے تو ان کے حصول کا کوئی مسئلہ بھی پیش نہ آتا اور اگر جبلت کے خلاف ہوتے' ان کا حصول ناممکن ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق کے حصول کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ یہ ایک بالقوہ صلاحیت ہے' اس کے بالفعل آنے کے لیے صرف علم نہیں بلکہ عادت کی ضرورت ہے۔

''اچھا' یہ بات ہے اور آپ کا اسم شریف؟ ارسطو' اچھا' آیئے' میں آپ کو انسان کے اخلاق کی سیر کراؤں۔ دیکھیے' یہ ہندوستان کی دارالسلطنت دہلی کی ایک گلی ہے۔ یہ دیکھ رہے ہیں آپ' یہ فوج کے سپاہی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے یہ دس' بارہ' پندرہ مادر زاد ننگی لڑکیاں چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ہونٹ خشک ہیں' ان کے بال الجھے ہوئے ہیں' ان کے ننگے پیر جھلس چکے ہیں۔ ان لڑکیوں میں دو تین ایسی بھی ہیں جنہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ ان میں سے کسی کا جسم بھی تو کیا' کسی کا چہرہ بھی کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے جسم سڈول ہیں اور ان میں جوانی کا رس بھرا ہے۔ یہ شریف لڑکیاں کہلاتی تھیں اور اس لیے مرغیوں کی طرح ڈربے میں بند رکھی گئیں کہ شریف بچے پیدا کریں۔ اب تو انہیں دیکھ رہا ہے ارسطو' یہ کیا ہے؟ تو اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لے رہا ہے؟ اور ایک ذرا تیز لڑکی نے جو پہلے بڑی شوخ و شنگ ہو گی' پلٹ کے ارسطو سے کہا۔

'دیکھ..... ہمیں اچھی طرح دیکھ' ہمیں سینکڑوں مرد خراب کر چکے ہیں' آ تو بھی خراب کر.....'

کورو کشیتر میں سری کرشن نے ارجن کو عمل کی تعلیم دیں۔ دسویں ادھیائے کے دوران میں اس نے کہا کہ میری ذات ہر شے کی خلاق ہے' مجھ ہی سے ہر شے نکلتی ہے' جنہیں اس حقیقت کا عرفان ہے' وہ مجھی سے دھیان لگاتے ہیں۔ وہ میرے ہی آرزو مند ہیں' میری ہی ذات سے ہم آہنگ ہیں' میرے

نغمۂ عشق کا سامان ہیں جو لوگ اس طرح میری محبت میں ڈوبے ہیں میں انہیں بڈھی کا یوگ بخشتا ہوں۔

لاکھوں شرنارتھی اسی کوروکشیتر کے میدان میں جمع تھے جیسے زمین کے اندر چیونٹیاں جیسے دیمک جیسے حشرات الارض ہیضہ بیماریاں..... سرِ شام آدمیوں کا ایک سیلاب تھا جو سینکڑوں میل سے مختلف دھاروں میں بہتا چلا آرہا تھا اور یہیں اس کا بند سا باندھ دیا گیا تھا۔ راستے بھر یہ انسان دن کو چلتے رہے لٹتے رہے راتوں کو ٹھہرتے رہے لٹتے رہے۔ ان کے بچے ذبح کیے گئے ان کے جوان مارے گئے ان کی عورتیں چھینی گئیں پھر انہوں نے سرحد پار کی۔ اب سردار پٹیل اور مہاراجہ پٹیالہ کی عملداری تھی۔ اب یہ دن کو چلتے رہے لوٹتے رہے چھاپے مارتے رہے راتوں کو ٹھہرتے رہے لوٹتے رہے چھاپے مارتے رہے بچوں کو ذبح کرتے رہے جوانوں کو مارتے رہے عورتوں کو پکڑتے رہے جس طرح ٹڈی دَل آ کے ہزارہا میل تک کھیتوں کو صفاچٹ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی انسانیت اخلاق تہذیب کو ختم کر دیا۔ انہوں نے فاقے کیے ہوائی جہازوں سے روٹیاں برسیں۔ اب اپنے اس مصنوعی شہر پانڈووں اور کوروں کی اس رزمگاہ میں ان کی روحیں فاقہ کر رہی ہیں عفونت غلاظت سڑاند ایک کیمپ آفیسر نے اپنے ایک پرانے ساتھی فوجی افسر سے کہا۔

''ان لوگوں سے ناک میں دم ہے کسی کی بیٹی پاخانے جا رہی تھی کسی نے اس کی چھاتیاں دبا دیں وہ فریاد لے کے آیا۔ کوئی کسی کی جورو پر چڑھ بیٹھا وہ فریاد لے آیا۔ کسی نے اپنے ہم فرقہ جھگڑے والے کو لوٹ لیا۔ چلو اب پولیس سے جھگڑا کرو۔''

رات بانکی تلنگن نے ایک اور انگڑائی لی اور اس کے افشاں کے تارے ایک ایک کر کے کم ہونے لگے اور تب انسان کے شعور نے وہ سیڑھی جس کے سب کے اوپر کے زینے پر وہ جھولا جھول رہا تھا ایک کنویں میں لٹکا دی جو لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ ممکن ہے کوئی لاش پھر سے سیڑھی کے تمام زینے چڑھ کر اوپر کے زینے تک پہنچ جائے اور انسان کا شعور پھر سکندر کے لاشعور میں ضم ہو گیا جو پلاسٹر میں بندھا ہوا ایک سو پانچ بخار میں بھنتا ہوا ہسپتال میں اپنے بستر کی عظیم الشان وسعت میں ذہنی کروٹیں بدل رہا تھا۔

غضنفر دوسرے ہی دن دکن ایئرویز کے ہوائی جہاز سے دلی روانہ ہوا۔ امید کے خلاف امید کا دیا جھلملاتا رہا یہ ساری آگ ہمارے لیڈروں نے لگائی ہے۔ اس تقسیم سے اس پاکستان سے اس ہندوستان سے کیا مل گیا؟ آچاریہ کیا شاندار نام ہے اور اکساؤ اور اکساؤ ملک ارے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ چنگیز اور ہلاکو مسلمان نہیں مسلمانوں کے قاتل تھے۔ ان کی پیروی کی دھمکی دینا کیا ضروری تھی؟ اس دن بشیر احمد سر سے ہاتھ لگائے بیٹھے تھے کہ پنجاب لیگ کے صدر اور معتمد میں یہ حجت تھی کہ فساد کے مقابلے کے لیے کون زیادہ چندہ دے اور نتیجہ یہ کسی نے چندہ نہیں دیا اور پھر ان سب سے بڑھ کے اکی دکی داستان۔ اس داستان کا خیال آتے ہی اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کی یاد کی خلش ذرا کم ہوئی۔ پریشانی سے دماغ میں جو الجھاؤ تھا وہ ذرا کم ہوا اور وہ خود بخود مسکرانے لگا۔ یہ اکی دکی داستان اس کا جواب شاید ہی ملے اور ہوائی جہاز میں اونگھتے اونگھتے غضنفر نے سوچا۔ کیا یہ لاکھوں اس لیے مرے کہ یہ لوگ حکومت کریں پاکستان پر ہندوستان پر یہ مزے اڑائیں اور انسان مارے جائیں اور میرے اپنے ماں باپ بھائی بہن ہوائی جہاز اتر رہا تھا نربدا بڑی شان و شوکت سے ایک گندے نالے کی طرح نیچے بہہ رہی تھی۔ ایک پہاڑ زن سے ہوائی جہاز کے نیچے سے آ کر گزر گیا اور بھوپال کا تال ایک چوڑے سے نیلے نگینے کی

طرح نظر آیا۔ اس کے بعد گوالیار پھر دہلی۔

دہلی پہنچ کے غضنفر نے ایک لمحہ رائیگاں نہیں کیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں اس کے کافی دوست تھے وہ ایک ہندو دوست کے ہاں ٹھہرا۔ وہ موقعۂ واردات پر گیا جہاں اس نے اپنی ماں باپ تہور اور بتول کی لاشیں پہنچائیں کٹی سڑی لاشیں۔ سکینہ کا کچھ پتہ نہیں چلا اور اب تک پتہ نہیں۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں کے جھنڈ میں ایک نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش تھی سینکڑوں جانوروں کی ہوس سے پامال جسم سوج گیا تھا اور درندوں نے اس کے بے ہوش جسم کو تنہا چھوڑنے سے پہلے ایک بڑے پتھر سے اس کا چہرہ اور سر کچل دیا تھا۔ لاش پہچانی نہ جاتی تھی۔ غضنفر نے جس نے پندرہ سال پہلے سے اب تک اپنی بہن کو ریشم میں ملبوس دیکھا تھا کیونکر پہچان سکتا کہ یہ جوان لڑکی کون تھی؟ پھر مہینوں بعد جب خواجہ شہاب الدین کا بیان اخباروں میں چھپا کہ ایک گریجویٹ لڑکی ایک ان پڑھ ملہار کی کنیز اور داشتہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی ہے تو تینوں بھائیوں کی نبضیں تیز ہوئیں اور پھر ڈوب گئیں مگر وہ ڈ کپور تھلہ کا ذکر تھا اور وہ لڑکی کوئی پنجابی لڑکی ہو گی جو پاکستان پہنچا دی گئی ہو گی پھر وہ ہسپتال گیا اور اس نے اپنے بھائی سکندر کو دیکھا جو گردن اور سر کے زخم سے بے ہوش سرسام کے عالم میں تھا۔

سکندرِ اعظم ارسطو کا شاگرد ارسطونی فوجیوں کی حفاظت میں برہنہ عورتوں کو دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ہزارہا سال پہلے اس نے سکندر سے کہا تھا۔ ''ساری دنیا فتح کر سکندر ارسطو انسان کامل۔''

کالی رات آئی بانکی تلنگن مانگ میں تاروں کی افشاں پیشانی پر چاند کا جھومر انسان جو سیڑھی کے سب سے اوپر زینے پر فضا میں جھول رہا تھا اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور انسان کامل ہونے کا دعویٰ کیا۔ جاننا چاہیے کہ انسان کامل بذات خود جمیع حقائق وجودیہ کے مقابل ہے۔ وہ اپنے لطافت میں حقائق علویہ کے مقابل ہے اور کثافت میں حقائق سفلیہ کے مقابل ہے حقائق خلقیہ سے اولاً جو چیز اس کے مقابل ہے وہ عرش ہے۔

ارتقا کی سیڑھی سے انسان کامل عرش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھو میں برق کا پیغمبر ہوں۔ میں ایک بڑا سا قطرہ ہوں جو ابر سے ٹپکا ہے۔ برق بہر حال انسان کامل ہے۔ یوں کہا زرتشت نے۔

پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر ایک معبد میں جو معلوم نہیں مسجد تھی یا گوردوارہ یا مندر تھا یا کلیسا ایک عورت کی لاش سڑ رہی تھی اور جہاں سے دیوی ماتا انسان کو کائنات کو انسان کامل کو جنم دیتی ہے وہاں ایک کتاب کا ورق بہیمت اور قتل کے بعد ٹھونس دیا گیا تھا۔ ذرا ہندوستان کے وزیر اعظم اور پاکستان کے قائد اعظم کو بلاؤ۔ اس کالی رات میں شاید وہ پڑھ کر بتا سکیں کہ یہ ورق کس مقدس کتاب کا ہے؟ قرآن مجید کا؟ مقدس وید کا؟ گرنتھ صاحب کا؟ انجیلِ مقدس کا؟ کمیونسٹ مینی فیسٹو کا؟ برگساں کی ارتقائے تخلیق کا؟

شرما کے انسان کامل نے سیڑھی پھر اس کنویں میں لٹکا دی جس میں لاشیں سڑ رہی تھیں اور نیچے اترنا شروع کیا۔ اس زینے پر جہاں جہاں درندے تھے اس زینے پر جہاں حشرات الارض تھے جہاں لاشوں میں بلبلاتے کیڑے تھے اور پھر انسان کامل معدوم ہو گیا۔ جب غضنفر ماں باپ کی اور اس نامعلوم لڑکی کی لاش سپردِ خاک کر کے آیا تو ہسپتال میں سکندرِ اعظم سرسام کی حالت میں ختم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''بڑا افسوس ہے اس کی جان بچانے کی ہم نے بہت کوشش کی......''

......☆☆......

ڈھول سپاہیا

میجر ارم امتیاز حسین

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

سیالکوٹ سے چھپنی زبانی

ستمبر 1965ء کو کون بھول سکتا ہے' پاک بھارت جنگ نے سینوں میں آگ لگا دی تھی۔ جوانوں کے سینے جذبوں سے دہک رہے تھے۔ بھرتی دفتروں کے باہر قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم اس وقت کالج میں تھے لیکن جذبات نے زیادہ دیر کالج میں نہ رہنے دیا پھر ایک دن ہم نے بھی خود کو ایک بھرتی دفتر کے باہر لگی قطار میں پایا۔ خوش قسمتی تھی کہ سلیکٹ بھی ہوگئے اور ہوئے بھی افسر' ہمارے کتنے ہی سپاہی ناکام واپس گئے۔ کئی ایک تو افسر سلیکٹ نہ ہوئے تو سپاہیوں میں بھرتی ہوگئے۔ ان دنوں جذبوں کا یہی عالم تھا۔ ایک تو جنگ کی خبریں' اوپر سے نور جہاں کے ترانے' بس آگ لگی ہوئی تھی جو جوانوں کو گھر بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ سلیکٹ ہوکر اکیڈمی پہنچے۔ وہاں جنگ کی وجہ سے ایمرجنسی کورس چل رہے تھے اس لیے تربیت سے جلدی فارغ ہوکر سیالکوٹ یونٹ میں پہنچ گئے۔ فوج میں آئے تو پیشہ وارانہ مصروفیت کی وجہ سے گاؤں اور خاندان سے رابطہ کم ہوگیا۔ جیسے جیسے سروس بڑھتی گئی' مصروفیات بھی بڑھتی گئیں اور گاؤں جانا کم سے کم ہوتا گیا۔ شادی اور پھر بیوی بچوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ گاؤں جانا خوشی اور غمی پر ہی رہ گیا لیکن گاؤں سے تعلق نہ تو ختم ہوا نہ ہی ہوسکتا ہے۔ پودا بڑھ بڑھ کر کہیں بھی پہنچ جائے' جڑیں تو اس کی زمین میں ہی رہتی ہیں۔ جڑوں سے تعلق تو ختم نہیں ہوسکتا۔ ہماری جڑیں بھی گاؤں میں ہیں اس لیے گاؤں سے رابطہ یا تعلق کیسے ختم ہوسکتا ہے البتہ آنا جانا بہت کم ہوگیا ہے' بس شادی بیاہ یا فوتگی وغیرہ پر ہی جانا ہوتا ہے لیکن جب بھی گاؤں جائیں' بڑا مزہ آتا ہے۔ واپس آنے کو تو دل ہی نہیں چاہتا۔ بیوی بچے' پیشہ وارانہ مصروفیات اور ضروریات زبردستی کھینچ کر لاتے ہیں۔

پچھلی دفعہ چھوٹے بھائی کی شادی پر گاؤں جانا ہوا۔ ایسے موقعوں کے تو سب منتظر رہتے ہیں۔ دور نزدیک جہاں جہاں بھی دوست احباب اور رشتے دار عزیز ہوتے ہیں' سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ عام حالات میں تو آج کل گاؤں میں کوئی ملتا ہی نہیں۔ ہماری عمر کے تو سب ساتھی نوکریوں کے چکر میں نکل گئے ہیں۔ گاؤں میں کوئی رہ گیا ہے تو خواتین یا زیادہ بڑی اور زیادہ چھوٹی عمر کے لوگ جو شاید کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ ہماری طرف کے لوگوں کا زراعت کے بعد سب سے بڑا پیشہ تو ہے ہی فوج اس لیے زیادہ تر لوگوں کو فوج نے کھینچ لیا ہے۔ اس دفعہ خوشی کا موقع کافی لمبے وقفے کے بعد آیا تھا اس لیے دل کھول کر خوشیاں منائی گئیں۔ وہ کچھ بھی ہوا جو ہمارے گھروں میں عموماً نہیں ہوتا یعنی گانا بجانا وغیرہ۔ دیہات میں شادی بیاہ کے موقعوں پر گانا بجانا عام ہے بلکہ لوگ تو ایسے موقعوں کے منتظر رہتے ہیں خصوصاً خواتین جنہیں گاؤں میں تفریح کے مواقع بہت کم ملتے ہیں لیکن میں اور چھوٹا بھائی اختر چونکہ کسی قدر مذہبی رجوع رکھتے ہیں' اس لیے مخلوط یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کا اکٹھا گانا پسند نہیں کرتے۔ لڑکے لڑکیوں کے الگ الگ گانے بجانے پر ہمیں کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا۔ ویسے جب ہم دونوں موجود نہیں ہوتے تو چھوٹی پارٹی سب کچھ کرتی ہے۔ ہمیں بھی سب کچھ پتہ ہے لیکن یہ ہر جگہ ہوتا ہے اس لیے ہم بھی زیادہ تھانیداری نہیں دکھاتے پھر اس دفعہ تو انہوں نے باقاعدہ اجازت نامہ بھی لے لیا تھا۔ اجازت نامہ کے لیے اتھارٹی ہماری والدہ صاحبہ کے علاوہ اور کون ہوسکتی ہیں۔ چھ بھائیوں کی لاڈلی بہن اور چھ بیٹوں کی پیاری ماں جن کے حکم یا فرمائش کو ٹالنا سب ہی کے لیے مشکل ہوتا ہے پھر

جب سے یہ بیمار ہوئی ہیں' سب ان کا اور بھی خیال رکھتے ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہر لفظ حکم ہوتا ہے جس کی ہر صورت میں تعمیل ہوتی ہے۔ چھوٹی پارٹی نے یہی ہتھیار استعمال کیا۔ امی کی فرمائش کے آگے ہم چوں بھی نہ کر سکے اور اب سب کچھ کھل کر ہو رہا تھا۔ لڑکیاں گانے میں پیش پیش تھیں۔ سچ پوچھیں تو ان کے گانے لگتے بھی بہت اچھے تھے۔ بعض کے گانے سن کر تو حیرت ہوتی ہے' پتہ نہیں' گاؤں میں رہتے ہوئے یہ سنتی اور دیکھتی کہاں سے ہیں؟ ایک رات دیر گئے جب میں واپس آیا تو گھر کے باہر ہی سے میں نے سنا' کوئی لڑکی گا رہی تھی۔

کرکے ہار سنگھار ملساں ڈھولے نوں

گانے کے خوبصورت بولوں نے جیسے میرے پاؤں تھام لیے' میں وہیں رک گیا اور پورا گانا سنا۔ گانا ختم ہوا تو میں اندر آیا اور والدہ سے فرمائش کر کے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد یہی گانا دو تین بار سنا۔ سب حیران تھے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کہاں تو میں گانے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا اور کہاں اب بار بار فرمائش کر رہا تھا۔ چھوٹی بہن نے تو پوچھ بھی لیا۔ ''بھائی جان! خیریت تو ہے' بڑی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں؟'' لیکن میں ٹال گیا۔ امی کے چہرے پر بھی حیرت تھی لیکن خوش بھی تھیں کہ میں لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ وہ خود بھی ان چیزوں سے خوف لطف اندوز ہوتی تھیں۔ میں سب سے بڑی اولاد تھا اس لیے وہ میری خوشی کا خیال بھی بہت رکھتی تھیں لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ میں تو وہاں تھا ہی نہیں۔ یہ گانا تو مجھے ستمبر 1989ء میں لے گیا تھا' بہت دور کشمیر چڑی کوٹ جہاں کوئی ڈھولا کسی سے ملنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کسی ہیر کا رانجھا' کوئی ڈھول سپاہی۔ نام تو اس کا گل محمد تھا' سب اسے گلو کہتے لیکن میں اسے ''گنگو'' کہتا تھا اس لیے کہ میں نے اسے کبھی بولتے نہ سنا' بس مسکراتے یا اپنے خچر کی خاطر مدارت کرتے ہی دیکھا۔ اگر وہ کوئی بات کرتا بھی ہوگا تو صرف اپنے خچر سے.....

پہلی بار میں نے اسے جولائی 1988ء میں دیکھا تھا جب میری کشمیر میں اس یونٹ میں پوسٹنگ ہوئی۔ مجھے یونٹ کا ''پیک ٹروپ'' دکھانے کے لیے لے گئے تھے۔ ''پیک ٹروپ'' توپوں' گولہ بارود اور سامانِ رسد کو پہاڑی علاقوں میں لے جانے کے لیے خچروں کا تربیت یافتہ دستہ ہوتا ہے۔ ویٹرنری ڈاکٹر' متعلقہ صوبیدار اور حوالدار میجر میرے ساتھ تھے۔ میں نے سارے خچر اور ان کا عملہ دیکھا پھر میری نظر خود ہی ایک جگہ رک گئی۔ میں ایک خچر کے سامنے آ کر رک گیا۔ مجھے وہاں رکتا دیکھ کر ڈاکٹر اور صوبیدار دونوں مسکرانے لگے۔ ڈاکٹر کہنے لگا۔

''سر' ہمیں یقین تھا' آپ یہیں آ کر رکیں گے۔ سب یہیں آ کر رکتے ہیں۔ یہ گل محمد کا خچر ہے' اسی خچر میں اس کی جان ہے۔ ہر وقت وہ آپ کو یہیں ملے گا۔ اس کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ تو سوتا بھی اسی کے ساتھ۔ ہر انسپکشن میں اس ہی کا خچر فرسٹ آتا ہے.....'' لیکن ان کے یہ سب کچھ کہنے کی کوئی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ خوبصورت خچر کی صحت اور چمکتی جلد ہی سب کچھ بتا رہی تھی۔ میں نے اسے شاباش دی۔ جواب میں فخر سے اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ بس اتنی ہی بات کرتا ہے' یہی اس کا اسٹائل ہے۔ اسے بات کرنی نہیں' صرف کام کرنا آتا ہے۔ اس کے بعد میں اس سے بارہا ملا۔ میں جب بھی پیک ٹروپ جاتا' اس کے پاس ضرور جاتا۔ میں نے اس کو ہمیشہ اپنے خچر کے پاس اور مسکراتے ہی پایا لیکن کبھی بات کرتے نہ سنا' واقعی

گنگو تھا۔

پیک ٹروپ سے میرا یہ پہلا واسطہ تھا۔ جیسا سنا تھا' ویسا ہی پایا۔ انتہائی صحت مند' تربیت یافتہ اور خوبصورت خچر' خوبصورت اور باوقار گھوڑے اور ٹٹوؤں سے کہیں زیادہ محنتی' جفاکش اور باکردار ان کے سائیس۔ خچر اتنے صحت مند اور قدآور تھے کہ شہروں میں نظر آنے والے خچر تو ان کے سامنے گدھے لگتے تھے۔ اپنے سائیس کے اشاروں کو ایسے سمجھتے اور ان پر اس طرح عمل کرتے کہ حیرت ہوتی۔ اتنے طاقتور اور سخت جان کہ جانور سے زیادہ مشین لگتے۔ ان سنگلاخ پہاڑوں میں اور کوئی جانور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں کسی کی دعا ہے کہ خطرناک پہاڑی علاقوں میں بھی ان کا پاؤں کبھی غلط نہیں پڑتا۔ مشکل سے مشکل جگہ بھی جہاں اس کا پاؤں پڑ جاتا ہے' یہ چڑھ بھی جاتا ہے لیکن ان سے بھی زیادہ حیران کن ان کی دیکھ بھال کرنے والا عملہ تھا۔ ان ہی کی طرح بے زبان' حقوق کم اور فرائض زیادہ رکھنے والا۔ شاید ان خچروں سے بھی زیادہ سخت جان' محنتی اور جفاکش۔ رات کو دن اور دن کو رات کر دینے والے' بس ان کو کوئی کام دے دو اور بھول جاؤ' اس تسلی کے ساتھ کہ کام وقت سے پہلے ہو جائے گا اور ہوگا بھی بہترین۔ اپنے خچروں کی طرح ان کو بھی بس اشارے کی ضرورت تھی۔ انسان اور جانور سے مل کر یہ ایک ایسی ٹیم بنی تھی جس کا مقابلہ مشین بھی نہیں کر سکتی۔ ان میں بھی منتخب گنگو اور اس کا خچر تھے۔ صحت اور کارکردگی دونوں میں' دونوں ہی منفرد تھے۔ پیک ٹروپ صرف پہاڑی علاقوں کے لیے تھا۔ اگر یونٹ کو لڑنا یا کسی اور سلسلے میں میدانی علاقوں میں جانا ہوتا تو پیک ٹروپ کو وہیں چھوڑ دیا جاتا بلکہ پیچھے کے سارے فرائض بھی ان ہی کو سپرد کر دیے جاتے۔

ستمبر میں ہماری یونٹ باہر جا رہی تھی۔ اسی سلسلے میں مجھے پیک ٹروپ جانا پڑا۔ وہاں میری نظر گنگو پر پڑی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بھئی' کبھی تو بول لیا کرو۔'' جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گیا لیکن اس کا استاد حوالدار بشیر بولا۔

''سر! اب تو اسے بولنا ہی پڑے گا۔ یہی کیا' اب تو اس کا باپ بھی بولے گا۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سر! اسی مہینے کے دوسرے ہفتے میں اس کی شادی ہو رہی ہے' خود ہی بلوا لے گی اس سے۔''

''کیوں بھئی' کیا چکر ہے؟'' میں نے گنگو سے پوچھا۔ جواب کی بجائے گنگو نے شرما کر اپنے خچر کے پیچھے پناہ لے لی۔

بشیر نے بتایا۔ ''لڑکی اس کی ماموں زاد ہے۔ بچپن کی منگ ہے۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے میں اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔''

ستمبر کے پہلے ہفتے میں یونٹ تربیتی سلسلے میں سرحد چلی گئی۔ میں بھی ساتھ ہی تھا۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق چل رہا تھا کہ دس ستمبر کی رات کو کشمیر سے وائرلیس پر اطلاع ملی کہ چڑی کوٹ میں ہمارا ایک سپاہی گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔ بڑی پریشان کن خبر تھی۔ گولی کس کو لگی' کیسے لگی' بندہ زندہ بھی ہے یا مر گیا؟ سرحدی علاقہ تھا' کہیں بھارتی فون نے فائرنگ نہ کی ہو' کتنے ہی خیال تھے جو ذہن میں آئے لیکن جواب نہیں مل رہا تھا۔ آخر یہی مناسب سمجھا گیا کہ میں چڑی کوٹ جاؤں' حالات دیکھوں اور سنبھالوں۔ رات کوئی دس بجے میں جیپ پر روانہ

ہوا۔ میرا ڈرائیور اور آپریٹر میرے ساتھ تھے۔ رات کوئی تین بجے ہم لوگ ہجیرہ پہنچے۔ پہاڑی علاقے میں رات کا سفر بہت خطرناک تھا۔ ہجیرہ سے آگے کا سفر تو اور بھی مشکل اور خطرناک تھا اس لیے مناسب سمجھا کہ یہاں سے فون کرکے یونٹ سے معلومات لے لی جائیں۔

یونٹ فون کیا تو پتہ چلا کہ پیک ٹروپ کے سپاہی گل محمد نے جورات کو گارڈ ڈیوٹی پر تھا' خودکشی کرلی ہے۔ سارا جسم جیسے سن ہوکر رہ گیا۔ یہ ''گنگو'' کو کیا ہوگیا؟ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ تو کسی طرح بھی نہیں لگتا تھا کہ کوئی ایسی حرکت کرے گا۔ اس کے متعلق کوئی اس قسم کی رپورٹ بھی نہیں تھی۔ پتہ نہیں اس نے خودکشی کی بھی یا نہیں؟ کئی ایک خیالات ذہن میں آئے' کہیں قتل نہ کردیا گیا ہو؟ لیکن ایسے بے ضرر انسان کو کون قتل کرسکتا ہے؟ یہی سب کچھ تو میں دیکھنے اور معلوم کرنے آیا تھا۔ پتہ چلا کہ لاش کو سی ایم ایچ راولاکوٹ لایا گیا تھا جہاں اس کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور صبح سویرے اس کی نمازِ جنازہ تھی۔ آگے چڑی کوٹ جانا بے کار تھا کیونکہ لاش تو راولاکوٹ آ گئی تھی اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ راولاکوٹ سی ایم ایچ چلا جائے۔ ہم ابھی راولاکوٹ سے گزر کر آئے تھے۔ پتہ ہوتا تو وہیں رک جاتے۔ بہرحال واپس راولاکوٹ روانہ ہوگئے۔

میرا ذہن ہر طرح کے خیالات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خیال آیا' شاید گل محمد اپنا گنگو نہ ہو' کوئی اور ہو لیکن گل محمد تو پیک ٹروپ میں ہی نہیں' ساری یونٹ میں ایک ہی تھا اس لیے اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ حادثہ گنگو ہی کو پیش آیا تھا۔ موت نے بھی کس کو منتخب کیا تھا بندوں میں انتخاب گنگو۔ راولاکوٹ سی ایم ایچ پہنچے' گنگو کی لاش دیکھی' وہ بالکل اسی طرح تھا ہمیشہ کی طرح خاموش' بس اس کا خنجر اس کے ساتھ نہیں تھا' شاید اسی لیے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ یونٹ کے اور بھی کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ کچھ ضروری اقدامات کرنے تھے جو کیے۔ صبح اس کی نمازِ جنازہ پڑھ کر اس کی لاش اس کے گھر رخصت کی اور خود چڑی کوٹ روانہ ہوگئے۔

اب دن کا سفر تھا' بڑا خوبصورت علاقہ ہے' یہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ اردگرد کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ راستے میں ہجیرہ آفیسرز میس میں رک کر چائے پیتے اور گپ شپ لگا کر آگے بڑھتے ہیں لیکن آج گنگو نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اگر کوئی منظر نظر کے سامنے تھا تو وہ گنگو کا مسکراتا چہرہ تھا۔ تیسرے دوسرے ہفتے میں تو اس کی شادی ہونی تھی۔ اس کے گھر میں تو تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ اب جب اس کی لاش پہنچے گی تو کیا منظر ہوگا؟ کہرام مچ جائے گا۔ اس کی ''منگ'' کا کیا حال ہوگا جو شاید بچپن سے اس کی منتظر تھی؟ اس کے بوڑھے والدین اور بہن بھائیوں پر کیا گزرے گی جو پتہ نہیں کب سے خوشی کے ان چند لمحوں کے منتظر ہوں؟ غریبوں کی زندگی میں خوشی کے لمحے ہوتے ہی کتنے ہیں' یہی چند تو ہوتے ہیں۔ آج یہ بھی قدرت نے ان سے چھین لیے تھے۔ کوئی دس بجے چڑی کوٹ پہنچے۔ ہمیشہ کی ٹھنڈی خوشگوار فضا' آج بڑی ہی سوگوار تھی۔ چڑی کوٹ ہم لوگ ہمیشہ شوق اور خوشی سے آتے تھے۔ جگہ بھی خوبصورت تھی پھر اپنی یونٹ اور اپنے لوگ تھے۔ ماحول بے تکلف اور اپنائیت لیے ہوتا اس لیے مزہ آتا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سب افسردہ تھے۔

وقوعہ کی جگہ دیکھی' گواہوں سے ملے اور

سارے حالات و واقعات معلوم کیے۔ پتہ چلا کہ گنگو بہت ہی خوش تھا۔ تیرہ ستمبر کو اس کی شادی تھی جس کے لیے اس کی چھٹی بھی منظور ہو چکی تھی' بس وہ چھٹی جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ اس دن اس نے خاص طور پر غسل کیا اور خوب بنا سنورا ورنہ عام حالات میں وہ غسل اور صفائی کا زیادہ خیال نہیں کرتا تھا۔ خود سے زیادہ اسے اپنے خنجر کی صفائی کی فکر ہوتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کو سارا دن چھیڑتے رہے کہ بنتی سنورتی تو دلہن ہے' تم کیوں یہ بناؤ سنگھار کررہے ہو؟ کہیں اس لیے تو نہیں کہ بھابی کو تم سے خنجر کی بو نہ آئے۔ جواباً وہ صرف حسبِ معمول مسکرا دیتا تھا پھر شام کی ڈاک میں اس کا کوئی خط آیا۔ اس نے کسی کو بھی اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اس کی شادی کے معاملات چل رہے تھے اس لیے کسی نے پوچھنا مناسب بھی نہیں سمجھا۔

گارڈ کمانڈر نے بتایا۔ ''رات وہ میری گارڈ میں تھا۔ پہلی ڈیوٹی اسی کی تھی جو آٹھ بجے شروع ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بجے فائر کی آواز آئی تو میں کمرے سے باہر نکلا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ڈھونڈا پھر یہ مجھے ایک بنکر میں پڑا مل گیا۔ گولی عین اس کے دل میں لگی تھی اور وہ فوت ہو چکا تھا۔ رائفل اور خط اس کے پاس ہی پڑے ہوئے تھے۔'' گارڈ کمانڈر نے خط جیب سے نکال کر میرے حوالے کردیا۔ میں نے خط پڑھا۔ ''8 ستمبر کو آزاد کشمیر کے ایک سرحدی گاؤں میں رہائشی اس کے ماموں سسر اور اس کی ''منگ'' دونوں بھارتی گولہ باری سے شہید ہوگئے تھے۔ اس کی خودکشی کی وجہ واضح تھی۔ بندوں میں منتخب گنگو نے اپنے محبوب' اپنے ڈھولے سے ملنے کا راستہ بھی منفرد تیار کیا تھا' شاید وہی جس پر اس کی ''منگ'' روانہ ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے اس دن اتنا بناؤ سنگھار بھی کیا تھا۔

شام کو یونٹ کا چکر لگانے کے لیے نکلا تو میں پیک ٹروپ بھی گیا۔ فضا بڑی اداس تھی۔ میں گنگو کا خنجر دیکھنے گیا' وہ مجھے خاصا کمزور نظر آیا' اس کی جلد میں بھی وہ چمک نہیں تھی۔ ڈاکٹر اور حوالدار بشیر میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوگیا ہے؟'' میرے سوال پر دونوں نے منہ دوسری طرف کرلیا۔ شاید آنسو چھپا رہے تھے۔ آخر بشیر بولا۔ ''سر! یہ کچھ کھا نہیں رہا' اس کی خوراک بہت کم ہوگئی ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''سر.....! یہ بے زبان تو ہے لیکن بہت پیار کرنے والا جانور ہے۔ گنگو کے پیار اور ہاتھ کا عادی ہے۔ اب دوسرے ہاتھ سے نہیں کھاتا۔ گنگو کی تو اس میں جان تھی۔ اب خوراک تو ہے لیکن ہم اسے وہ پیار کہاں سے لاکر دیں جو اسے گنگو دیتا تھا؟ یہ تو ہاتھ کی گرمی اور جسم کی خوشبو تک پہچانتے ہیں۔ کسی دوسرے کے ہاتھ سے کیسے کھائے؟''

''کوشش کرتے رہو' شاید سمجھوتہ کرلے۔ کب تک بھوکا رہے گا؟'' کہہ کر میں نے خنجر کی گردن تھپتھپائی اور وہاں سے واپس آ گیا۔ پیک ٹروپ سے نکلتے ہوئے میں نے دیکھا' وہاں کی فضا کتنی اداس تھی۔ خوش و خرم رہنے والا پیک ٹروپ ایک ویرانہ لگتا تھا۔ میں نے سوچا' ایک معمولی سے شخص' ایک عام سے سپاہی' ایک غریب سے سائیس نے کیا کچھ بدل ڈالا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے رُت ہی بدل گئی ہو.....

اب جب بھی میں یہ گانا سنتا ہوں'
کر کے ہار سنگھار ملسا ڈھولے نوں
مجھے گنگو یاد آتا ہے۔

.....☆☆.....

بے خبری رہی

سیدہ تبسم زہرا رضوی

مایہ تیرے کتنے روپ، کتنے تیرے جال
سب ہی ہیں یہ جی کا روگ سارے ہی جنجال

نواب شاہ سے پانچویں پرائز کہانی

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میری اور میرے بھائی کی شادی کے ابتدائی ایام تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی' شاید انسان کی زندگی میں یہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ جب کچھ وقت وہ اپنی مرضی سے جی لیتا ہے ورنہ تو بچپن والدین کی مرضی سے' جوانی آنے نہیں پاتی کہ ذمے داریاں منہ کھولے بیٹھی ہوتی ہیں۔ انہی حالات میں اگر ساتھی نصیب ہوجاتا ہے تو انسان خود کو مضبوط محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سے دکھ سکھ شیئر کرتا ہے اور مستقبل کی پلاننگ کرتا ہے لیکن میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ میرے اور میرے بھائی کے کمرے کے درمیان ایک بڑا روشن دان تھا اور ہماری باتیں دوسرے کمرے میں سنی جاسکتی تھیں کیونکہ اکثر اُن کی آوازیں ہمارے کمرے میں سنی جاسکتی تھیں جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ ہماری آوازیں بھی وہاں جاتی ہوں گی۔ اُس روشن دان میں ہم فوری طور پر کھڑکی لگانے کے قابل نہیں تھے کیونکہ ہمارا شمار غریب طبقے میں ہوتا تھا اور ہمارے والدین ابھی تو ہماری شادی سے فارغ ہوئے تھے' مزید کچھ خرچ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک کھڑکی ہو جو اس روشن دان میں لگا دی جائے جسے جب چاہیں' بند کرلیں اور جب چاہیں' کھول لیں۔

غربت ضرور تھی لیکن دین سے دوری نہیں تھی ورنہ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک کھنڈر نما مکان رفتہ رفتہ زمیں بوس ہو رہا تھا۔ اس میں کئی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں ڈیوٹی پر آتے جاتے اُس طرف دیکھتا' ایک کھڑکی کا سائز تقریباً ہمارے روشن دان کے برابر تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ مٹی کے ڈھیر سے کھڑکی نکال لوں لیکن گھر میں دی ہوئی اسلامی تعلیمات آڑے آجاتیں۔

اُس گھر میں ایک چپل فروش رہتا تھا۔ تمام دن کی محنت و مشقت کے بعد جو کچھ ملتا' اُس سے بمشکل چولہا جلتا۔ مکان کی مرمت اس کے لیے ناممکن سی بات تھی۔ یہ جگہ سندھ کا چھوٹا قدیم شہر تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جسے وہاں کے لوگ (ہلو کراچی) کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی لوگ مکان بیچ بیچ کر کراچی کا رخ کررہے تھے' چنانچہ چپل والے نے بھی مکان بیچنے کی ٹھان لی۔ چپل والے کا یہ خیال تھا کہ مکان ساٹھ' ستر ہزار روپے میں فروخت ہوجائے گا اور وہ کراچی میں اپنا ٹھکانہ کرلے گا' چنانچہ اس نے مکان پر 'برائے فروخت' کا بورڈ لگا دیا۔ گاہک آنے لگے۔ ایک دن اس کے پاس ایک بیس' بائیس سال کا لڑکا آیا اور تھوڑی بارگیننگ کے بعد مکان کے 75 ہزار روپے دینے پر تیار ہوگیا۔ چپل والا اپنے بھائی کے پاس مشورہ کرنے گیا جو قریب میں رہتا تھا۔ بھائی نے کہا کہ تم نے کم قیمت لگائی ہے' میں بات کرتا ہوں۔ اس نے لڑکے سے قیمت پر جرح شروع کی اور بات ایک لاکھ روپے پر ٹھہر گئی۔ لڑکے نے گواہوں کی موجودگی میں بیعانہ دے دیا۔ چھوٹے شہروں اور گاؤں میں آج بھی وڈیرہ شاہی ہے اور اُس دور میں بھی تھی۔ وڈیرے کے کارندے تمام شہر یا گاؤں کی رپورٹ رات کو وڈیرے کو دیتے ہیں۔ چنانچہ رات تک اس مکان کے فروخت ہونے کی خبر وڈیرے تک پہنچ گئی۔

اُس زمانے میں یعنی 80ء کی دہائی میں ایک لاکھ ایک بڑی رقم تھی۔ 75 ہزار سے ایک لاکھ پر آجانا وڈیرے کے لیے حیرت کی بات تھی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

''خریدار کون ہے؟'' وڈیرے نے کارندے

سے پوچھا۔

"کوئی بندہ ہے' اس سے پہلے گاؤں میں نہیں دیکھا گیا۔"

"باہر سے آنے والے پر نظر رکھو بابا!"

جب اُس لڑکے پر نظر رکھی گئی تو معلوم ہوا کہ مکان کی لگائی جانے والی قیمت ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ ہو گئی ہے۔ اب تو وڈیرہ چونک پڑا۔ چپل والے کا بھائی مستقل رقم میں اضافہ کروا رہا تھا۔ چھوٹی جگہوں پر لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ یہ لڑکا اجنبی تھا۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کیوں اس چھوٹی سی جگہ کو خریدنا چاہتا ہے؟ یہ جاننے کے لیے وڈیرے نے اُسی رات اُس لڑکے کو اغوا کروالیا۔ ساری رات تشدد کے بعد جو رزلٹ سامنے آیا' وہ کچھ یوں تھا کہ وہ لڑکا ہندو تھا۔ تقسیم سے قبل کسی جوتشی نے اس لڑکے کے دادا کو یہ بتایا تھا کہ یہ مال و دولت تمہارے پاس سے جا رہا ہے' تمہیں خسارہ ہونے والا ہے اور اس کے دادا نے اس کا حل یہ نکالا تھا کہ اپنا سارا کاروبار فروخت کر کے پیسا سونے کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ سونے کی سلاخیں کھڑکیوں میں نصب کیں اور ان پر گہرا آسمانی پینٹ کروا کر پیسا محفوظ کر لیا پھر ملک کے حالات خراب ہوئے اور تقسیم پر منتج ہوئے۔ اس کے دادا کو فوری طور پر ہندوستان جانا پڑا کیونکہ اس نے افراتفری میں کوچ کیا تھا اس لیے سلاخیں یہیں رہ گئیں۔ برسوں بعد ایک روز اس نے اپنے پوتے کو ان سونے کی سلاخوں کے متعلق بتایا تو وہ سن کر جوش میں آ گیا اور کہا۔

"دادا......! میں وہاں جاؤں گا۔"

پہلے تو دادا نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانا تو دادا نے پوری طرح پتا سمجھا کر بھیجا کہ کسی طرح وہ مکان خرید لینا۔ مرمت کے بہانے اس کی سلاخیں نکال لینا پھر اپنی ہندو برادری کے کسی سنار کو خط بھی لکھ کر دیا تھا کہ جس قدر ہو سکے' سونا فروخت کر دینا اور مکان بیچ کر انڈیا واپس لوٹ آنا۔

وڈیرے نے لڑکے کو اس شرط پہ چھوڑا کہ فوراً پاکستان چھوڑ دے۔ وہ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا پھر وڈیرے نے چپل والے کے ہاتھ پر دو لاکھ روپے رکھ دیے۔ وہ بھی اپنا کل اثاثہ جو چند ٹوٹی چارپائیوں' ٹین کے ڈبوں' بستر کے نام پر گدڑے چیتھڑے اور کچھ ٹوٹے پھوٹے برتنوں پر مشتمل تھا' یہ سب لے کر اسی رات اپنے بیوی بچوں سمیت کراچی آ گیا۔ یہاں کچی آبادی میں گھر خرید لیا۔ وہیں دکان بھی مل گئی۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ میرے دن پھر گئے۔ پہلے فاقہ کرنے پڑتے تھے' اب پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا ہے۔ پہلے گلی گلی پھر کر چپل فروخت کرنی پڑتی تھی' اب دکان میسر ہے مگر اسے شاید اب بھی پتا نہ ہو کہ جس گھر میں ان کے بچے بھوکے سوتے تھے' اس میں سونے کی سلاخیں لگی تھیں' وہ تو وہیں رہ گئیں۔

آج جب یہ بات اپنے بچوں کو بتاتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ بابا......! کاش' آپ وہ کھڑکی ساتھ لے آتے لیکن اگر میں لے بھی آتا تو ہم کب اتنے عقل مند تھے کہ اس کا پینٹ کھرچنے کی زحمت کرتے۔ یہ ہم پر اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں ناجائز دولت سے محفوظ رکھا۔ اور ہاں' آپ سوچ رہے ہوں گے کہ سونے کی سلاخوں کی یہ تمام کہانی مجھے کیسے معلوم ہوئی؟ تو عرض ہے' وڈیرے کے ایک کارندے سے میرے تعلقات تھے' اسی نے مجھے کافی عرصہ بعد یہ سب کچھ بتایا تھا۔

......☆☆......

ناقابل یقین کہانی

اگھنٹی

عائشہ خان

بے گھری محسوس کرتا ہوں میں گھر میں ہوتے ہوئے
جانے کیسا خوف ہے یہ بام و در ہوتے ہوئے

میرپور خاص سے پہلی ناقابل یقین کہانی

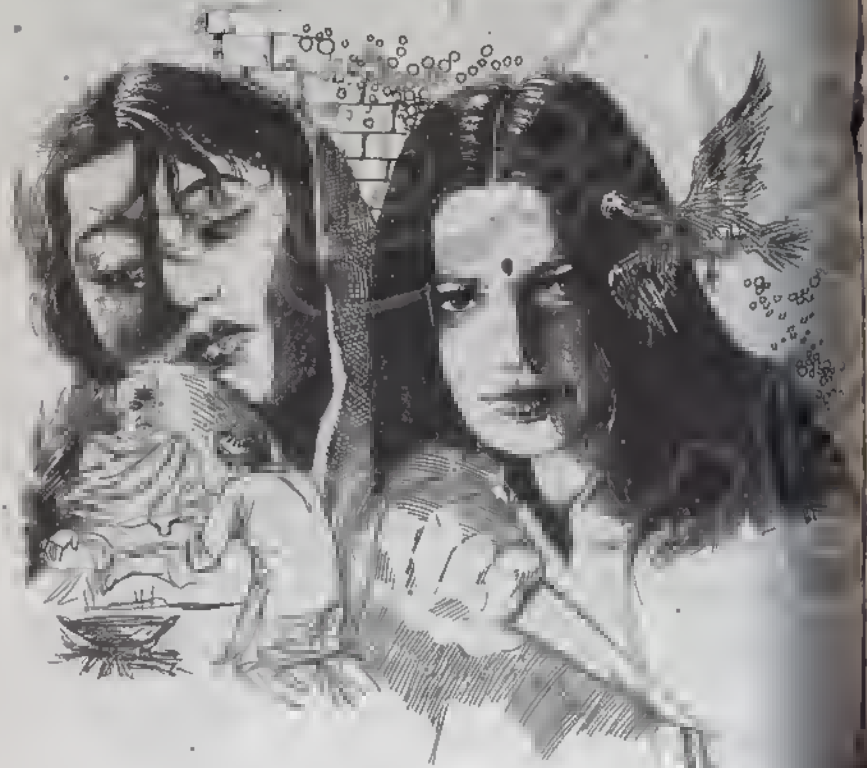

انسان کی زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن پر خود اسے بھی یقین نہیں آتا لیکن وہ واقعات اپنے پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ میری زندگی میں بھی ایسے کئی واقعات پیش آئے۔

انسانوں اور جنوں کے علاوہ بھی دنیا میں ایک مخلوق بستی ہے اور یہ مخلوق شاید روشنی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے۔

میں اُس وقت سات سال کی تھی جب پہلی مرتبہ اس مخلوق سے میرا واسطہ پڑا۔ یہ جنات نہیں تھے۔ اس کا ثبوت تو میرے پاس بھی نہیں کہ یہ جنات کیوں نہیں تھے مگر کچھ ایسا ضرور تھا جس کی وجہ سے میں اور میرے گھر والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ جنات نہیں بلکہ کوئی اور مخلوق ہے۔ یہ واقعہ لکھتے ہوئے بھی خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔

سردیوں کا موسم تھا اس لیے لحاف میں دبک کر سو رہی تھی۔ رات کو کسی وقت میری آنکھ کھلی۔ اُس دن سردی کچھ زیادہ تھی۔ کمرے میں بجلی کا ہیٹر لگا ہوا تھا۔ ہیٹر کی روشنی سے کمرے کی دیواریں نارنجی رنگ کی لگ رہی تھیں۔

اچانک میری نظر سامنے والی میز پر پڑی۔ وہاں ایک نہایت خوب صورت عورت بیٹھی تھی جس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال شانوں پر آگے کی طرف پڑے تھے لیکن اس کے جسم سے شعاعیں نکل رہی تھیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی گردن پر سرخ رنگ کا ربن تھا۔ اُس ربن میں خوب صورت سی سنہری گھنٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں اُسے دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہلوں گی تو وہ مجھے دبوچ لے گی۔ اس سردی میں بھی مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ دماغ بالکل سُن ہو گیا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی کہ چاہتے ہوئے بھی میں چیخ نہیں سکتی تھی۔ میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے پھر نہ جانے مجھ میں کہاں سے ہمت آئی کہ میں بستر سے نکل کر بھاگی تو پیچھے سے عجیب سے قہقہے کی آواز آئی۔

میں امی ابو کے کمرے کے دروازے پر گر گئی۔ وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے اور مجھے اٹھا کر اندر لے گئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں خواب میں ڈر گئی ہوں لیکن وہ قہقہے کی آواز' آج بھی اس کی آواز میں اپنے کانوں میں محسوس کرتی ہوں۔ اس واقعے کے بعد میں اپنی بہن کو کمرے میں اپنے ساتھ سلانے لگی۔

ہم تین بہنیں ہیں۔ امی' ابو سب ملا کر پانچ افراد ہیں۔ ابو سرکاری ڈاکٹر ہیں اس لیے اُن کے تبادلے مختلف جگہوں پر ہوتے رہتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناتے میں اُسے رُوح تو نہیں کہہ سکتی مگر وہ جناتی مخلوق بھی نہیں تھی۔ سارے گھر والے اسے میرا وہم سمجھ رہے تھے۔

ایک دو دن گزرنے کے بعد مجھے بھی یہی محسوس ہونے لگا کہ شاید میں نے خواب دیکھا تھا لیکن ایک دن میز کی صفائی کرتے ہوئے مجھے میز کی کیل میں سفید کپڑے کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا پھنسا ہوا ملا۔ میز پر ایک جگہ کیل سی نکلی ہوئی تھی جس میں اگر کپڑا پھنس جاتا تو پھٹ کر ہی نکلتا تھا۔ وہ ٹکڑا ہم میں سے کسی کے کپڑوں کا نہ تھا اور یہ اس مخلوق کی موجودگی کا پہلا ثبوت تھا۔

ابو کا تبادلہ دوسری جگہ ہو گیا۔ اس مرتبہ ہمیں جو مکان ملا' وہ نہایت گنجان آباد علاقے میں تھا۔ مین روڈ نزدیک ہی تھا اس لیے ہر وقت گاڑیوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گھر بہت بڑا تھا۔ وہاں وسیع و عریض لان بھی تھا بلکہ اسے باغ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس میں آم' امرود اور کیلے کے درخت بھی

تھے۔ باغ کے ایک ویران سے گوشے میں پیپل کے کئی گھنے درخت تھے۔ وہاں دن میں بھی اندھیرا سا رہتا تھا۔ ہم نے مل کر وہاں صفائی کی' ایک بلب لگوایا اور گرمیوں کی شامیں وہاں گزارنے لگے۔

وہاں بہت سی بلیاں تھیں۔ مجھے جانور پالنے کا بہت شوق تھا اس لیے سارا دن بلیوں کے ساتھ کھیلنے میں گزر جاتا۔ ہمارا گھر اسکول سے قریب تھا اس لیے پیدل ہی آنا جانا ہوتا تھا۔ گھر میں ایک کمرا' ڈرائنگ روم اور کچن نیچے تھا۔ تین کمرے اور لاؤنج اوپر کی منزل پر تھے۔ ایک چھوٹی سی اسٹڈی بھی تھی۔ اوپر والی منزل کی طرف لکڑی کی خوب صورت سیڑھیاں جاتی تھیں جو لاؤنج میں کھلتی تھیں۔ امی ابو نیچے سوتے تھے اور ہم تین بہنوں کے کمرے اوپر تھے۔ میرا کمرا بالکل سیڑھیوں کے سامنے تھا۔ اگر دروازہ کھلا ہوتا تھا تو سیڑھیاں نظر آتی تھیں۔

میں اُس وقت نویں کلاس میں تھی اور چھوٹی دونوں جڑواں بہنیں آٹھویں میں پڑھتی تھیں۔ میں رات دیر تک پڑھتی رہتی تھی۔ ایک دن رات کو دو ڈھائی بجے کے قریب میں نے پڑھائی ختم کی اور باہر نکلی تاکہ پانی پی کر سو جاؤں۔ جیسے ہی دروازہ کھولا' سیڑھیوں پر کچھ عورتیں نظر آئیں۔ وہ زور زور سے لاٹھیاں ٹیک کر چڑھ رہی تھیں۔

میرے قدم وہیں جم گئے۔ ایک نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ اُن کی لاٹھیوں کے سروں پر سرخ ربن میں سنہری گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں' اتنا ضرور تھا کہ انہیں دیکھ کر خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ نہ ان کے چہرے بھیانک تھے۔ انہوں نے سفید لباس پہن رکھے تھے۔ جو عورت مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی' وہ قمیص کا پھٹا ہوا دامن اٹھا کر مجھے دکھانے لگی۔ شاید وہ اس کا پھٹا ہوا ٹکڑا مانگ رہی تھی۔ وہ ٹکڑا میرے پاس بھلا کہاں سے آتا؟ اس واقعے کو تو کئی سال گزر گئے تھے۔

میں ایک دم پلٹی اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگیں۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں ویسی ہی تھیں جو میں نے پہلی دفعہ سنی تھیں۔ میں نے اونچی آواز میں آیت الکرسی پڑھی۔ آخری آیت پر کھٹ کھٹ بند ہو گئی۔ پھر میں ہمت کر کے چیخنے لگی۔ اتنی زور سے چیخی کہ بہنیں اٹھ گئیں۔ ایک نے جا کر امی ابو کو جگا دیا۔ اف' خوف کا وہ چھوٹا سا لمحہ میری ساری زندگی کے خوف ناک واقعات پر بھاری ہے پھر میں بے ہوش ہو گئی۔

اگلے دن ہوش میں آنے کے بعد میں نے سب کو رات کا واقعہ سنایا۔ امی کو تو یقین آ گیا مگر بہنوں کو نہ آیا لیکن جب ہم نے سیڑھیاں دیکھیں تو لکڑیاں مارنے کی وجہ سے ان میں جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ آوازیں صرف مجھے سنائی دی تھیں۔ گھر کے کسی دوسرے فرد نے ہلکی سی آواز بھی نہیں سنی تھی۔

امی نے گھر میں قرآن خوانی کروائی تو میرا خوف بھی خاصا کم ہو گیا۔ ہم وہاں ایک سال رہے۔ اس دوران میں کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

پھر ایک دن اچانک بہت عجیب بات ہوئی۔ گرمیوں کا موسم تھا لیکن اُس دن صبح کے وقت بارش ہوئی تھی۔ رات کو ہوا بھی اچھی خاصی چل رہی تھی۔ میں کھڑکیاں کھول کر سوئی تھی۔

رات کو اچانک میری آنکھ کھلی تو میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ پتا نہیں میں وہاں تک کیسے پہنچی تھی؟ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے' چاند کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا' کبھی نکل آتا تو ہر طرف ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی پھیل جاتی۔ نہ جانے کیوں مجھے باہر کے ماحول سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے

چاہا کہ کھڑکی بند کر کے سو جاؤں مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ پیپل کے درخت کے نیچے بلب روشن تھا۔ اچانک وہاں میں نے انہی عورتوں کو دیکھا۔ وہ حسب معمول سفید لباس میں ملبوس تھیں اور کچھ پڑھ رہی تھیں شاید منہ ہی منہ کوئی جاپ کر رہی تھیں۔

جاپ کی آواز آہستہ آہستہ اونچی ہونے لگی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس آواز کے سحر میں کھو گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی انجانی طاقت نے مجھے وہاں روک رکھا ہے۔ میں وہ آواز سنتی رہی۔ جب ان کا جاپ ختم ہوا تو میں اطمینان سے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ صبح اٹھی تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس طرح اس ماحول کا حصہ بن گئی اور کیوں جاپ سننے کے بعد میں نے اطمینان محسوس کیا؟

میرے لیے یہ تمام واقعات معما بن گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ عورتیں صرف مجھے ہی کیوں نظر آتی ہیں؟ گھر میں اور افراد بھی تو ہیں لیکن میرے سوالات کا کسی کے پاس جواب نہ تھا۔

میری حالت دیکھ کر امی مجھے ماہر نفسیات کے پاس بھی لے کر گئیں۔ اس نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر پھر کچھ ہو تو کسی منفی ردعمل کی بجائے خاموشی سے تماشا دیکھوں۔ اس نے کچھ دوائیں بھی دیں جن میں خواب آور گولیاں زیادہ تھیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہوں لیکن کچھ دن بعد ایسا واقعہ پیش آیا جس سے سب کو یقین آ گیا کہ یہ نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ کمرے میں صرف میری بہن تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کسی چیز کے لیے آگے بڑھائے تو وہ آگے کو کھسک گئی۔ میں سمجھی میرا وہم ہے۔ میں کان کھجانے کے لیے ہاتھ کان کے قریب لائی تو اسی جاپ کی آواز سنائی دی جو میں نے اس رات سنی تھی۔

میں نے بار بار ایسا کیا۔ جب میں ہاتھ کان کے قریب لے جاتی' جاپ کی آواز آتی۔ میں نے بہن کو نزدیک بلایا اور دونوں ہاتھ اس کے کانوں پر رکھ دیے۔ اسے بھی آواز سنائی دی پھر میرے پورے جسم سے اس جاپ کی اونچی آواز آنے لگی۔ اب میں گویا اس منحوس آواز کے حصار میں تھی اور چاہتے ہوئے بھی اس سے پیچھا چھڑانے میں ناکام تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے جسم کو کاٹ کر پھینک دوں۔ میں نے حواس مجتمع کر کے آیت الکرسی کا ورد شروع کیا تو وہ آواز یک لخت موقوف ہو گئی پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو سبھی میرے سرہانے موجود تھے۔ امی رو رہی تھیں۔ ابو بھی بہت پریشان تھے لیکن کسی کے پاس اس کا کوئی حل نہ تھا۔ امی نے قرآن خوانی کروائی۔ نفسیاتی علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔

پھر ہم وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک سال گزر گیا تھا' کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ ہم فلیٹ میں شفٹ ہو گئے تھے۔ میں انٹر کا امتحان دے کر فارغ ہو گئی تھی۔ نئے گھر میں سیٹ ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ ابھی تک صحیح طرح سے ہمارا سامان سیٹ نہیں ہوا تھا۔ گھر کا سارا کباڑ میرے کمرے میں تھا کیونکہ وہ ذرا کونے میں تھا۔

امی کو اچانک گاؤں جانا پڑ گیا۔ جاتے جاتے وہ ہم تینوں کو ہدایت دے گئیں کہ جب تک میں واپس آؤں' گھر کی سیٹنگ کر لو۔ میں دو تین دن میں لوٹ آؤں گی۔ ابو بھی امی کے ساتھ ہی جا رہے تھے۔

اُن کے جانے کے بعد کال بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک نوکری میں خوب صورت سی ایک بلی بیٹھی تھی' برف کے گالے کی طرح سفید۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کا ربن اور سنہری گھنٹی تھی۔

اسے دیکھ کر میں کچھ ٹھٹک سی گئی مگر وہ اتنی خوب صورت تھی کہ میں اسے اندر لے آئی۔ بہنوں کو بلا کر بلی دکھائی۔ پہلے تو وہ ناراض ہوئیں کہ اسے کیوں اندر لائی ہو لیکن اس کی خوب صورتی دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

دن کا وقت تھا مگر میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ چیزیں الٹ پلٹ پڑی تھیں۔ میں بلی کو لاؤنج میں چھوڑ کر اس کے لیے دودھ لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ میرے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتی' لائٹ چلی گئی۔ میرے کمرے میں تو پہلے ہی اندھیرا تھا ورنہ میں لائٹ آن کر کے اسے تلاش کر لیتی۔ اب تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہن سے کہا کہ کہیں سے موم بتی یا لالٹین ڈھونڈ لے کیونکہ اگر رات کو بجلی چلی گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی موم بتی ملی بھی نہ تھی کہ لائٹ آ گئی اسی لیے بہن نے موم بتی کی تلاش چھوڑ دی۔ بلی باہر نکل آئی اور دودھ پینے لگی۔

سارا دن کام میں گزر گیا۔ شام کو میں ایٹینا لگانے اوپر گئی تو لائٹ پھر چلی گئی۔ نیچے آئی تو عجیب سناٹا تھا۔ دونوں بہنیں سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا' ایسے کیوں کھڑی ہو؟"

"کہیں سے بلی کے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔"

اب میں نے بھی وہ آواز سنی۔ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا اور بہنوں پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ میرے کہنے کے باوجود نہ انہوں نے موم بتی ڈھونڈی نہ لالٹین۔

ہم تینوں بالکونی میں نکل آئے۔ باہر ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اچانک بالکونی کا دروازہ کسی نے اندر سے بند کر دیا۔ ہم فرسٹ فلور کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ نیچے چھلانگ مار کر اترنا مشکل تھا مگر ناممکن نہ تھا۔

ہم نے دروازہ پیٹا مگر کسی نے نہ کھولا۔ میں نے بالکونی سے نیچے چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا۔ بہنوں سے کہا کہ گھبرائیں نہیں اور میرا انتظار کریں تاکہ میں اندر سے دروازہ کھول سکوں۔

اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں لائٹ کا نہ ہونا اور بلی کا رونا' مارے خوف کے ہم سب کا برا حال تھا۔ میں ہمت کر کے نیچے کود گئی تو اچانک لائٹ آ گئی۔ کودنے سے پاؤں میں موچ بھی آ گئی۔ بہنوں نے بتایا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ میں لنگڑاتی ہوئی اوپر آ گئی۔ میرے کمرے میں اب بھی اندھیرا تھا۔ میں لائٹ کا سوئچ ٹٹولنے لگی مگر نہیں ملا۔ اچانک لائٹ خود بہ خود آن ہو گئی۔ میں بہت حیران ہوئی۔

اچانک مجھے بلی نظر آئی اور پھر پتا نہیں اس کباڑ خانے میں کہاں جا گھسی؟ میں اسے ڈھونڈنے لگی۔ مجھے بیڈ کے نیچے اس کی ایک جھلک دکھائی دی پھر غائب ہو گئی۔

لائٹ ایک مرتبہ پھر چلی گئی لیکن تھوڑی دیر بعد آ گئی۔ بجلی کی اس آنکھ مچولی سے میں کڑھ بھی رہی تھی اور بلی سے خوف زدہ بھی تھی۔

چیخ کی آواز سن کر میں کمرے سے باہر نکلی تو دیکھا کہ وہ بلی میری بہن کے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ میں نے کسی چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا پھر مجھے کرسی کا ٹوٹا ہوا ایک ہتھا نظر آیا۔ میں نے جھپٹ کے وہ اٹھایا اور بلی کو دے مارا۔ اس نے بہن کا پاؤں چھوڑ دیا اور غرا کر میری طرف پلٹی۔ وہ بری طرح غرا رہی تھی پھر اس کے غرانے کی آواز اسی جاپ میں بدل گئی جو عورتیں کر رہی تھیں۔

میں ڈر گئی۔ جس بہن کو بلی چمٹی تھی وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ دوسری ڈر کر رونے لگی۔ میں بھی خوف

سے ساکت ہوگئی تھی۔ بلی نے ایک دم مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن میں بچ گئی۔ میں نے آیت الکرسی کا وِرد کرنا چاہا مگر میں گنگ ہو کر رہ گئی۔

بلی غرا کر ایک مرتبہ پھر میری طرف بڑھی۔ مجھ میں نہ جانے کیسے اتنی ہمت آ گئی کہ میں پلٹ کر بھاگ اٹھی مگر ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ بلی نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے دونوں پیروں سے بلی کو دور اچھال دیا۔

میری بہن نے ڈنڈا اٹھا کر بلی کو مار دیا۔ بلی غصے میں پلٹی اور بہن کے ہاتھ سے چمٹ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا ہاتھ لہولہان ہوگیا۔ خون کے چھینٹے میرے چہرے اور کپڑوں پر بھی گر گئے۔ میں نے ہمت کر کے بلی کو دُم سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور پوری قوت سے دور اچھال دیا۔

خوف کی شدت سے دونوں بہنیں بے ہوش ہوگئی تھیں۔ میری زبان بھی اکڑ کر رہ گئی تھی۔ بلی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر گری۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی، میں نے پوری قوت سے اسے لاتیں ماریں پھر نزدیک پڑا ہوا ڈنڈا مجھے نظر آ گیا۔ اس وقت مجھ پر جیسے جنون سوار ہوگیا تھا۔ میں نے ڈنڈا اٹھایا اور خاصی طاقت سے بلی کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب سے وہ منحوس بلی بے ہوش ہوگئی پھر رسی سے اس کی گردن میں پھندہ ڈال کر اسے جھٹکے سے اٹھالیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور بلی نے تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد جان دے دی۔

مجھے خود بھی حیرت تھی کہ مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی؟ میں نے تو اس سے پہلے چیونٹی تک کو نہیں مارا تھا۔ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھی۔ میں نے بلی کی لاش کو ایک طرف پھینکا اور بہنوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ ہوش میں نہ آئیں۔ میں نے انہیں گھسیٹ کر بستر پر لٹایا، ان کے زخم صاف کیے۔ جس بہن کے ہاتھ پر بلی نے کاٹا تھا، اس کے زخم پر بہت سا اسپرٹ ڈالا اور کس کے پٹی باندھ دی۔

باہر نکلی تو مجھے شدید دھچکا لگا، وہ منحوس بلی پھر زندہ حالت میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے مکروہ سا سایہ نظر آنے لگا پھر اس کا قد بڑھنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں گر گئی۔ وہ میرے سینے پر آ کھڑی ہوئی۔ میں ہل تک نہیں سکتی تھی، دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔

پھر نہ جانے کیسے مجھ میں ایک بار پھر ہمت پیدا ہوئی، شاید موت سامنے دیکھ کر ہر انسان میں اسی طرح مزاحمت کی قوت بیدار ہو جاتی ہے۔ میں نے بلی کی گردن دبوچ لی اور اسے پوری قوت سے دبانے لگی۔ اس نے میرے ہاتھوں پر بہت پنجے مارے مگر میں نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔ چند منٹ بعد بلی پھر مر گئی......

میں تھکن سے چُور ہو کر فرش پر گر پڑی پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو میں صحیح سلامت بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ امی مجھے اٹھا رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ اٹھو، میں گاؤں جا رہی ہوں یعنی وہ ابھی گاؤں گئی ہی نہیں تھیں۔ بہنوں کو چوٹ بھی نہیں لگی تھی۔ وہ خوفناک شام اور رات صرف خواب تھا۔

نیند سے اٹھنے کے بعد بھی میرا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ امی سمجھیں کہ میں خواب میں ڈر گئی ہوں مگر میری مٹھی میں وہ سنہری گھنٹی اور سرخ رِبن موجود تھا جو بلی کی گردن میں بندھا ہوا تھا۔

اگر وہ خواب تھا تو یہ گھنٹی کہاں سے آئی؟ آج تک کسی نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ سب مجھے وہمی سمجھتے ہیں مگر وہ گھنٹی آج بھی میری سچائی کی دلیل ہے۔

•.....•.....•.....•

اِک پل کا عذاب

سیدہ جعفری

جو گزری ہے میرے معصوم دل پر
وہ سچ سچ بول دینا چاہتی ہوں

بحرین سے [illegible] کی ناقابل یقین کہانی

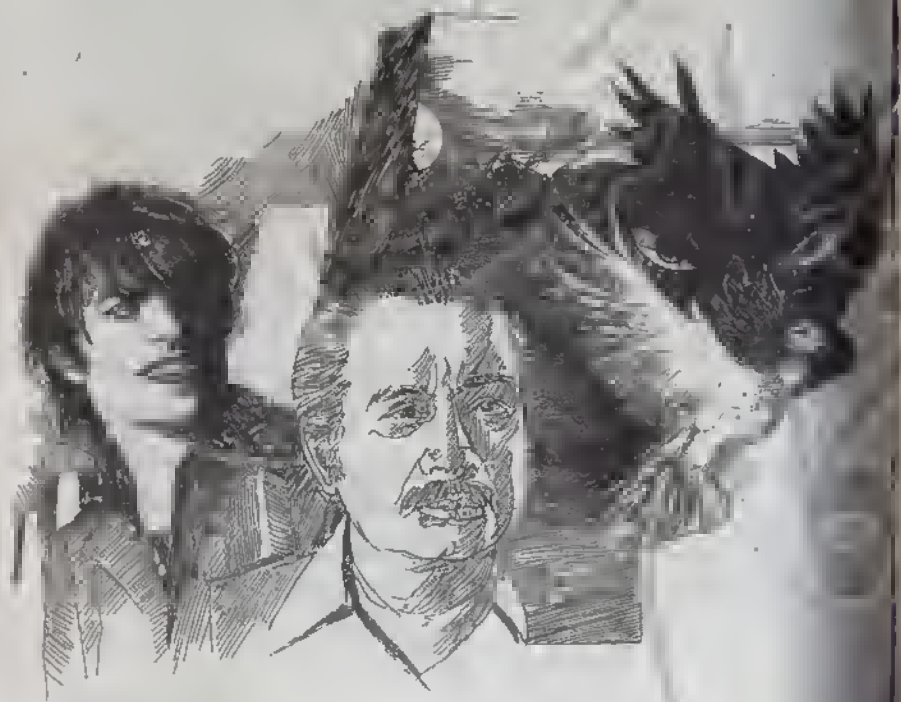

عالمِ ارواح اور حیات بعد الموت کا تصور نہایت حیران کن اور دلچسپ ہے۔ ہر فرد خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اُس کے متعلق مقدور بھر جاننا چاہتا ہے۔ کوئی گلاس الٹ کر روحوں کو بلاتا ہے تو کوئی منکوں پر اور کوئی الٹے سیدھے عمل پڑھ کے۔ بہرحال اسلام میں رُوح اور موت کے بعد زندگی کے واضح ثبوت موجود ہیں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا یا کیا ہوتا ہے اس بارے میں الہامی کلام یعنی قرآن مجید میں بہت کچھ بتایا گیا ہے اور ان باتوں پر یقینِ کامل ہمارا لازمی ایمانی جزو بھی ہے۔

مرنے والے کے لیے قرآنِ پاک پڑھنا' صدقہ خیرات دینا' اُس کی رُوح کو دوزخ کے ان عذابوں سے بچانا ہے جو اسے مختلف گناہوں کے بدلے میں ملیں گے لیکن جس نے پہلے ہی نیک عمل کو اپنا شعار بنا رکھا ہو اور اُس کے اعمال اور نماز' روزے کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت بخشا ہو تو سمجھیے' اُس کے لیے جنت ہی جنت ہے۔

نیک اعمال کی جزا کے ساتھ ساتھ گناہوں اور غلطیوں کا عذاب بھی لازمی ہے۔ کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان گناہوں کو توبہ استغفار پر بخش دیتا ہے جو بندے سے احکامِ الٰہی کے خلاف ہوئے ہوں۔ اگر بندے نے کسی بندے کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کا یہ گناہ اُس وقت تک نہیں بخشا جائے گا جب تک وہ شخص خود معاف نہ کرے۔

میں جو واقعہ بیان کرنے والا ہوں' اس واقعے کی تمہید اور بھی طولانی اور مفصل ہو سکتی ہے مگر قصہ مختصر کرنا زیادہ بہتر رہے گا۔ عرض یہ ہے کہ میں جنت اور دوزخ وغیرہ پر یقین رکھتا ہوں۔ مجھے بھی حیات بعد الموت کے متعلق جاننے کا بے حد شوق تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کبھی عملاً کوئی ایسا اتفاق یا واقعہ پیش آئے جس سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کر سکوں اور پھر میری یہ آرزو پوری ہو گئی۔

میں نماز کا پابند تھا۔ مذہب کا دل سے احترام کرتا تھا۔ رات کو جب میں کام وغیرہ سے فارغ ہو کر گھر جاتا تو میرا گزر اکثر ایک قبرستان سے ہوتا تھا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ قبرستان میں داخل ہوتے وقت قبروں پر سلامتی بھیجو اور فاتحہ ضرور پڑھو' خصوصاً مسلمانوں کی رُوحیں ہم سے ثواب کی منتظر رہتی ہیں اور کوئی یوں ہی چلا جائے تو وہ رنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ میں جب قبرستان سے گزرتا تو اچھی خاصی بلند آواز میں السلام علیکم یا اہل القبور! ضرور کہتا۔ کبھی کبھی میرا ایک دوست بھی میرے ہمراہ ہوتا۔ وہ بھی میری پیروی کرتا۔ برسوں تک میرا یہ معمول رہا۔

ایک شب میں اپنے دوست کے ساتھ قبرستان سے گزر رہا تھا تو میں نے حسبِ عادت السلام علیکم یا اہل القبور! کہا۔ اسی دن ہم نے مسجد میں مولانا صاحب سے سلام اور جوابِ سلام کی اہمیت پر تقریر بھی سنی تھی۔ میرے دل میں اس لمحے نہ جانے کیا شوخی سمائی کہ میں نے یوں ہی بلند آواز میں قبروں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"حضرات! سلام کا جواب واجب ہے۔ ہم آپ کے ورود ولت سے گزرتے ہیں تو سلام کرتے ہیں مگر کبھی حضور کو توفیق نہ ہوئی کہ جواب دے دیا کریں۔"

چونکہ میرا دوست کچھ ڈرپوک سا تھا لہٰذا میں نے اسے چھیڑنے کے لیے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات کی تھی۔

میری بات ختم ہوتے ہی "وعلیکم السلام!" کی آواز گونجی تو ہم لوگوں کے قدم گویا زمین میں دھنس گئے۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "کیا واقعی کسی نے ہمارے سلام کا جواب دیا یا میرا وہم ہے؟"

میرے دوست نے خوف زدہ لہجے میں تصدیق کی کہ اس نے بھی وعلیکم السلام کی آواز سنی تھی۔

میں خاصے مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ پہلے تو خیال آیا کہ شاید کوئی اور راہ گیر راستے سے گزر رہا ہوگا اور اس نے ڈرانے کے لیے یوں ہی وعلیکم السلام کہہ دیا ہو لیکن دفعتاً میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے سوچا کہ بھاگ چلو' آج کسی دوسری مخلوق سے آمنا سامنا ہے لیکن پھر خیال آیا کہ سلام کا جواب دینے والی کوئی بدروح نہیں ہو سکتی بلکہ پاک اور نیک رُوح ہے تبھی تو اس نے سلام کا جواب دیا ہے۔ بھلا بدروحوں کو سلام دعا سے کیا واسطہ؟

میرا دوست زیادہ دہشت زدہ تھا۔ وہ مجھے آگے بولنے سے منع کر رہا تھا مگر میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا لہٰذا پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

جواب آیا۔ "جسے آپ نے جواب نہ دینے کا طعنہ دیا ہے۔"

یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ تجسس بھی ہو رہا تھا اور ڈر بھی لگ رہا تھا۔ سوچا جو ہوگا سو دیکھا جائے گا لہٰذا ہمت پکڑی اور کہا۔ "لو بس خالی سلام..... اتنا نہ ہوا کہ اپنے ہاں دعوت پر بلا لیتے۔"

"ہوش میں رہو اور چلو یہاں سے۔" میرے دوست نے ڈانٹا۔ وہ مجھے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔

مجھے خود بھی معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا تو میں نے بھی آگے قدم بڑھا دیے۔ بہرحال میں بھی انسان تھا' تبھی پیچھے سے آواز آئی۔

"اب بھاگتے کہاں ہو' آئندہ شب جمعرات کو میزبانی قبول فرمایئے۔ ہم اسی مقام پر انتظار کریں گے۔"

اب تو حالت ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دل میں دہشت سی سما گئی۔ یا اللہ! کس بستی سے میری مڈبھیڑ ہو گئی ہے۔ خوامخواہ مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس نے ہمیں کہاں دعوت میں بلا لیا ہے؟ اب ہمارا کیا حشر ہوگا؟

گھر پہنچ کر دعائیں اور سورتیں پڑھ پڑھ کر وقت گزارا۔ دل سہما جا رہا تھا۔ جسم پر ایک عجیب سی کپکپی طاری تھی۔ اپنے دل کو حتی الامکان قوی بنانے کی کوشش کی لیکن بس کچھ نہ پوچھیے' ایسا خوف تھا کہ جس کی حد نہیں۔ خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ میں نے ایسا مذاق کیا ہی کیوں؟

جمعرات کی شام آئی تو اپنی حالت غیر تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔ توبہ کی کہ شاید آج زندگی کی آخری شب ہو۔ کئی مرتبہ سوچا کہ دعوت میں جانا ملتوی کر دوں مگر خیال آیا کہ کہیں یہ نیک روح خفا ہو گئی تو نہ جانے گھر والوں کو کیا مصیبت بھگتنا پڑ جائے' جانے کس بھیس میں کون ہے؟

اب قبرستان جائیں تو مصیبت نہ جائیں تو مصیبت۔ خیر' مستقل دعا پڑھ کر جب دل کچھ سنبھلا تو طے کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو' دعوت میں ضرور جانا ہے۔ جب شوخی کی ہے تو اسے نبھانا بھی چاہیے۔

گھر پر الوداعی نظر ڈالی اور دوست کو بہت اصرار کے بعد ساتھ لیا کہ دور کھڑے ہو کر میرا حال دیکھتا رہے۔

ہم دونوں کا ہی برا حال تھا۔ کانپتے' لرزتے قبرستان میں داخل ہوئے جہاں دعوت ٹھہری

تھی۔

رات کا سناٹا اور ہو کا عالم۔ پتا بھی کھڑکتا تو دل دہل جاتا۔ پتا پانی ہو رہا تھا۔ ساری دلیری ہوا ہو چکی تھی۔ رہ رہ کر ہول اٹھتا تھا کہ نہ جانے زندہ بچیں گے یا کل اسی مقام پر اپنی بھی قبر بن جائے گی۔ خیر، دوست سے گلے مل کر الوداع کہا اور اسے کچھ دور ٹھہرا کر اس مقام کی طرف بڑھ گیا جہاں دعوت دی گئی تھی۔

یکا یک مجھے ایسا لگا کہ کوئی غیر معمولی قوت میری رہنمائی کر رہی ہے کیونکہ میں نے اس خیال سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ میری نگاہ کسی پراسرار شے یا مخلوق پر نہ پڑ جائے۔

''تشریف لائیے۔'' کسی نے نرمی سے کہا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے لاتعداد سیڑھیاں اتری ہیں۔ اچانک مجھے بند آنکھوں سے روشنی کا احساس ہوا تو میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔

یہ ایک نہایت خوب صورت محل تھا جہاں بے شمار خدمت گار ہاتھ باندھے خاموش کھڑے تھے۔ مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک عجیب و دل فریب سماں تھا۔ ایسی آرائش و زیبائش تھی کہ میں حیرت سے بس دیکھے ہی جا رہا تھا پھر ایک خادمہ میرے قریب آئی اور اس نے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ مجھے ایک خوب صورت تخت تک پہنچایا جہاں ایک شخص گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔

یہی شخص میرا میزبان تھا۔ اس نے اپنے پاؤں کو ریشمی کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہر شے بے حد قیمتی، انتہائی نفیس اور دل فریب تھی۔ اس شخص کے آگے پیچھے کئی خدمت گار دست بستہ کھڑے تھے اور سامنے خوان پوش میں ہر قسم کے پھل سجے ہوئے تھے۔

میرے میزبان نے مجھے سلام کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

کچھ دیر بعد جب میرے اوسان مزید بحال ہوئے تو میں نے نظر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ اتنے میں میزبان نے اشارہ کیا تو کچھ خدمت گار خوان میں خوشبودار پھل، میوے اور مشروب سجائے حاضر ہوئے اور انہیں میرے آگے رکھ دیا۔ میرے میزبان نے بصد اصرار مجھ سے کھانے کو کہا اور اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں انگور کا دانہ ڈالا۔

اف! اس کا ذائقہ ایسا عمدہ تھا کہ کبھی میں نے نہیں چکھا تھا پھر مجھے مشروب پیش کیا گیا۔ میں نے پیالہ تھام کر ایک گھونٹ بھرا۔ ایسا خوش ذائقہ مشروب میں نے زندگی میں کبھی نہ پیا ہوگا۔ ایسا فرحت انگیز تھا کہ دم تحریر مجھے سوچ کر سرور آ جاتا ہے اور وہ پیالہ اتنا نازک اور خوش نما تھا کہ انسانی ہاتھ ایسی تخلیق سے قاصر ہیں۔

میرا میزبان میری حیرت پر مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی آسودگی اور اطمینان تھا۔ ایسا ملکوتی سکون تو میں نے دنیا کے بڑے بڑے دولت مندوں کے چہروں پر بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میرے میزبان کی خادمائیں بھی عجیب مخلوق دکھائی دیتی تھیں۔ ان کا حسن بھی لاثانی تھا۔ میں تو یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت زدہ ہی نہیں، دہشت زدہ بھی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے میزبان سے بہت کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیے تھیں لیکن میری زبان گنگ سی تھی۔ میں کچھ بھی تو نہ پوچھ سکا جس کا اب افسوس ہوتا ہے۔

اچانک یہ تمام خوب صورت سماں ہلکی ہلکی تاریکی میں ڈوب گیا اور میرا میزبان تخت پر یوں لوٹنے لگا جیسے شدید اذیت میں مبتلا ہو۔ وہ درد کی شدت سے بے قرار تھا اور اسی بے قراری میں اپنے

ہاتھ سے اپنا بدن نوچتا تھا۔ ہونٹ دانتوں سے کاٹتا تھا۔ چہرہ تکلیف سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

پھر اچانک سب کچھ روشن ہو گیا اور میرا میزبان پہلے کی طرح پرسکون ہو گیا۔ اب اس کے چہرے پر کسی اذیت کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ مجھے پہلے کی طرح کھانا پیش کرنے لگا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کئی مرتبہ اسی اذیت ناک مرحلے سے دوچار ہوا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ میری حیرت پر مسکرایا اور بولا۔

''حیران نہ ہو دوست! میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا لیکن پہلے تم میری مدد کا وعدہ کرو۔ مجھے یقین ہے تم ضرور میری مدد کرو گے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے مدد کرنے کا اقرار کر لیا لیکن میری آواز میں لرزش تھی۔

''گھبراؤ مت دوست!'' اس نے مجھے تسلی دی اور پھر اپنی داستان سنانے لگا۔

☆.....☆

''میں نے دنیا میں بڑی منظم زندگی بسر کی۔ نماز، روزے کی پابندی کرتا رہا۔ نیکی اور خدمت میرا شعار تھا پھر ایک دن اچانک میں دنیا سے انتقال کر گیا اور یہاں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ میرے دنیاوی دوست، احباب مجھ سے بچھڑ گئے۔

قبر میں میرا حساب کتاب ہوا۔ میرا نامۂ اعمال سیاہ نہ تھا۔ میرے گناہ بخش دیے گئے۔ میرے اعمال اللہ تعالیٰ کی راہ میں قابلِ قبول تھے۔ مجھے یہ ساری شان و شوکت اپنے نیک اعمال کے عوض عطا کی گئی ہے۔ میرے دوست! تم اس وقت جہاں ہو، وہ جنت کا ایک درجہ ہے۔''

میرے ذہن میں دوبارہ جھماکا سا ہوا۔ خیال آیا کہ میں زندہ ہی جنت میں کیسے جا پہنچا ہوں؟ شاید میں مر گیا ہوں، مگر نہیں، میں زندہ تھا۔ میرا میزبان دنیا والوں کی نظر میں مرا تھا اور اب حیاتِ بعد الموت گزار رہا تھا۔ وہ جنت میں تھا اور عیش کر رہا تھا اور میں بھی اس وقت جنت میں تھا۔ جنت تو اسلام میں ایک خوب صورت تصور بلکہ حقیقت ہے۔ (گناہوں سے بچو تو جنت تمہاری ہے۔)

وہ کہہ رہا تھا۔ ''اتنی نعمتیں مجھے میسر ہیں۔ مزے مزے کے کھانے کھاتا ہوں۔ حوریں میری خدمت پر مامور ہیں لیکن میں ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہوں کہ اس کا بیان بے حد مشکل ہے۔ یہ اذیت جو تم نے میرے اوپر گزرتے دیکھی تھی، میری ایک غفلت اور بے پروائی کا نتیجہ ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''ایک شخص سے لین دین میں کچھ رقم میرے ذمے رہ گئی تھی۔ میں آج کل، آج کل پر ٹالتا رہا اور اس قرض کو معمولی سمجھ کر لوٹا نہ سکا۔ یہاں تک کہ موت نے آ دبوچا اور ادھار باقی رہ گیا۔''

یہ بتا کر اس نے اپنے پاؤں کے اوپر سے کپڑا ہٹا کر دکھایا۔ اس کے انگوٹھے پر ایک زہریلا بچھو چمٹا ہوا تھا۔ وہ پھر بولنے لگا۔

''میں اس غریب آدمی کا مقروض ہوں اور یہ قرض بچھو کی شکل میں میرے پاؤں سے چمٹا ہوا ہے۔ جب دنیا میں میرے قرض کا تذکرہ ہوتا ہے تو بچھو اپنا ڈنک میرے انگوٹھے میں داخل کر دیتا ہے اور میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کسی طرح اس قرض کی ادائیگی ہو تو میں اس بچھو کے عذاب سے نجات پاؤں۔ اف! میں یہ بار لے کر کیوں قبر میں اتر گیا؟ کاش میں نے فوراً قرض ادا کر دیا ہوتا تو یہ عذاب میرے اوپر مسلط نہ ہوتا مگر کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی نیکی بھی بخشش کا سبب بن جاتی ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''میرے دوست! اس شب تم نے اہلِ قبور کو سلام کا جواب نہ دینے کا طعنہ دیا تو مجھے

خیال آیا کہ کیوں نا تمہارے ذریعے اس قرض کو ادا کروا کے اس عذاب سے نجات پالوں۔"

اس نے مجھے مطلوبہ رقم بتائی اور اس شخص کا پتا سمجھایا۔ وہ بالکل معمولی سی رقم تھی۔

میرا میزبان اپنی حالتِ زار پر آزردہ تھا۔ بولا۔ "دنیا سے اٹھ جانے کے بعد دنیا کے امور انجام دینا اپنے بس میں نہیں ہوتا مگر جب اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مہربان ہو اور وہ رحمت نازل کردے تو سب کچھ ممکن ہے۔ تبھی تو اس نے تمہیں میرے مقصد کا ذریعہ بنا کر بھیج دیا تاکہ میرا کام بھی ہوجائے اور تم اہلِ دنیا کو اس دردناک عذاب کے متعلق بتا سکو جو قرضہ ادا نہ کرنے کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ان لوگوں کے لیے باعثِ عبرت ہے جو لین دین میں ایمان کی پرواہ نہیں کرتے۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ کسی کو پل کی خبر نہیں کہ کب بلاوا آجائے لہٰذا اپنے اوپر کوئی بار نہ ڈالو۔"

میں نے اسے تسلی دی اور وعدہ کیا کہ یہاں سے جاتے ہی پہلا کام یہی کروں گا کہ اس ادھار کو لوٹا کر اسے عذاب سے نجات دلاؤں گا۔

☆.....☆

میں اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرا دنیاوی دوست میری راہ تک رہا تھا۔ مجھے زندہ سلامت پاکر خوشی سے لپٹ گیا اور حالات پوچھے۔ میں نے تفصیل بیان کی اور اسی وقت گھر جاکر مطلوبہ رقم کا بندوبست کیا۔

دن نکلا تو سواری کرائے پر لے کر اپنے جنتی میزبان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ مطلوبہ شخص کو تلاش کیا۔ اس سے معلومات کیں تو اس نے اقرار کیا کہ اس نے عرصہ ہوا کہ کسی کو ادھار دیا تھا۔ بہرحال میں نے رقم کی ادائیگی کی اور لوٹ آیا۔

میرا جنتی میزبان یقیناً اس عذاب سے نجات پا گیا ہوگا جو بچھو کی صورت میں اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے لپٹا ہوا تھا اور مختلف اوقات میں ڈنک مارتا جارہا تھا۔ یہ ڈنک اسے اس قرض کی یاد دلاتا تھا۔

موت کے بعد انسان کتنا بے بس ہوجاتا ہے، وہ عذاب سہتا ہے اور اپنے گناہوں پر پچھتاتا ہے۔ نادم ہوتا ہے مگر کفارہ ادا نہیں کرپاتا۔ انسان کتنا بے حس اور غافل ہے۔ اسے اپنے کیے کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ جانے کتنے گناہوں کا بوجھ لے کر اللہ تعالیٰ کے دربار میں پہنچ جاتا ہے۔

میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے جنت کا نظارہ کیا۔ آسمانی میوے چکھے، آسمانی مشروب پیا۔ یوں سمجھیے کہ میں زندہ ہی جنت کی سیر کر آیا۔ شاید اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے ذریعے اپنے نیک بندے کا کام انجام دلوانا تھا یا شاید اس واقعے کا مقصد یہ ہوگا کہ لوگوں کو احساس ہو قرض خواہ معمولی سا کیوں نہ ہو اور وقتِ مقررہ پر ادا نہ کرنا کس قدر دردناک عذاب کا باعث ہے۔

اس واقعے کو رقم کرنے کا مقصد یہ یقین دلانا نہیں ہے کہ میں زندہ ہی جنت میں گھوم کر آ گیا بلکہ یہ سمجھانا ہے کہ قرض سے حتی الامکان بچو۔ اس کا آخرت میں بڑا دردناک انجام ہوتا ہے اور ہر شخص کی نیکیوں کا پلڑا اتنا بھاری نہیں ہوتا کہ وہ بعد از مرگ دنیاوی امور سے کسی طرح عہدہ برا ہو سکے۔

میں اس واقعے کی سچائی کے بارے میں کوئی حلف نہیں اٹھاؤں گا بلکہ محض اتنا عرض کروں گا کہ جس کا جتنا ظرف ہوگا، وہ اتنا ہی اس کی گہرائی محسوس کرے گا۔

☆.....☆

وہ ایک سایہ

عصمت پروین عظیمی

سائے کے تعاقب میں جاؤ گے کہاں تک تم
دھوپ جب نہیں رہتی سایا بھی نہیں ہوتا

حیدرآباد سے تیسری ناقابلِ یقین کہانی

میرا نام عفت حمید ہے۔ میری رہائش کراچی میں ہے' تاہم میرا تعلق پنجاب کی ایک اچھی فیملی سے ہے لیکن اب سب فیملی کراچی میں رہتی ہے۔ میری شادی بہت کم عمر میں ہوگئی تھی۔ میرے شوہر کام کے سلسلے میں کراچی سے باہر جاتے رہتے تھے' کبھی سکھر تو کبھی حیدرآباد۔ ایک بار وہ مجھے بھی حیدرآباد لے گئے تھے' حیدرآباد میں میرے ساتھ کچھ ایسے واقعات ہوئے جن کی پرچھائیاں آج بھی میرے ذہن میں موجود ہیں۔

یہ تقریباً 30,35 سال پہلے کی بات ہے' میرے شوہر حمید فلموں کے بزنس سے متعلق تھے' اس سلسلے میں اکثر انہیں کہیں نہ کہیں جانا پڑتا تھا اور اُن کے اس مختصر سفر میں' میں بھی اُن کے ہمراہ کبھی سکھر اور کبھی حیدرآباد جایا کرتی تھی۔ یہ واقعہ حیدرآباد میں پیش آیا۔

میرے شوہر تاج محل سنیما میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ ان کا انمول پکچرز کے نام سے اپنا کاروبار تھا۔ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ شادی کے بعد کاروبار کی وجہ سے ہم حیدرآباد شفٹ ہوگئے تھے۔ نور محل سنیما کی چھت پر ایک ہال نما کمرہ تھا جو ہمیں رہنے کے لیے ملا تھا۔ میں پہلی بار اپنی فیملی سے دور گئی تھی اسی لیے اکیلے پن کی وجہ سے بہت ڈری ڈری سی رہتی تھی۔ مجھے اکثر کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس موقع پر میں اور بھی خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ میرے شوہر میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے کہ ڈرو مت' یہاں اچھی چیز کا سایہ یا گزر ہے لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا' میں اکثر دیکھتی تھی کہ وہاں سے کوئی گزرا ہے جیسے کوئی سایہ ہو۔ کچھ دن بعد ہم وہاں سے شفٹ ہوگئے اور راحت سنیما کے قریب ایک گھر کرائے پر لے لیا۔ سامنے والی گلی میں مکان مالک کی بیٹی میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ اُس کا نام شاہینہ تھا۔ اُس کی کچھ اور بھی دوست تھیں جو کہ اسکول کی ساتھی تھیں اور قریب ہی رہتی تھیں۔ سلمیٰ' فرزانہ' ثریا' یاسمین' شاہینہ اور میں' ہم سب خوب گپ شپ لگاتے تھے۔ میرے شوہر فلموں کے پاس لے آتے' ہم سب مل کر فلم دیکھتے چونکہ میرے شوہر کا فلم کا کاروبار تھا اس لیے اکثر جب کوئی نئی فلم آتی تو وہ بہت دیر سے آتے تھے۔ اُن دنوں نیو میجسٹک سنیما میں حمید کی لگائی ہوئی فلم چل رہی تھی' اسی مصروفیت کے باعث وہ دیر سے گھر آتے تھے۔ میں گھر کے کام نمٹا کر لیٹ جاتی تھی۔

ایک دن میں اپنا سب کام کر کے حسب معمول لیٹ گئی مگر نیند نہیں آرہی تھی لہٰذا کتاب پڑھنے لگی۔ یکایک مجھے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا۔ اسی وقت میں نے ایک لمبا سا سایہ دیکھا تھا اور میں بری طرح گھبرا گئی' میرا رواں رواں کانپنے لگا' خوف سے میری گگھی بندھ گئی' جیسے تیسے وہ رات گزری مگر اگلی رات صحن میں لیٹی تو لمبا سا سایہ دیکھا جیسے کوئی صحن میں چل رہا ہو پھر سامنے دیوار تھی' وہ سایہ دیوار پر لمبا ہوتا گیا۔ میں خوف سے کانپتی ہوئی برابر والے صحن کی طرف بھاگی جہاں شاہینہ اور اُس کی امی لیٹے تھے۔ میں شاہینہ سے لپٹ گئی۔ میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ وہ میرے خوف کا سبب پوچھتی رہی لیکن میرے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میرے شوہر جب واپس آئے تو وہ مجھے گھر لے کر آئے۔ شاہینہ اور ہمارے پورشن کے بیچ میں ایک دروازہ تھا۔ اب یوں ہونے لگا کہ اُس گھر میں اب مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ کچھ

عرصے بعد ہم کراچی واپس آگئے مگر یہاں آکر بھی اس سائے نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب میں تنہا ہوتی تو وہ مجھے واضح نظر آتا۔ سوتے میں یوں محسوس ہوتا' کوئی شئے میری گردن پر دباؤ ڈال رہی ہے' میری یہ کیفیت اکثر ہوتی تھی۔ میں اپنے شوہر سے اس حوالے سے ذکر کرتی تو وہ مجھ پر آیت الکرسی کا دم کر دیتے اور مجھے بھی کہتے کہ اللہ کا ذکر کیا کرو چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اب جب بھی کوئی ناوید شئے میرا گلا دبانے کی کوشش کرتی' میں وِرد شروع کر دیتی۔ میری زبان پر خود بہ خود قرآنی آیات' قل شریف' سورۃ یٰسین کا ورد جاری ہو جاتا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں گردن پر دباؤ ختم ہو جاتا۔ میرے خوف کا یہ عالم تھا کہ میں اکیلی باتھ روم تک نہیں جاتی تھی۔ سوتے میں بھی ڈرتی تھی۔ اس دوران میری گود بھی بھر گئی۔ اللہ نے بچے دیئے لیکن اس شئے نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میرے چار بچے سہیل' جاوید' شازیہ' فوزیہ' امی کے گھر گئے تھے۔ بعد میں ماشاء اللہ' چھ بچے اور ہوئے۔ اب میرے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں' سب کے سب خوبصورت اور خوب سیرت ہیں۔ اب میں ماڈل ٹاؤن میں رہتی ہوں اور سلسلۂ عظیمیہ میں شامل ہوگئی ہوں جس سے مجھے بہت فیض حاصل ہوا ہے۔ اپنے مرشد سے بیعت ہونے کے بعد اُن کے بتائے ہوئے مختلف وظائف پڑھے تو وہ کیفیت یا وہ پراسرار شئے آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتی گئی۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنے مہربان رب کا بے حد شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے اس ناوید مخلوق سے محفوظ رکھا۔

.....☆☆.....

دعا

(یوم آزادی کے حوالے سے)

آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ
اپنے وطن میں راج کریں صبح شام لوگ

گدڑی کہ جس نے پالا ہمیں لعل کی طرح
آکاش اس کے سر پہ رہے شال کی طرح
ماں کی طرح سے کرتے رہیں احترام لوگ
آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ

ہر شاخ گل کے ہاتھ پہ مہندی رچی رہے
دستِ خزاں سے دولت گلشن بچی رہے
اب کے چمن میں ایسا کریں انتظام لوگ
آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ

سورج سے جیسے چاند کو ملتی ہے چاندنی
دھرتی پہ جتنے پیار سے کھلتی ہے چاندنی
یوں بزم خاص میں بھی نظر آئیں عام لوگ
اپنے وطن میں راج کریں صبح و شام لوگ

آؤ دعا کو ہاتھ اٹھائیں تمام لوگ

(حمایت علی شاعر)

سفر کہانی

ڈگر جل پری کا

قمر علی عباسی

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

قمر علی عباسی کے قلم سے ڈنمارک کے سفر کا آنکھوں دیکھا حال

خورشید زیدی ہم سے مل کر خوش ہوئے۔ ایک مدت سے کوپن ہیگن میں رہتے ہیں۔ پی آئی اے میں تھے۔ ڈنمارک پوسٹنگ ہوئی تو یہیں کے ہو رہے۔ شادی پاکستان میں کی اور بچے یہاں پیدا کیے۔ میاں بیوی بچوں کی خوشیاں دیکھ رہے ہیں۔

خورشید زیدی کی بیگم آگئیں۔ بہت محبت سے ملیں۔ چائے کافی کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ ہم نے تکلف کیا۔ وہ پھر بھی لینے چلی گئیں۔ خورشید کوپن ہیگن کے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ ڈنمارک میں کسی سے اس حوالے سے رابطہ نہیں ہوا۔ امید ہے وہ بھی ان کے بارے میں اچھے خیالات رکھتے ہوں گے۔

ڈنمارک کے لوگ سادہ طبیعت ہیں۔ اس حد تک کہ عرصے سے بلکہ برس ہا برس سے کوئی قتل نہیں ہوا۔ کسی خاتون کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی۔ جب اس سرزمین پر پاکستانی آئے ڈینش خوش ہوئے انہیں سڑک پر پیدل چلتے دیکھتے تو گاڑی میں بٹھا کر منزل تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ افسوس ہم نے انہیں پہچانا نہیں اور وہ اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اس لیے اگر کوئی پاکستانی اپنی بیٹی یا بیٹے کی شادی کوپن ہیگن سے باہر کرنا چاہے تو اسے امیگریشن ویزا نہیں ملتا۔ پہچان کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ گاڑی آہستہ چلا رہے ہوں اور پاکستانی کو دیکھیں تو تیز کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال اور خورشید کی پرانی دوستی ہے۔ دونوں کی رہائش بھی نزدیک ہے۔

خورشید زیدی کہنے لگے۔

"آپ ہمارے گھر آ جائیں ہمیں مہمان نوازی کا موقع دیں۔"

ہم نے شکریہ ادا کیا۔ چند دن قیام ہے جہاں ہیں وہاں خوش ہیں۔ ہم بھی وہ بھی۔

ڈاکٹر اقبال اپنے تجربات سنانے لگے۔

چائے کا دور ختم ہوا۔ شام ڈھلنے لگی تو اجازت

ڈاکٹر اقبال کی گاڑی میں ٹاؤن ہال کی طرف چلے۔

ہم نے ایک بات دیکھی ڈاکٹر اقبال اپنی مصروفیات کے باوجود ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ ہمارے لیے جو تقریب ہوئی وہ موجود تھے۔

ایک شام ترغیب نے انہیں اپنا تازہ دیوان دیا۔ وہ جمعہ کی رات تھی پیر کی شام آئے تو شعروں پر بات کرنے لگے۔ یہ کہہ کر حیران کر دیا انہوں نے کہ دو دن میں دیوان پڑھ لیا۔ یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔

ناصر زیدی نے اپنا پہلا دیوان دیا تو اسے پڑھنے میں ہم نے اتنی دیر لگائی کہ اس کا دوسرا دیوان آ گیا۔ وہ برا مانا تو اسے سمجھایا۔

"شعر میں الفاظ خوبصورت گھروں کی طرح ہوتے ہیں ان میں بسیرا کر لیں۔ مصرعے دھانی دھند میں ڈوبی بستیاں ہوتی ہیں ذرا اسے محسوس کریں تب آگے بڑھیں۔"

ڈاکٹر اقبال کی بات کو ہم نے توجہ نہیں دی لیکن جب وہ اشعار سنا کر اور لفظوں کی بندش پر گفتگو اور غزلوں کی کیفیت بیان کرنے لگے تب یقین آیا۔ انہوں نے تمام دیوان توجہ سے پڑھا ہے۔ ایسے اچھے قاری کی تلاش ایک زمانے کو ہوتی ہے۔ ہم نے موقع غنیمت جان کر فوراً اپنا نیا سفرنامہ پیش کر دیا۔ دو دن بعد ہی اس پر تبصرہ سنا جو ہمیں پسند آیا۔ ڈاکٹر اقبال کا ادبی ذوق نہایت اچھا ہے۔ ان کے پاس بے شمار کتابیں ہیں۔ ہم سے کہا۔ "آپ کے تمام سفرنامے پاکستان سے منگوا رہا ہوں۔"

اس پر ہمارے پبلشر قیصر زیدی کو خوش ہونا چاہیے کہ ہم مارکیٹنگ بھی کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال ایک ہمدرد انسان ہیں حساس دل رکھتے ہیں ان کا منصوبہ ہے کہ پاکستان کے ادیب شاعروں فنکاروں کے لیے فنڈ قائم کیا جائے جس سے ان کا علاج اور دیکھ بھال ہو سکے جس کی ضرورت ہے۔ وہ عملی انسان ہیں۔ کسی دن یہ کام کر گزریں گے۔ ہم سے اس ادارے کا نام تجویز کرنے کے بارے میں کئی بار پوچھ چکے تھے۔ ایک نام ذہن میں آیا تھا۔ "محافظ۔" ویسے نام میں کیا رکھا ہے۔ کوپن ہیگن میں کسی پاکستانی کو چھینک آ جائے سر درد ہو ڈاکٹر اقبال کو یاد کیا جاتا ہے اور وہ بھی ہر لمحے علاج اور دوا کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اُن کی بیگم جرمنی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ملک ڈنمارک سے ملا ہوا ہے۔ ذرا موقع ملے یہ اپنی گاڑی میں اس طرف نکل جاتے ہیں۔ سیر و سیاحت کے شوقین ہیں۔ شاید ہی کوئی ہفتہ گزرتا ہو جب سویڈن لندن یا ناروے نہ جاتے ہوں۔ ناروے کے سفر کا ذکر سنانے لگے۔ شام کو جہاز اوسلو کے لیے روانہ ہوتا اور صبح پہنچتا ہے۔ جیسے جیسے سویرا ہونے لگتا ہے پرندے جہاز پر اڑنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے جو منظر کشی کی اس پر ہمیں ایک خطرے کا احساس ہوا۔ اگر یہ بھی سفرنامہ لکھنے لگے تو۔ ہم نے ان کے تکلم کا سلسلہ سیاست کی طرف موڑ دیا۔ اسی میدان میں وہ جو چاہیں کریں۔ کوئی اعتراض نہیں سفرنامے ہمارے پڑھیں۔ پاکستانیوں کا دکھ درد بانٹیں اور تقریبات میں شرکت کرتے رہیں۔ وہ کوپن ہیگن اور ہم نیویارک میں خوش رہیں
اور درویش کی صدا کیا ہے

کوپن ہیگن کے میلے

ڈنمارک میں سب سے بڑا شہر کوپن ہیگن ہے۔

کوپن ہیگن کا مطلب لین دین تجارت خرید و فروخت۔ یہ معاشی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ ہم تاجر نہیں زندگی بھر ادائیگی کرتے آئے ہیں کبھی

ٹیکس کے نام‘ کہیں فیس کی صورت‘ جرمانہ بھی دیا‘ قربانی تو اکثر دی۔ اس کے بدلے نہ ملا نہ تمنا کی۔ بزرگ کہا کرتے تھے‘ نیکی کر دریا میں ڈال۔ ہم نے اس پر عمل کیا۔ سوداگر نہیں بن سکے۔ اس کے باوجود کوپن ہیگن پہنچے۔ رقیب اس پر بھی افواہ اڑائیں گے۔ ہم اس شہر کے بام و در اور چشم و لب دیکھنے گئے تھے۔ یہ سراسر فائدے کا سودا ہے۔ اس پر ہم خاموش رہیں گے۔ انکار کرکے کافر کیوں بنیں؟

ڈنمارک میں 51 لاکھ افراد رہتے ہیں۔ زیادہ آبادی کوپن ہیگن کی ہے۔ یہ ملک زراعت کے خزانے سے مالامال ہے۔ مویشی پالے جاتے ہیں‘ اُن کا دودھ‘ پنیر‘ مکھن اور گوشت خود بھی کھاتے ہیں‘ دوسرے ملکوں کو بھی بھیجتے ہیں۔ سمندر سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ ماہی گیری اس ملک کا تاریخی پیشہ ہے۔ کھیتی باڑی کا رواج پرانا ہے۔ جنگل ہرے بھرے ہیں۔ اوک اور ٹیک کی لکڑی بہتات سے پیدا ہوتی ہے‘ جس کا فرنیچر یورپ کے ملکوں میں پسند کیا جاتا ہے۔

ڈنمارک میں جہاز سازی اور ماہی گیری کی صنعت ترقی یافتہ ہے۔ روزگار کا ذریعہ اور غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل کرنے کا راستہ ہے۔

اس ملک کے لوگ سادہ اور دھیمے لہجے میں معاملات طے کرنے والے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے‘ کوئی سنسر بورڈ نہیں۔ جی چاہے جو اور جیسی فلم بنالو‘ رسالے نکالو‘ اخبار چھاپو‘ ٹیلی ویژن کے بعض چینل بھی آزاد ہیں۔

برطانیہ کی طرح یہاں کے باشندے بادشاہت اور جمہوریت دونوں کے مزے لوٹتے ہیں۔ تخت پر ملکہ اور پارلیمنٹ میں وزیرِ اعظم بیٹھتے ہیں۔ 17 سیاسی جماعتیں ہیں۔ عوام ہر چار سال بعد 179 ممبران کو منتخب کرکے پارلیمنٹ بناتے ہیں۔ فوج ہے‘ سلامی دینے اور خاص خاص موقعوں پر وردی پہن کر پریڈ کرنے کے لیے۔ اس کے بعد اپنی بیرکوں میں چلے جاتے ہیں اس لیے ہر طرف سکھ چین‘ امن شانتی ہے۔ سیاح ہر موسم میں آتے ہیں۔ عمارتوں کو گھورتے‘ سڑکوں کو ناپتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈینش نے انہیں حیران کرنے‘ راحت اور لطف پہنچانے کے لیے خاطر خواہ انتظام کیے ہیں۔ ناچ گانا‘ کھانا‘ میوزیم‘ آرٹ گیلریاں‘ شراب شباب اور افغانی ترکی کباب‘ تھیٹر‘ سینما گھر‘ کلب‘ سیکڑوں ریسٹورنٹ۔ امریکا میں جس طرح کولمبس کا بڑا نام ہے‘ ڈنمارک میں وائی کنگ کا ذکر ہے۔ یہ لوگ ملاح تھے۔ سمندر میں سفر کرتے تھے۔ راہ میں جو آتا‘ لوٹ لیتے۔ زمین آجاتی تو اتر جاتے۔ لوٹ مچاتے۔ جی چاہا‘ کچھ عرصے رہ جاتے ورنہ جہازوں کا لنگر اٹھاتے‘ کسی اور سمت نکل لیتے۔ بعض قوموں نے سمندر میں منظم لوٹ مار کی پھر ملکوں کا رخ کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوٹ مار تاریخی پیشہ ہے۔ کوپن ہیگن میں وائی کنگ میوزیم ہے۔ ہم دیکھنے نہیں گئے کیونکہ یہ سب تو ہمارے ہاں بھی ہے‘ اصلی‘ زندہ چلتے‘ سانس لیتے‘ کام کرتے وائی کنگ ذرا سے فرق کے ساتھ پہلے یہ جہازوں میں سفر کرتے اور بستیوں میں آکر لوٹتے تھے۔ اب کرسی پر بیٹھ کر لوٹ مچاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں صاحبانِ اقتدار اور پہلی دنیا میں مدد اور جمہوریت قائم کرنے والے بڑے وائی کنگ ہوتے ہیں۔

کوپن ہیگن میں ایک میوزیم اوپن ایئر ہے۔ یہ لوہے کا زمانہ ہے‘ ایک دیہات بنا ہے۔ اُس زمانے کی اشیا‘ اوزار‘ گائے‘ بھینس چاہو تو اپنے ہاتھ سے دودھ نکال لو۔ سیاح یہ شوق پورا کرتے ہیں۔ دودھ دینے والی گائے بعض وقت لات بھی مارتی ہے اسی لیے ہم دور رہے۔ لوہے کے زمانے میں جو چاہے

رکھ دو۔ ہم نے کون سا دیکھنا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈنمارک اور ہندوستان کے گہرے مراسم تھے۔ 1620ء میں ڈنمارک کے تخت پر بادشاہ کرسچن چہارم بیٹھے تھے تو دوستی پکی تھی۔ ایک دوسرے کے ملک میں آمدورفت تھی۔ تامل زبان کی پہلی ڈکشنری بھی کوپن ہیگن میں شائع ہوئی۔ ایک کتاب میں سوال کیا گیا ہے۔

”دنیا میں جنتِ ارضی کون سی سرزمین ہے؟“

جواب میں بتایا گیا ہے۔ ”یہ ہندوستان ہے جہاں پوتر دریا گنگا بہتا ہے۔“

بھگوت گیتا کا ترجمہ ڈینش زبان میں ہوا ہے۔

ڈنمارک کا ہر شخص پڑھا لکھا ہے۔ تعلیم مفت‘ ساتھ میں وظیفہ‘ وہ بھی خاصا معقول۔ اب کون اسکول‘ کالج نہ جائے۔ کتابیں خریدنے کا شوق ہے۔ ہر گھر میں حسبِ توفیق کتابیں ہوتی ہیں۔ شہر میں بڑی لائبریریاں ہیں۔ بعض میں اُردو کی نادر کتابیں رکھی ہیں۔ فیض احمد فیض‘ اقبال‘ میر‘ مصحفی‘ غالب‘ امیر خسرو اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کا ڈینش میں ترجمہ ہوا ہے۔ وہ نایاب کتابیں نہ صرف الماری کی زینت بنی ہیں بلکہ لوگوں کے مطالعے میں بھی رہتی ہیں۔ اُردو کے شاعروں‘ ادیبوں کو اپنی کتابیں ڈینش میں ترجمہ کرانی چاہئیں تاکہ کوئی تو پڑھے اور سر دُھنے۔

کوپن ہیگن سے اخبارات نکلتے ہیں اور لوگ بڑی تعداد میں پڑھتے ہیں۔ انگریزی کا اخبار بھی مقبول ہے۔

شہر میں بس‘ ٹیکسی اور بجلی کی خودکار ٹرین چلتی ہے۔ ٹکٹ خریدیں اور سوار ہو جائیں۔ اس میں ڈرائیور نہیں ہوتا۔ خود چلتی اور رُکتی ہیں۔ ہم نے سواری نہیں کی۔ یہ بات نہیں کہ ان کے نظام پر اعتبار نہیں بلکہ اپنے دل پر بھروسا نہیں‘ کمزور اور ڈرپوک ہے‘ ویسے ہی پریوں اور جل پریوں سے سہما رہتا ہے۔ اس پر اور بوجھ کیوں ڈالیں؟ ایک بات کا افسوس ہوا‘ ملک میں کوئی فقیر نہیں اس لیے قیام کے دوران دُعاؤں سے محروم رہے۔

کوپن ہیگن میں کھانے‘ دیکھنے‘ سننے کے سیکڑوں راستے بہانے‘ قرینے لیکن......

؎ چاندی برسے چاند کی‘ سورج ہن برسائے

پیسے کا ایک ہاتھ ہے‘ کتنی لوٹ مچائے

بادل‘ پھول‘ ہوا

رات کسی پہر بارش گرنے لگی۔ آہستہ آہستہ دبے قدموں‘ کہیں ہمارا خواب ادھورا نہ رہ جائے۔

قتیل شفائی نے کہا تھا۔

؎ تو لاکھ چلے رے گوری‘ تھم تھم کے

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

بارش کی سرگوشی سے آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے دیکھا‘ اندھیرا بارش کی لکیروں کو چھپا رہا تھا۔ گھاس پر ہلکی سی آواز تھی۔ ہم دیر تک دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مشرق سے اُجالا پھیلنے لگا۔ ایک نیا دن نکلنے والا ہے۔ ہم دروازہ کھول کر سفید فرش پر رکھی دودھیا کرسی پر آبیٹھے۔ اوپر شیشے کی چھت پر بارش زور زور سے گرنے لگی۔ پتے تالیاں بجانے لگے۔ سیب کی شاخیں جھومنے لگیں۔ آلوچے اپنا چہرہ دھونے لگے۔ پھول ہونٹ کھولے بارش کے قطروں کو موتی سمجھ کر اپنے دامن میں بھرنے لگے۔

احساس ہوا‘ بارش باتیں کرتی‘ ساز بجاتی‘ گاتی ہے۔

نیا دن نکھر آیا۔ اس کے پاؤں دھیمے ہو گئے۔ سنہری دھوپ دیوار پر آبیٹھی۔ ایک طرف پھوار‘ دوسری سمت بادلوں سے چھن کر دھوپ آگئی۔ یوں محسوس ہوا‘ رات کے پہر کسی ایسی جگہ آگئے ہیں

جہاں پھول' بارش اور دھوپ کا بکھرا سونا ہے۔
یہ وہ دنیا نہیں ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔
پلکوں کے نیچے خواب کی بستی ہے۔
انجانی خوشی' اَن دیکھے منظر' ایک سکون
راحت..... آرام۔
اچانک ایک تیز خوشبو آئی۔
بٹ سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے لیے کافی لائے تھے۔
اس کی مہک نے خواب کے رنگ اپنی خوشبو میں سمو لیے۔
ہم جزائر ہوائی پہنچ گئے۔ ماریشس جا اترے۔
برازیل کے ساحلوں کی سفید ریت قدموں تلے آ گئی۔ پھول' بارش' دھوپ اور کافی کی خوشبو نے ہمیں بادلوں میں اڑانا شروع کر دیا۔
ہوا' بارش' دھوپ اور خوشبو کی دنیا پھیلی ہوئی تو بٹ بولے۔ ''اس موسم میں بارش بہت ہوتی ہے۔''
ہم چپ رہے۔
پھر پوچھا۔ ''ناشتا اندر کریں گے یا اسی جگہ؟''
سیاہ بادل آیا اور روشنی کو نگلنے لگا۔ ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔ ناشتے کے بعد بٹ نے کہا۔
''آپ کو بارش سے دھلا کوپن ہیگن دکھاتے ہیں۔''
بٹ کی گاڑی میں بیٹھ کر نکلے تو کوپن ہیگن کے در و دیوار بارش سے دھل چکے تھے۔ درخت زیادہ سبز' گھاس ہری اور پھول تازہ ہو گئے تھے۔
زندگی رَواں دَواں تھی۔
بازار کی طرف چل دیے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ کاروبارِ حیات جاری تھا۔ ایک دکان پر بورڈ لگا تھا۔
''بالوں کی کٹنگ 99 کراون۔'' اس کے نیچے اُردو میں تحریر تھا۔ ''پاکستانی بھائیوں کے لیے خصوصی رعایت۔''
''یہ اُردو میں کیوں لکھا ہے؟''
''تاکہ مقامی حضرات نہ سمجھ سکیں نہ رعایت مانگیں۔'' وہ بولے۔
ایک اور دکان پر نظر گئی۔ اُردو کا بورڈ لگا تھا۔
''عامر فیشن ہاؤس۔''
''ٹیلر کی دکان ہے۔'' بٹ بتانے لگے۔
اُردو کو دکانوں کے بورڈ پر دیکھ کر اچھا لگا۔
کوپن ہیگن کی سڑکوں' چوراہوں' مجسموں اور گھاس کے میدانوں میں گرتی بارش دیکھتے رہے۔
ایک جگہ بٹ نے گاڑی روکی۔
''آپ بھاگ کر سامنے ریسٹورنٹ میں چلے جائیے۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔'' ''کونیا کباب ریسٹورنٹ۔'' ہم نے ترکی کا سفر کیا ہے۔ کونیا بھی گئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں مولانا رومؒ سوتے ہیں۔
ہم ایک ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔
بٹ آئے تو پوچھنے لگے۔ ''کیا کھائیں گے؟''
''جو مل جائے۔''
بٹ اٹھ کر گئے۔ کاؤنٹر کے پاس ایک لمبی سی انگیٹھی پر گوشت سینکا جا رہا تھا۔ بٹ نے وہاں کھڑے آدمی سے ڈینش میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا۔ کھانا دینے پر تیار تھا۔
بٹ کولڈ ڈرنک اور لسی کے ڈبے فریزر سے نکال لائے۔ ایک خاتون دو لمبے نان لا کر رکھ گئیں۔ ان کی خوشبو بھوک چمکانے لگی۔
پھر ایک ڈش میں کباب تکے اور بوٹیاں لے آئیں' ساتھ چٹنی چکھ کر دیکھا' ذائقہ اچھا تھا۔
کوپن ہیگن میں افغانی' ترکی' پاکستانی کباب شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دکانیں جگہ جگہ ہیں یا لوگوں کی پسند کی وجہ سے لگی ہیں۔

یا انتظام ہے۔
ہم نے افغانی کباب کابل میں نہیں' نیویارک میں کھائے تھے۔ ان کی لذت اچھی تھی' اتنی کہ ہزاروں امریکی افغانی کباب کھانے کابل قندھار پہنچ گئے اور کھانے میں ایسے مصروف ہوئے کہ اب تک لوٹ کر نہیں آئے۔
افغانی اور ترکی کباب میں زیادہ فرق نہیں۔ کونیا کے نام سے کھالو یا کابلی کہہ لو' بات ایک ہی ہے۔
اُس دن برستی بارش میں کونیا کباب' گرم نان اور کولڈ ڈرنک نے لطف دیا اور فیصلہ کیا' آیندہ بھی آئیں گے۔ اس کا موقع دوبارہ نہیں آیا۔ اگر کوپن ہیگن والوں کو ذرا بھی خیال ہو تو ہمارے علاقے میں ''کونیا کباب'' ریسٹورنٹ قائم کر دیں۔ دُعا دیں گے
گل حسن بھی گیا
ہم کوپن ہیگن میں تھے۔
اس شہر میں چند دنوں کے لیے آئے تھے۔
امریکا والوں نے ہمارے حصے کا بہت سا دانہ پانی یہاں بھیج دیا تھا۔ جب تک وہ کھا پی نہ لیں' واپسی ممکن نہ تھی۔
ڈنمارک میں ہر طرف سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اپنوں کی خبر اور رقیبوں کی اطلاع نہیں پہنچتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا' ساحلِ سمندر کے کنارے سورج کی نوں تلے چھٹیاں گزار رہے ہیں۔ زادی چین لکھتا تھا۔ کبھی کبھی نصر ملک آزردہ کرنے وال خبر سنا دیتے۔
آسمان رات سے برس رہا تھا۔ صبح بجھی بجھی تھی۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشے پر یوں بہہ رہے تھے جیسے آنسو ہوں۔ کوپن ہیگن میں بادلوں کو پہلی بار روتے دیکھا۔ ٹیلی فون کا انتظار تھا۔ نصر ملک دکھن سی بری خبر سے مطلع کرتے ہیں۔ گھنٹی بجی' دھڑکتے دل سے ریسیور اٹھایا۔ نیویارک سے خبر تھی' دل کی دھڑکن رک سی گئی۔ یقین نہیں آیا' گھبرا کر پاکستان فون ملایا۔ اطلاع درست تھی۔ ہمارا یار عزیز گل حسن بے وفا نکلا۔ چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک لمبے سفر پر۔ وہ ایسا نہ تھا' سفر سے گھبراتا تھا۔ ایک بار ملک سے گیا تو ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔
کون جائے داغِ یہ دلی کی گلیاں چھوڑ کر
ہم سفر پر جاتے' وہ حیران ہوتا۔
''تم اتنی دور چلے جاتے ہو؟''
ہم سمجھاتے۔ ''سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔''
اسے ظفر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے میں آنا کانی کرتا۔
ہم کہتے۔
''تم وہ سندھی ہو جو دریائے سندھ کے دوسرے کنارے کو پردیس سمجھتے ہیں۔''
وہ ہنستا رہا۔
پھر کیا ہوا' وہ سفر پر کیسے روانہ ہوا؟
اس پر جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا نہ اس کا سفر نامہ لکھا جاتا ہے۔
شاید وہ کہنا چاہتا ہو۔
''تم سفر کے لیے کہتے تھے تو ہم روانہ ہوتے ہیں۔''
گل حسن سے ہمارا 48 سال کا ساتھ تھا۔ وہ گیا تو ہماری زندگی کے ہنستے مسکراتے صحت مند شب و روز' لڑکپن' نوجوانی کے موسم سمیٹ کر ساتھ لے گیا۔
ہم ریڈیو پاکستان' لاہور میں ایک تھے۔ ایک گھر میں رہتے' کھاتے پیتے' ہنستے' شرارتیں کرتے' ہر دن بھرپور گزارتے۔ حسین ناز و انداز دکھانے والی پری چہرہ لڑکیوں سے بات کرنے کی شرطیں لگاتے' کیسی کیسی اداکاری کرتے' مکالمے بولتے۔ اکیلے

میں اُن باتوں کو دہرا کر قہقہے لگاتے۔

''اگر کسی دن واقعی محبت ہوگئی.....'' وہ خطرے کا اظہار کرتا۔

''تو دیوداس بن جائیں گے۔'' ہم جواب دیتے۔

لاہور کی سرد راتوں میں لحاف اوڑھ کر تاش کھیلتے' کاجو نمک لگے پستے اور بھنے ہوئے بادام سے شرط لگاتے۔ ایک دوسرے کی آنکھ بچا کر کھاتے جاتے' یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتے۔ ہم اس پر اور وہ ہم پر بے ایمانی کا الزام لگاتا۔

اُن دنوں ریڈ بلڈ مالٹے 5 روپے کے 100 ملتے تھے۔ چپراسی بوری بھر کر لاتا۔ ہم شرط لگاتے' سب سے زیادہ کون کھائے گا؟ ہمارا خیال تھا' اس سے سرخ رنگ کا خون بنتا ہے۔ اس موسم میں ہمیشہ دونوں باتھیں مالٹوں سے ہلکے ہلکے چلتی رہتیں۔

سردیوں میں رمضان آ گئے۔ ہم گڑھی شاہو میں رہتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کے مکان کے پیچھے رات کو کمبل اوڑھ کر سحری کرنے نکلے تو کتے پیچھے لگ گئے۔ وہ سمجھے' ہم چور ہیں۔ بعض تو کمبل گھسیٹنے لگے۔

''سنا ہے' کتے لوگوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں؟'' ہم نے کہا۔ ''سچ ہے' تمہاری ٹانگ کی طرف دوبڑھ رہے ہیں' میری طرف صرف ایک ہے.....''

ہم لوگوں نے فیصلہ کیا' رات کو دیر سے کھانا کھائیں گے اور سو جائیں گے۔

رات گیارہ بجے لاہور کے بیڈن روڈ گئے۔ امرتسر لنچ ہومز سے ڈٹ کر کھایا۔ رکشے میں بیٹھے۔ ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ کھانا ہضم نہ ہو جائے لیکن صبح آنکھ کھلی تو بھوک لگی تھی پھر کھانا گھر لا کر رکھا۔ سحری کے وقت دیکھا تو سب کچھ جم گیا تھا۔ گھر میں چولہا نہیں تھا اس لیے باقی رمضان بغیر سحری کے روزہ رکھا۔ اس سال رمضان گزرنے میں ہی نہیں آتا تھا حالانکہ چاند ۲۹ کو طلوع ہو گیا تھا۔ کئی دن تک سحری کو اٹھتے اور یہ سوچ کر رمضان گئے' خوش ہوتے۔

بسنت کا مہینہ آیا۔ ریڈیو پاکستان' لاہور کی چھت پر سب سے زیادہ پتنگیں ہم نے لوٹیں' اڑائیں اور نعرے لگائے۔ دوسرے دن اسٹیشن ڈائریکٹر نے بلا کر سمجھایا۔

''آپ افسر ہیں' کیا یہ زیب دیتا ہے کہ مراثیوں کے ساتھ پتنگیں اڑائیں؟ خواتین سے پیچ لڑوائیں؟''

ہم کیا جواب دیتے' سر جھکائے دھانی رنگوں کا تصور کرتے رہے۔

لاہور میں مہاوٹوں کی بارشیں ہوتیں تو ہم اُن میں بھیگنے نکلتے' نہ جانے گل حسن سے کس نے کہا تھا' اس بارش کا ہر قطرہ آبِ حیات ہے۔ سیپ کے منہ میں جائے تو موتی بن جاتا ہے۔ انسان کے جسم پر گرے تو صحت مند اور لمبی زندگی پاتا ہے۔ اُن دنوں زندگی اور صحت کی قدر نہ تھی۔ بارش سر پر' کاندھوں پر اور آنکھوں پر گرتی اچھی لگتی۔ لارنس گارڈن میں صرف دو دیوانے تھے جو بارش میں بھیگتے رہتے۔ ایک خاتون نے دیکھا تو ڈرایا۔

''بارش میں بھیگنے سے نمونیہ ہو جاتا ہے۔''

وہ زمانہ تھا جب نمونہ سمجھ میں آتا تھا' نمونیہ نہیں' بس اُن کو دیکھا کیے۔ وہ دیوانہ سمجھیں ہوں گی۔

لاہور میں موسمِ بہار ہر طرف نظر آتا ہے۔ اُن دنوں ہمارے کمرے میں ہر روز گلاب کے تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھا جاتا۔ ریڈیو اسٹیشن کے احاطے میں رنگ برنگے پھول کھلتے۔ کوئی ہمیں خوش کرنا چاہے تو گلاب کے پھول لاتا۔ ہم کسی کو پسند کرتے' گلاب دیتے' سانسوں میں اس کی مہک بسی رہتی۔

لاہور کھانوں کا گڑھ ہے۔ ہم نے اُن سے لطف لیا۔ چونا منڈی کے بکری کے پائے' لاہوری کی

نہاری' لکشمی چوک کے مرغ چھولے' صفوں والے چوک کی چکن کڑاہی' بیڈن روڈ کی مچھلی' بانو بازار کی چاٹ' انارکلی کے نکڑ پر مکئے والی قلفی' لکشمی چوک کے بٹ کی دکان کے رس گلے ساری عمر ساتھ رہے۔

وہ بہار کے دن تھے۔ کھلکھلاتے پھول' برستی بارشیں' درختوں سے گرتے زرد پتے' پالے سے بھری جمسیں' مرجھائی دوپہر اور ٹھنڈی شامیں اچھی لگتی تھیں۔ سارے چہرے پسند تھے۔ زندگی شاخوں میں سرخ چونچ اور نیل کنٹھ رنگ والی چڑیا کی طرح چہچہا رہی تھی۔

ہم کراچی آ گئے۔ گل حسن بھی چلا آیا۔ اس نے سول سروسز کا امتحان پاس کیا۔ ایکسائز ڈپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر ہو گیا۔ اس نے بڑے کارنامے کیے۔ لاکھوں ٹن منشیات پکڑی۔ ایمان داری' محنت اور فرض نبھانے کے میڈل حاصل کیے۔

جب ملازمت کے دن پورے ہوئے' چیف منسٹر نے توسیع کر دی۔

ہم ریڈیو پاکستان میں مستقل مزاجی سے کام کرتے رہے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پرانی باتیں دہراتے تو دن گزر جاتا۔ وہ ہمیں سمجھتا تھا' ہم اسے جانتے تھے۔

سندھ کے چیف منسٹر نے گل حسن کی ملازمت میں توسیع کر دی لیکن اسے یہ اختیار نہیں تھا کہ ایک سانس کی توسیع کر سکے۔ یہ تو میرے رب نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

پچھلے سال اگست میں ہمارا پیارا' عمر بھر کا ساتھی رشید عمر تھا' وہ سفر پر روانہ ہوا۔ ہم ماریشس میں تھے۔ وہ انتظار نہ کر سکا۔ کراچی پہنچے تو نہیں تھا۔ ہمارا وفادار' جاں نثار دوست اسلم بلوچ کو ریڈیو پاکستان کے لیے کوریج پر باہر جانے کا شوق تھا۔ ایک بار کرکٹ میچ کے لیے شارجہ گیا پھر ہندوستان۔ اس بار گیا تو لوٹا نہیں۔ ریڈیو میں غیر حاضری لگ رہی ہے۔

مجیب عالم ہمارے بہت نزدیک تھا۔ اُس نے ایک نغمہ گایا تھا۔

کل کسی وقت شام سے پہلے
میں ترا شہر چھوڑ جاؤں گا

عجیب آدمی ہے' شام ڈھل گئی' رات آئی تو چلا گیا اور اب گل حسن بھی گیا۔

اُس کے دکھ' درد' صدمے نے ایک ایسے موسم میں لا کھڑا کیا ہے جو کبھی سوچا نہ تھا۔ یہ صرف ہم محسوس کر سکتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے۔

اُس دن عید جس دن ملاں گے
ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے تھے۔

ترغیب' اُن کی بیگم تسنیم' بیٹا اسد' پیاری بیٹی تعریف۔

محمد آصف رضا آ گئے۔ وہ کئی دن سے چلنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ آج آئے' اپنے ساتھ ''ساحل'' کا نیا شمارہ اور ''ساحل نیوز'' لائے۔ گھنٹی بجی' برکت میاں تھے۔ ہماری پسند کی مٹھائی لائے تھے۔ ہم نے تکلفاً ایک بار کہہ دیا تھا۔ وہ لے آئے۔ اچھا کیا' ڈنمارک کا ذائقہ نیویارک میں کئی دن رہے گا۔

اسلم مہر پہنچ گئے۔

''یوں محسوس ہوتا ہے جو موسم اپنے ساتھ لائے تھے' وہ واپس لے جا رہے ہیں۔''

ترغیب نے کہا۔

''اپنے لیے لائے تھے۔ اب لے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔'' آج دوپہر سے موسم نے رخ بدل لیا تھا۔ ہوا میں خنکی تیرنے لگی تھی۔ اُس وقت نصر ملک پھولوں کا گلدستہ لے کر آ گئے۔

یہ لوگ الوداعی ملاقات کرنے آئے تھے۔ کوپن ہیگن میں ہماری آخری شام تھی۔ کل دن طلوع ہوگا۔ ہم سمندروں پر سفر کر رہے ہوں گے۔ کوپن ہیگن والوں کی محبتوں کے لمحوں کے ساتھ۔ ہم بھی اداس تھے۔ زندگی سفر کا نام ہے' آگے بڑھنے' بدلنے

کا۔ اللہ نے اپنی زمین' آسمان' سمندر' ریگستان اور پہاڑ دکھائے ہیں۔

احباب آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ ہم کیوں اداس ہیں؟ سیاح ہیں' بہتا پانی اور ہوا کے دوش پر بادل ہیں۔ لمحے بھر کو کہیں ٹھہرے تو برس پڑے...... نئی زمین' نئی دنیا پکارتی ہے۔ سفر شروع ہوتا ہے۔

نصر ملک تنقید کی نئی کتاب کا ذکر کرنے لگے۔ اسلم مہر اخبار کی بات کر رہے تھے۔ محمد آصف رضا ''ساحل'' کے نئے شمارے کے لیے مضمون کی فرمائش کرنے لگے۔

ترغیب گم صم تھے۔ اب جانے کب ملاقات ہو؟ تسنیم بھابھی کا تقاضہ تھا۔ ''بھائی' پھر آئیں' اوسلو اور اسٹاک ہوم بھی چلیں گے۔''

تعریف ہمارے لیے خوبصورت تحفہ لائی تھی۔

اسد اقبال خاموش تھا۔ ظہور احمد نیویارک آنے کا وعدہ کر رہا تھا۔

وقت دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی دیوار پر لگے کلاک میں گزر رہا تھا لیکن اس کا کسی کو احساس نہیں تھا۔

ترغیب پاکستان میں ہونے والے تازہ واقعہ پر افسوس کر رہے تھے۔ اسلم مہر اسے بیرونی ہاتھ سمجھ رہے تھے۔

بٹ کولڈ ڈرنک' چائے' کافی لائے۔

محمد آصف کا اصرار تھا' آپ جب بھی سفر پر نکلیں' راستہ لیں جس میں کوپن ہیگن آتا ہو پھر یہاں رک جائیں۔''

برکت پیا کی باتیں ادھوری تھیں' وہ منصوبے بنا رہے تھے۔ لاہور اور کوپن ہیگن کو کسی طرح جڑواں شہر بنوا دیں۔ ایک گلی کا نام بھائی رکھیں۔ اس پر بات ہوئی تھی۔ وہ رہ گئی۔ برکت پیا سمجھدار انسان ہیں' جانتے تھے جو تیر' کمان سے نکل گیا پھر لوٹ کر نہیں آتا۔

روانگی کا وقت ہو گیا۔

ہم کھڑے ہو گئے۔ ظہور نے بریف کیس اٹھایا۔ اسد اقبال نے بیگ لیا۔ سب نے الوداع کہا۔

''سفر خیریت سے گزرے۔''

''صحت مند' تندرست رہیں۔''

''یوں ہی سفر کرتے رہیں' لکھتے رہیں۔''

ہم منہ پھیر کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ایک ایک کر کے سب اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہونے لگے۔

بٹ نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

اسد اقبال نے اپنی گاڑی لی۔ ظہور احمد ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ واپسی میں ہوائی اڈے سے اسد اقبال اسے گھر لے جائیں گے۔ سڑک آ گئی۔ سبز پتوں سے بھرے درخت' خوبصورت مکان دونوں طرف سے گزرنے لگے۔ اپنی صحت مند زندگی کے کتنے دن یہاں گزار کر جا رہے تھے۔ یاد ساتھ آنے لگیں۔ ہم چپ تھے۔ ظہور جب اپنی گاڑی میں ہوتے' ہم فرمائش کرتے۔ ''سیف الملوک سناؤ۔''

ظہور کی آواز گونجتی تو ہم سرسوں کے کھیتوں میں جا اترتے' ساون کی بارشوں میں بھیگنے لگتے' کچی مٹی کی مہک سے گھر جاتے۔ ظہور خاموش' بٹ گم صم اور ہم چپ تھے۔

اچانک ظہور کی آواز ابھری۔

''اچھا یار' حوالے رب دے
میلے چار دناں دے
اُس دن عید مبارے ہووے
جس دن فیر ملاں گے''

نہ جانے کہاں سے بادل آئے اور دل کے آنگن میں چھاجوں مینہ برسنے لگا۔

<...... ختم شد ......>

اعترافات

اندھیری راہوں پر

نفیسہ فضل

موت دشوار ہو گئی شاید
زیست پر اختیار سا کیوں ہے

کراچی سے پہلی اعترافی کہانی

نام تو میرا زرینہ ہے مگر میں اپنے آپ کو زریں کہلانا پسند کرتی تھی۔ لڑکپن سے ہی دل پھینک اور رنگین مزاج قسم کی لڑکی تھی' جس لڑکے کو بھی دیکھتی' وہی اچھا لگنے لگتا۔ ابھی آٹھویں جماعت میں ہی تھی کہ اپنے تایازاد سے محبت ہوگئی۔ ان دنوں والد صاحب کافی عرصے سے بیمار تھے' دراصل وہ ٹی بی کے پرانے مریض تھے اور بستر سے لگ گئے تھے اور میرے تایازاد جاوید ان کی خبر گیری کے لیے ہر روز آتے تھے۔ انہیں میں جاوید بھائی کہتی تھی۔ جاوید بھائی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ میں جب چائے بنا کر انہیں دیتی تو وہ بہت خوش ہوتے۔ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے انہیں پسند آتی تھی۔

ایک دن جب میں نے انہیں چائے بنا کر دی تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا' بس وہ ہی لمحہ تھا جب وہ یکا یک ہی مجھے اچھے لگنے لگے تھے۔ میرا دل اُن کے پاس سے اٹھنے کو نہیں کر رہا تھا حالانکہ ایک ماہ بعد اُن کی شادی ہونے والی تھی۔

جب ابا نے مجھے آواز دی تو میں اُن کے پاس سے اٹھ کر گئی۔

جاوید بھائی اکثر گھر آتے تو ابا کے لیے پھل فروٹ وغیرہ لاتے تھے۔ کبھی اماں کی ہتھیلی پر کچھ رقم بھی دھر جاتے۔ دراصل میرے بھائی ابھی پڑھ رہے تھے' کوئی جاب تو تھی نہیں۔ ابا واپڈا سے ریٹائرڈ تھے' سو کچھ پنشن مل جاتی تھی پھر میں نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی مگر اُس زمانہ میں ٹیوشن فیس ہی کیا تھی' اُس وقت ٹیلی وژن تو تھا نہیں۔ ریڈیو بھی کم گھرانوں میں ہی تھا۔ میں ریڈیو پر اکثر گانے سنتی تھی اور ڈرامے بھی نشر ہوتے تھے۔

اُن ہی دنوں ایک پنجابی فلم کا بہت چرچا ہوا' فلم تھی 'تیس مار خان' اس کا گانا ''لیموں واجوڑا اساں باگ وچ توڑیا'' (لیموں کا جوڑا میں نے باغ سے توڑا) بے حد مقبول تھا۔ میں نے اماں سے ضد کی' مجھے 'تیس مار خان' فلم دیکھنی ہے۔ اماں نے کہا۔ ''میں تو تیرے ساتھ نہ جاسکوں گی' تیرے ابا کو بخار ہے' ہاں تو جاوید کے ساتھ چلی جا۔ اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں کے مصداق' میری تو دلی مراد بر آئی۔

شام کو جاوید بھائی آئے تو اماں نے کہا۔ ''ارے بیٹا جاوید' یہ زرینہ کتنے دن سے فلم دیکھنے کی ضد کر رہی ہے۔ یہ ارشد تو ساتھ نہیں جاتا' تم ہی لے جاؤ۔''

جاوید بھائی بولے۔ ''آج تو نہیں' ویک اینڈ پر لے جاؤں گا تاکہ صبح آرام سے سو کر اٹھوں۔'' میں نے یہ سنا تو میں خوشی سے جھوم اٹھی۔ تین دن بعد ہفتہ تھا۔ یہ دن گزارنے میرے لیے مشکل ہوگئے۔ صبح اسکول جاتے ہوئے جاوید بھائی سے ملاقات ہوئی' وہ آفس جا رہے تھے۔ ہمارے گھر ایک ہی محلے میں تھے۔

جاوید بھائی بولے۔ ''میں نے آخری شو کی بکنگ کرالی ہے۔ سات بجے تک تیار رہنا' پہلے مال سے تمہیں آئس کریم کھلاؤں گا۔''

''اوہو! آپ کتنے اچھے ہیں۔'' میں نے بے ساختہ کہہ کر ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ میری اس حرکت پر وہ ہنس پڑے پھر میں اسکول اور وہ آفس چلے گئے۔ پتا ہی نہ چلا' کب وقت گزرا۔ دوپہر سے شام کا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ چھ بجے سے ہی میں تیار ہونا شروع ہوگئی۔

اماں نے دیکھا تو بولیں۔ ''تو خوشی میں باؤلی

ہوگئی ہے' ابھی سے تیار ہو رہی ہے۔''

میں واقعی خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ ایک تو فلم دیکھنے کا شوق' اس پر اتنے ہینڈسم کزن کا ساتھ۔ میں انجانے میں جاوید بھائی کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی جبکہ مجھے معلوم تھا کہ اُن کی شادی جلد ہونے والی ہے۔

اللہ اللہ کر کے سات بجے اور جاوید بھائی بھی اپنے وقت پر آگئے۔ میں نے جلدی سے برقع پہنا اور ان کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ باہر آکر تانگہ لیا۔ پہلے ہم آئس کریم پارلر گئے۔ میں بہت شوق سے آئس کریم کھا رہی تھی۔ جاوید بھائی مجھے مسلسل دیکھ رہے تھے۔

اچانک جاوید بھائی بولے۔ ''آج تو تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگالیا۔ مجھے ان کی یہ حرکت ناگوار نہ گزری بلکہ میں مسکرادی۔ ہم وہاں کافی دیر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

جب جاوید بھائی نے گھڑی پر نظر ڈالی تو بولے۔ ''چلو' فلم کا ٹائم ہوگیا۔'' پھر ہم پکچر ہاؤس پہنچے۔ جاوید بھائی نے باکس کی بکنگ کرائی تھی۔ مجھے فلم بہت اچھی لگی۔ تمام وقت جاوید بھائی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جب کوئی رومانٹک سین آتا تو ہولے سے میرا ہاتھ دبا دیتے۔ میں شادی کے عالم میں فلم دیکھ رہی تھی۔

تب ہی جاوید بھائی نے کہا۔ ''سنو' تم مجھے اچھی لگنے لگی ہو۔''

''مگر آپ کی تو شادی ہونے والی ہے؟'' میں نے کہا۔

''تو؟'' جاوید بھائی بولے۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

اور واقعی شادی کے بعد بھی وہ صبح شام ہمارے گھر کے چکر لگاتے تھے مگر تھوڑے ہی دنوں میں ان کے چھوٹے بھائی امجد کو کچھ شک ہوگیا پھر یوں ہونے لگا کہ جاوید بھائی کے آنے کے ٹائم پر امجد پہلے سے آکر بیٹھ جاتا اور کبھی لوڈو تو کبھی کیرم کھیلنے لگتا۔ اگر کبھی جاوید بھائی پہلے آجاتے تو امجد آتے ہی کہتا کہ بھیا' آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ جاوید بھائی کا ہمارے گھر آنا کم ہوگیا اور امجد نے اپنے بھیا کی جگہ سنبھال لی۔ اب اگر مجھے کہیں جانا ہوتا تو اکثر امجد کے ساتھ ہی جاتی۔ امجد آفس جانے سے پہلے آجاتا اور مجھے اسکول چھوڑ کر پھر آفس جاتا۔ جاوید بھائی اب کم کم ہی آتے تھے۔ ظاہر ہے' شادی شدہ تھے تو بیوی کو بھی وقت دیتے تھے۔

میں اکثر امجد کے ساتھ تفریح کرنے کبھی گارڈن' کبھی شاپنگ پر جانے لگی۔ امجد صورت شکل میں جاوید بھائی جیسا ہینڈسم نہیں تھا مگر اس کی آواز بہت پیاری تھی' گاتا تو دل کرتا' سنتے ہی جاؤ۔

رمضان شریف میں محلے کے لڑکے ٹولی بنا کر ہارمونیم' ڈھول لے کر نعتیں پڑھتے ہوئے سحری کے لیے لوگوں کو جگاتے تھے۔ اُن میں ہی محلے کا ایک لڑکا فہد بھی تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ آواز بھی اس کی غضب کی تھی۔ بھائی کا دوست بھی تھا۔ ہمارے گھر اس کا بھی آنا جانا تھا۔ اس کا رشتہ طے ہوگیا تھا۔ فہد کی ہونے والی بیوی میٹرک پاس تھی جبکہ فہد صرف دو جماعت پڑھا ہوا تھا۔

ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم میرے بھانجے کو پڑھاتی ہو۔ مجھے بھی پڑھاؤ۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم اب اس عمر میں پڑھو گے؟''

''اس میں کیا حرج ہے؟'' وہ بولا۔

پھر دوسرے دن سے وہ پڑھنے آنے لگا۔

ہمارے محلے میں سب ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے' کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا کہ جوان لڑکے لڑکیاں ہیں۔ فہد کی امجد سے بھی دوستی تھی۔ ہم اکثر اکٹھے کیرم وغیرہ کھیلتے تھے۔ میرے بھائی بھی کھیل میں شامل ہوتے تھے۔ یہ 1964ء کا زمانہ تھا پھر فہد کی شادی ہوگئی۔ اب میں نویں جماعت میں تھی۔ ان ہی دنوں ہمارے سامنے کے کوارٹر میں جو فیملی رہتی تھی' ان کے گھر ایک مہمان آ کر ٹھہرا۔

لمبا قد' بڑی بڑی آنکھیں' گھنے سیاہ بال جو ہر وقت ماتھے پر گرے رہتے تھے۔ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح ہر وقت پینٹ شرٹ میں ملبوس رہتا۔ اسے دیکھ کر میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ایک دن میں اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ بھی سامنے کھڑا کسی بچے سے بات کر رہا تھا۔ جب اس کی نظر میری نظروں سے ملی تو میں مسکرا دی' بس پھر تو وہ ہر روز دروازے کے سامنے ہوتا۔ یہ شام کا وقت ہوتا تھا۔ محلے کے بچے کھیل رہے ہوتے تھے۔

اس وقت میں بچوں کو بلا کر باتوں میں لگ جاتی اور ہمارا نین مٹکا بھی چلتا رہتا۔ اس دوران اس نے میرے بھائی سے دوستی کر لی۔ اس محلے میں زیادہ تر دہرہ دون انڈیا سے آئے ہوئے مہاجر آباد تھے۔ اس کا نام گلزار تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ وہ اپنے بھائی وحید کے گھر رہتا تھا۔ میرے بھائی سے اس کی دوستی ہوئی تو ہمارے گھر اس کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ میری تو گویا دلی مراد بر آئی۔ اب میں امجد کی طرف سے کھنچتی جا رہی تھی اور میرا جھکاؤ گلزار کی طرف ہو رہا تھا جسے امجد نے واضح طور پر محسوس کیا تھا پھر وہ خود ہی مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔

اب میں اکثر گلزار کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتی' کبھی لارنس گارڈن تو کبھی کسی سینما۔ اماں کو میری ان سرگرمیوں پر اعتراض نہیں ہوا۔ اگر ابا کچھ بولنے کی کوشش کرتے تو اماں انہیں جھڑک کر چپ کرا دیتی۔

میری زبان میں اتنی مٹھاس تھی کہ ایک مرتبہ کوئی لڑکا مجھ سے بات کر لے تو میرا گرویدہ ہو جاتا' میں محلے میں سب کے گھر آتی جاتی تھی۔ فہد اپنی بہن کے گھر رہتا تھا۔ اس کی بیوی سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ میں اپنی باتیں اکثر اس سے شیئر کرتی تھی۔ میں اب میٹرک میں تھی۔

اماں گھر میں آنے والے لڑکوں سے گھر کا سودا سلف منگواتیں مگر پیسے نہ دیتیں۔ اگر کوئی آ بیٹھتا تو کہتیں۔ ''مجھے چائے کی پتی لا دو تو میں تمہیں چائے پلاؤں گی۔'' یا پھر گوشت' ترکاری' آٹا' گھی' غرض جس چیز کی ضرورت ہوتی' بے دھڑک منگوا لیتیں۔ گویا وہ اپنی جوان بیٹی کے عاشقوں سے خوب فیض اٹھاتی تھیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ ہر خوبرو نوجوان پر میرا دل آ جاتا تھا۔ گھر والوں کی طرف سے کھلی آزادی تھی۔

جب 1965ء کی جنگ ہوئی تو رات میں اوپر کے کوارٹر والے نیچے کے کوارٹروں میں آ جاتے تھے۔ تمام لڑکے اور مرد نیچے گراؤنڈ میں جمع ہوتے تھے۔ سول ڈیفنس کے لڑکے رات بھر جاگتے تھے۔ خوب موج مستی ہوتی۔ فہد کی بہن اور بچے ہمارے ہی کوارٹر میں آ جاتے تھے۔ رات میں چائے بنتی۔ رسک اور باقر خانیاں آتیں۔ کوئی بھی لے آتا۔ ہمیں صرف چائے بنانا ہوتی جو ہم کمرے میں ہیٹر

لگا کر اس پر بنا لیتے تھے۔ جنگ شروع ہوئے شاید پانچواں دن تھا۔ فہد کی بیوی اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کراچی اپنے میکے چلی گئی۔ اب تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اکثر فہد آ کر رات کو ہمارے گھر سو جاتا تھا۔ اسے کہانیاں سنانے کا بہت شوق تھا۔ ہم رات رات بھر باتیں کرتے' کہانیاں سنتے سناتے فہد اکثر کھانے پینے کے لوازمات لے کر آتا اور ہم سب خوب مزے اڑاتے۔ ابا بے چارے اندر کمرے میں پڑے کھانستے رہتے تھے۔ انہیں کسی بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

اماں کے گھر کی روٹی دال ان لڑکوں کی بدولت اچھی چل رہی تھی۔ میرے بھی خوب مزے تھے۔ جنگ تو غالباً گیارہ روز کے بعد ختم ہوگئی مگر میری محبت کا سلسلہ گلزار اور فہد کے ساتھ یوں ہی چلتا رہا۔ امجد اس دوران کراچی شفٹ ہوگیا تھا اور فہد کا قریبی دوست تھا۔ ان کی بیویاں بھی آپس میں ملتی جلتی تھیں۔ جب فہد کی بیوی کراچی میں امجد کی بیوی سے ملی تو اس نے ان کے مشترکہ دوست اکبر کا خط جو کہ امجد کے نام تھا' اسے پڑھایا جس میں محلے کی رپورٹ تھی' ساتھ ہی میرے تمام کرتوت لکھے تھے کہ آج کل تمہاری محبوبہ زرینہ کا فہد کے ساتھ زبردست افیئر چل رہا ہے' فلمیں دیکھی جاتی ہیں۔ فہد کی بیوی تو میکے گئی ہے' ساری کمائی زرینہ پر لٹائی جا رہی ہے۔

یہ خط پڑھنے کے تیسرے دن ہی فہد کی بیوی بغیر اطلاع کے لاہور پہنچ گئی۔ شام کو جب فہد گھر آیا تو یوں اچانک اپنی بیوی کو گھر میں دیکھ کر حیران ہوگیا۔ اس کی بیوی نے اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔ دوسرے دن اسے فہد کی جیب سے میری تصویر ملی۔ اب تو اسے بہت غصہ آیا۔ شام کو اس نے فہد سے پوچھا۔

''زرینہ کی تصویر تمہاری جیب میں کیسے آئی؟''

''اس نے مجھے دی تھی کہ رکھ لو' میں نے رکھ لی۔''

دوسرے دن اس نے میرے بھائی کو بلا کر تصویر دکھائی اور بتایا کہ تمہاری بہن میرے میاں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے' فلم دیکھنے جاتی ہے۔ بھائی نے یہ باتیں اماں کو بتائیں تو انہوں نے بات بنالی۔

''تجھ سے تیری بہن کہہ رہی تھی' بھائی' میرے ساتھ فلم دیکھنے چلو' جب تم نہیں گئے تو میں نے فہد کے ساتھ بھیج دیا۔ اسے وہ انگلش فلم ضرور دیکھنی تھی' اس کا سبجیکٹ تھا۔''

شام کو جب فہد آیا تو اماں نے اس سے اس کی بیوی کی شکایتیں نمک مرچ لگا کر کیں اور فہد کی بیوی کو اس کے سامنے خوب برا بھلا کہا۔ فہد نے گھر جا کر بیوی کو مارا پیٹا' تاہم فہد کی بہن نے معاملہ رفع دفع کرایا۔ بہرحال میں اسی طرح اس کے ساتھ آزادانہ گھومتی رہی۔ میری طبیعت ہی ایسی تھی پھر ماں کی طرف سے بھی کھلی چھوٹ تھی۔

فہد کی بہن کے دیور جمال کا کاروبار تھا' وہ پیکنگ کے لیے لفافے بنواتا تھا۔ اس نے اماں سے لفافے بنانے کی بات کی کہ گھر بیٹھے آپ لفافے بنائیں' میں کاغذ دے جاؤں گا' لفافے بھی خود لے جاؤں گا' پے منٹ ہر ہفتے کروں گا۔ جمال بھی ہیرو سے کم نہیں تھا' وہ اسلم پرویز (مرحوم) سے مشابہ تھا۔ اب میرا رجحان بدلنے لگا۔ جمال کے ساتھ تو میرے اور بھی عیش ہوگئے' اس نے مجھے ہر تفریحی جگہ گھمایا۔ وہ مجھے مری' اسلام آباد' سوات' کاغان بھی لے گیا۔ اماں نے سب سے یہی کہا کہ میں اسکول کے ساتھ ٹرپ پر گئی

ہوئی ہوں۔ جب میں واپس آئی تو بہت سارے تحفے تحائف میرے ساتھ تھے۔ جمال نے آتے ہی اماں کے ہاتھ پر خرچ کے نام پر کافی اچھی رقم رکھ دی تھی۔ اس سیر سپاٹے کے دوران میں نے اپنا سب کچھ جمال کو سونپ دیا تھا۔ اماں خوش تھی۔ ہم دونوں بڑے ہوٹلوں میں جاتے تھے۔ جمال کے پاس کار نہیں تھی نہ ہی اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ اکثر ہم رینٹ پر گاڑی اور ڈرائیور لے کر گھومتے تھے۔ جمال ڈرنک کرتا تھا' مجھے بھی پلاتا تھا۔ ان ہی دنوں مجھ پر انکشاف ہوا' میں ماں بننے والی ہوں' تب میں لرز کے رہ گئی۔ میں نے جمال سے شادی کا اصرار کیا تو اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی بچوں کو اسلام آباد بھیجتا ہوں اپنے سالے کے گھر پھر ہم نکاح کرلیں گے۔ اس کی بیوی تہمینہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ادھر مجھے خوف تھا کہ جلد یہ کام نہ ہوا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔

اللہ اللہ کر کے اس کی بیوی تہمینہ اسلام آباد گئی۔ اتوار کو ہمارا نکاح تھا مگر' واہ ری قسمت' جمال کا دوست شاہد قاضی صاحب کو لے کر آرہا تھا کہ اُن کا زبردست ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جمال اُن کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگیا۔ یوں ہمارا نکاح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دس بارہ روز بعد اس کی بیوی واپس آگئی۔ ادھر ایک روز میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی اور میں بے ہوش ہوگئی۔ اماں نے جمال کو بلوایا۔ وہ مجھے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس لے گیا۔ اس کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی۔ اس نے میرا ابارشن کردیا مگر اس تمام معاملے کا علم جمال کی بیوی کو ہوگیا۔ اس کی بیوی کو پہلے ہی ملازم کے ذریعے کچھ سن گن مل گئی تھی۔ اب تو اس کے پاس پروف تھا۔ جمال کی بیوی کا غصہ آسمان سے باتیں کررہا تھا۔ وہ فوراً ہمارے گھر پہنچی اور وہ شور شرابہ کیا کہ خدا کی پناہ۔ جمال کے بھائی اوپر ہی رہتے تھے' ان کو بھی محلے سے رپورٹیں ملتی تھیں۔ انہوں نے اپنی بھاوج کو سمجھا بجھا کر واپس بھیجا۔ اس کے بعد جمال نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا۔ میں نے بھی اب گھر سے نکلنا بند کردیا تھا مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ جو بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے' ان میں سے ایک کے بڑے بھائی سے چکر چلالیا۔ وہ چھٹا تو کسی اور کو پھنسالیا۔ 1974ء کی بات ہے کہ مجھے ایک میڈیسن کمپنی میں جاب مل گئی۔ ایک دن چھٹی کے بعد میں اپنی سہیلی عاشی کے ساتھ لبرٹی شاپنگ کے لیے گئی۔ وہاں اچانک فہد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بائیک پر اپنے دوست کے ساتھ تھا حالانکہ میں نقاب میں تھی مگر اس نے مجھے پہچان کر بائیک روک لی۔ اپنے دوست سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے اسے میڈیسن کمپنی کا پتا بتایا کہ ملنا ہو تو وہاں آجانا۔ دوسرے ہی دن صبح گیارہ بجے فہد اپنے دوست ملک اقبال کے ساتھ موجود تھا۔ میں جہاں حیران ہوئی' وہاں خوشی بھی ہوئی۔ فہد نے کہا کہ اس کا دوست اقبال مجھ سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔ وہ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ شام میں فلم کا پروگرام بنا۔ عاشی بھی ساتھ تھی۔ گھر والوں کی ہمیں فکر نہیں تھی کیونکہ اوور ٹائم کی وجہ سے ہم اکثر لیٹ ہو جاتے تھے۔ فہد مجھے گھر کے قریب ڈراپ کر دیتا تھا۔ اسی طرح میں ملک اقبال کے ساتھ حدیں عبور کرتی چلی گئی مگر اب میں یہ کھیل کھیلتے ہوئے تھک چکی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے شادی کا مطالبہ کردیا کہ اب ہمیں شادی کرلینی چاہیے۔

جس پر اقبال نے کہا۔ ''میں تم سے دوستی تو رکھ سکتا ہوں مگر شادی ناممکن ہے۔ ویسے بھی میری شادی جلد ہی ہونے والی ہے۔'' یہ سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور اس کی گاڑی سے اتر گئی۔ کافی دن میں پریشانی کا شکار رہی۔

ایک روز میری بھانجی کو پاسپورٹ آفس جانا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئی۔ وہاں جس شخص کے پاس گئی' اس کا نام شہزاد بٹ تھا۔ وہ کشمیری تھا اور مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ میں اس پر فریفتہ ہوگئی۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میری زبان میں ایسی مٹھاس تھی کہ کسی سے بات کرلوں تو وہ میری طرف مائل ہو جاتا تھا۔ صورت بھی اچھی پائی تھی' سفید رنگ' لانبا قد' کالے برقع پر نقاب لگاتی تو آنکھیں حسین لگتی تھیں۔ چنانچہ شہزاد صاحب بھی گھائل ہوگئے اور ہماری ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ اس مرتبہ میں نے شرط رکھی کہ اگر شادی کرنی ہو تو آگے بڑھنا ورنہ نہیں۔ شہزاد بٹ نے مجھے صاف کہہ دیا کہ اسے کچھ مہلت چاہیے کیونکہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس دوران میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بیٹی تھی۔ بھائی' بھابی میرے لچھنوں سے واقف تھے اس لیے انہوں نے الگ گھر لے لیا تھا۔ اماں کی طرف سے کھلی چھٹی تھی۔ محلے والوں کو بھی میرے بارے میں سب پتا تھا مگر کوئی بولتا نہیں تھا۔ اب شہزاد بٹ نے گھر آنا شروع کردیا تھا جہاں اماں ہمیں کمرے میں بٹھا کر خود چلی جاتی تھیں۔ چھ ماہ بعد شہزاد نے مجھ سے شادی کرلی مگر میں رہتی اپنی اماں کے گھر تھی۔ شہزاد کبھی دن میں تو کبھی رات میں آتے۔ کچھ دن بعد ان کی بیوی کو معلوم ہوگیا مگر وہ شریف عورت تھی' اس نے اپنے خاوند سے سمجھوتا کرلیا۔ ایک سال بعد میرے بیٹا ہوا پھر بیٹی ہوئی۔ اسی دوران شہزاد امریکہ چلے گئے۔ وہ بزنس کرتے تھے۔ سال چھ ماہ بعد وہ چکر لگا لیتے تھے۔ اسی طرح سال پہ سال بیتتے گئے اور بچے جوان ہو گئے۔ اب میں اپنے بیٹے سلمان بٹ کی شادی کرنا چاہتی تھی جبکہ شہزاد اسے امریکہ بلانا چاہتے تھے۔ بالآخر انہوں نے دونوں بچوں کو امریکہ بلالیا۔ اس عرصہ میں اماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اب میں اکیلی رہ گئی تھی۔ بچے بہت یاد آتے تھے مگر میرا شوہر انہیں اپنے پاس رکھتا تھا۔

ایک روز میری بیٹی امریکہ سے واپس آگئی۔ اس کا وہاں دل نہیں لگا تھا۔ میں نے اچھا رشتہ دیکھ کر اپنی بیٹی کی شادی کردی تھی۔ میرے شوہر کو پتا چلا تو اس نے مجھے طلاق دے دی۔ میری بیٹی کی ساس سے نہیں بنی اور وہ ایک بچے کے ساتھ گھر آکر بیٹھ گئی۔

آج میں اپنی بیٹی اور نواسے کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرا بیٹا سلمان اپنے باپ کے ساتھ امریکا میں ہے۔ میں نے محبت کی ہوس میں لوگوں کے گھروں میں آگ لگائی' آج میرے اپنے گھر میں آگ لگ چکی ہے' میرے کیے کی سزا میری معصوم بچی کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ آج میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ نمازیں پڑھتی ہوں' نیاز' فاتحہ ہر ہفتہ کرتی ہوں کہ اللہ رب العزت میرے گناہ معاف فرما دے۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ یقیناً وہ معاف فرما دے گا۔ آپ سب بھی میرے لیے دُعا کریں۔

.....☆☆.....

میں سونا چاہتا ہوں

کرن شبیر

اب یہ عالم ہے کہ غم کی بھی خبر ہوتی نہیں
اشک بہہ جاتے ہیں لیکن آنکھ تر ہوتی نہیں

لاہور سے دوسری اعترافی کہانی

میں لاہور کے ایک پوش علاقے گلبرگ میں رہتا ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے' بہترین کوٹھی ہے' نئی کار ہے' خوبصورت بیوی ہے اور ایک معصوم بیٹی ہے۔ معاشرے میں میرا ایک مقام ہے' لوگ میرا احترام کرتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کے باوجود میرے پاس سکون قلب نہیں ہے۔ ایک خلش سی دل میں ہے۔ میں جب بھی اپنے ضمیر کے روبرو ہوتا ہوں تو خود سے نظریں نہیں ملا سکتا۔ میں خود کو انتہائی گھٹیا اور کمینہ انسان سمجھتا ہوں۔ اس وقت بہت شدت سے دل چاہتا ہے' کوئی ایسا ہو جس کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے دل کی بھڑاس نکال سکوں لیکن اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت نہیں پاتا کہ اپنے اس گناہ کو کسی کے سامنے بیان کر سکوں۔

میرا گارمنٹ کا بزنس ہے اور میرا کاروبار نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی پھیلا ہوا ہے۔ اب سے دس برس پہلے میں ایک معمولی آدمی تھا۔ میرے والد کی چھوٹی سی ٹیلرنگ کی دکان تھی اور وہ دن رات سلائی مشین پر محنت کر کے گھر کا خرچ چلاتے۔ اُن کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی اچھی سی ملازمت حاصل کر لوں لیکن اُن کا یہ خواب کبھی حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔ مجھے پڑھائی کا ذرا بھی شوق نہیں تھا' بس جیسے تیسے انٹر کر کے میں نے مزید آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔

پھر میں نے نوکری کی تلاش شروع کر دی مگر نوجوان بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بے روزگار گھوم رہے ہیں پھر بھلا مجھ انٹر پاس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ ابا جی نے کہا کہ تمہیں اگر نوکری نہیں ملتی تو میرے ساتھ دکان پر ہاتھ بٹاؤ۔

مجھے خود کو درزی کہلانا بھی پسند نہ تھا اور نہ ہی ایک جگہ مستقل بیٹھنا میرے بس کا روگ تھا۔ میں نے کہا کہ میں یہی کاروبار بڑے پیمانے پر کرنا چاہتا ہوں۔

میری خواہش کو دیکھتے ہوئے ابا جی نے کچھ رقم اپنے پاس سے لگائی' کچھ دوستوں سے ادھار لی اور مجھے سلائی کی چھ مشینیں خرید دیں۔ مزنگ کی ایک عمارت میں مجھے دو کمرے مل گئے' میں نے وہیں کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو لوگ گارمنٹ کا کاروبار کرتے ہیں' وہ جانتے ہوں گے کہ اس کام میں لڑکیوں سے واسطہ رہتا ہے۔ لڑکیاں بہت کم اجرت پر کپڑے سینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ میں نے ایک گرل ماسٹر رکھا پھر کچھ غریب لڑکیاں کم اجرت پر رکھ کر کاروبار شروع کر دیا۔ ابا جی بھی ہاتھ بٹا دیا کرتے تھے۔

اللہ نے میرے کاروبار میں برکت دی اور ایک ہی سال میں مجھے پرانی جگہ سے منتقل ہونا پڑا کیونکہ دو کمرے اب میرے لیے کافی نہیں رہے تھے' میں نے چھ کمروں کا ایک بڑا مکان کرائے پر لیا اور بہت سی مزید لڑکیاں ملازم رکھ لیں۔ میرا کام اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میری ہوس بڑھتی جاتی تھی۔ جب پیسہ جیب میں آتا ہے تو انسان کو ہری ہری سوجھتی ہے' یہی میرے ساتھ ہوا۔ چار پیسے جیب میں آتے ہی میرا دماغ خراب ہو گیا اور مجھ میں وہ تمام عادتیں آ گئیں جو پیسے والوں میں پائی جاتی ہیں اور دولت مندی کی علامت ہوتی ہیں۔

اُس زمانے میں نائٹ کلبوں اور شراب پر پابندی نہیں تھی' شراب کھلے عام بکتی تھی۔ اپنے جیسے نو دولتیوں کی صحبت میں رہ کر میں بھی شراب پینے لگا' نائٹ کلبوں میں آمد و رفت شروع ہوئی تو بہت سے برے لوگوں سے بھی میل جول ہو گیا۔ جوئے کی لت بھی مجھے یہیں سے پڑی لیکن میں نے اس حد تک احتیاط کی کہ سب کچھ اعتدال سے کیا پھر بھی کسی برے کام کو اعتدال کے باوجود اچھا نہیں کہا جا سکتا۔

میری فیکٹری میں اُس وقت تقریباً چالیس لڑکیاں ملازم تھیں۔ دوسرے تاجروں کی طرح میں نے بھی ان کی مجبوریاں خریدی تھیں۔ یہ لڑکیاں دن بھر محنت کرتیں' ہر شام کسی کو پندرہ روپے ملتے' کسی کو بیس روپے' ہر لڑکی مجبور تھی' کسی کا باپ معذور تھا' کسی کا شوہر نکما تھا' کسی کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا غرض کہ ہر لڑکی کسی نہ کسی مسئلے کا شکار تھی۔

اُن ہی لڑکیوں میں ایک فرزانہ بھی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک معمولی سی فیکٹری میں روزانہ اجرت پر کام کرتی ہوگی۔ فرزانہ اچھے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی کوئی تھا نہیں' صرف دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ اس کے والد واپڈا میں انجینئر تھے۔ والد کے مرنے سے پہلے فرزانہ فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ گھر میں خوب خوشحالی تھی لیکن جب ایک حادثے میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو سر پہ ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ رہا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ ایسے موقع پر عزیز و اقارب اپنے مصیبت زدہ رشتے داروں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں' اس گھرانے کے ساتھ بھی یہی ہوا اور کسی نے اُن کی مدد نہ کی' یوں فرزانہ اپنی مجبوریوں کی گٹھڑی اٹھائے میری فیکٹری تک آ پہنچی۔

مجھے پہلی ہی نظر میں وہ اچھی لگی' لمبا قد' چمک دار سیاہ آنکھیں' کھلتا ہوا گندمی رنگ اور پرکشش سراپا۔ اس کی آواز بھی اتنی خوبصورت تھی کہ اگر وہ ریڈیو یا ٹی وی پر اناؤنسر بننے کی کوشش کرتی تو شاید ناکام نہ رہتی۔ اسے یقیناً کسی بھی اچھے ادارے میں ملازمت مل سکتی تھی کہ آج کل لوگ کام کے مقابلے میں شکل وصورت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

میں بھی اس کی شکل دیکھ کر ہی متاثر ہوا تھا ورنہ میری فیکٹری میں اُس وقت کسی نئی لڑکی کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فرزانہ جب بھی آتی' میں چپراسی کو بھیج کر اُسے اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ وہ میرے کمرے میں آ تو جاتی تھی مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو جاتا تھا' اسے میرے کمرے میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

ایک دن میں فیکٹری سے چھٹی کے بعد گھر جا رہا تھا۔ فرزانہ بس اسٹاپ پر کھڑی نظر آئی۔ وہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کے پاس کار روک دی اور اشارے سے قریب بلایا۔ وہ جھینپتی ہوئی قریب آ گئی۔ کئی دوسرے لوگ بھی اسٹاپ پر کھڑے ہوئے تھے اور اُن کی نظریں ہم ہی پر جمی ہوئی تھیں۔

''کہاں جاؤ گی فرزانہ؟'' میں نے جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''آپ زحمت نہ کریں' میں چلی جاؤں گی۔''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''پلیز فرزانہ! جلدی بیٹھو' لوگ دیکھ رہے ہیں نہ جانے کیا سمجھیں؟''

وہ خاموشی سے سمٹ سمٹا کر کار میں بیٹھ گئی۔ میں بات کرنے کے لیے موضوع تلاش کرنے لگا۔

''فرزانہ.....! تم جانتی ہو' میں تمہارا اتنا خیال کیوں کرتا ہوں؟'' میں نے اس سے خوامخواہ ایک سوال کیا۔

''جی.....!'' اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

''دراصل تم دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب ہو' زیادہ پڑھی لکھی ہو پھر یہ کہ تم ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ اسی وجہ سے مجھے تمہارا زیادہ خیال رہتا ہے۔''

''شکریہ سر.....! میں خود بھی آپ کی احسان مند ہوں۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''میں تمہیں ایک سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ کل

دفتر میں مجھ سے مل لینا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''اوکے سر.....! بس مجھے یہیں اتار دیں' یہاں سے اگلی سڑک پر میرا گھر ہے۔ بہت بہت شکریہ۔''

میں گھر جا کر کافی دیر تک سوچتا رہا کہ فرزانہ کی شخصیت میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھے اس کی طرف بار بار متوجہ کرنے پر مجبور کرتی ہے؟

دوسرے دن فرزانہ آئی تو میں نے اُسے یہ خوشخبری دی کہ اُس کی تنخواہ میں تین سو روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی اور وہ ممنون نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اب ہم اکثر ایک ساتھ گھر جانے لگے۔ یہ ملاقاتیں لفٹ کی حد سے آگے بڑھ کر لاہور کے ہوٹلوں اور پرسکون پارکوں میں ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں نے رنگ دکھایا اور اس پر میری محبت کا جادو سر چڑھنے لگا۔ اب میرے بغیر اسے اپنی زندگی ادھوری لگتی تھی لیکن میں کچھ دن بعد ہی اس سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ میری ملاقات ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیٹی سے ہوگئی تھی۔ وہ بھی میری طرف مائل تھی۔ اب میرا خیال تھا کہ فرزانہ جیسی غریب لڑکی سے شادی کر کے میرا مستقبل تاریک ہو سکتا ہے۔

اُس روز کلب میں میری ملاقات ایک بہت بڑے سرکاری افسر سے ہوگئی۔ اُس افسر کا نام میں یہاں ظاہر نہیں کروں گا۔ وہ صاحب اب بھی سرکاری ملازمت میں ہیں اور اسلام آباد میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی اور میری دلچسپیاں مشترک تھیں اس لیے ہم جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ ایک دو بار انہوں نے فرزانہ کو بھی میرے ساتھ دیکھا تھا اور اس کے حسن کے گرویدہ تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ ''یار' تم گارمنٹ ایکسپورٹ کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے کہا۔ ''نہ تو میرے پاس اتنا سرمایہ ہے اور نہ ہی ایکسپورٹ پرمٹ۔''

''پرمٹ تمہیں میں دلواؤں گا اور سرمایہ بھی لگا دوں گا لیکن پچیس فیصد کا شیئر کرنا پڑے گا مجھ سے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں تیار ہوں۔'' میں جلدی سے بولا۔

اس کے بعد ہم نے بزنس کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیاری بھی کیا کرنا تھی' پرمٹ حاصل کرنا اُن صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا' سرمایہ فراہم کرنے میں انہیں تین دن لگ گئے۔ میں نے بھی اپنی جمع پونجی داؤ پر لگا دی۔ میں نے ایک آدھ دفعہ سوچا بھی کہ اگر خدانخواستہ ہمیں نقصان ہو گیا تو میں پیسے پیسے کو محتاج ہو جاؤں گا کیونکہ کاروبار وسیع کرنے کے چکر میں' میں نے اپنی پرانی فیکٹری کا تمام سامان ایک اور پارٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ میرا پروگرام تھا کہ کچھ سرمایہ ہمارے پاس ہے' کچھ گورنمنٹ سے قرض لیں گے اور بالکل نئی قسم کی مشینری جاپان سے منگوائیں گے۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو افسر صاحب کے رویئے میں اچانک تبدیلی آ گئی۔ کلب میں وہ مجھ سے سرد مہری سے ملے اور کاروبار کے بجائے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔

میں نے پوچھا۔ ''پرمٹ کب دلوا رہے ہیں؟''

اُن کے رویئے سے مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔

''پرمٹ کے سلسلے میں ایک دشواری پیدا ہو گئی ہے' مشکل ہی ہے پرمٹ کا ملنا۔'' ان کی بات سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

''لیکن.....لیکن میں کیا کروں گا؟ میں تو اپنی

کشتیاں جلا کر بیٹھا ہوں؟"

وہ مکاری سے مسکرائے پھر بولے۔"ہاں...... ایک صورت ہو سکتی ہے وہ لڑکی ہے فرزانہ اسے......"

میں فوراً ان کا مطلب سمجھ گیا اور بات کاٹ کر بولا۔"فرزانہ ایک شریف خاندان کی لڑکی ہے اور......"

"شریف خاندان کی لڑکی ہے جب ہی تمہارے ساتھ آزادانہ گھومتی پھرتی ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولے۔"بہر حال سوچ لو ورنہ پھر مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔"

میرا دل چاہا اس خبیث کا منہ نوچ لوں بوڑھا گدھ...... اپنی شکل تو دیکھ پہلے...... لیکن وہ جا چکا تھا۔ میں عجیب الجھن میں پھنس گیا دل و دماغ میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ ہر چند کہ میں فرزانہ سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اُسے اس رنگیلے بڈھے کے حوالے کر دیتا۔

رات بھر میں خود سے لڑتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ فرزانہ آئی تو میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ان افسر صاحب کو فون کیا کہ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ اس نے کہا کہ فرزانہ کو فلاں ہوٹل میں لے آؤ۔

میں نے فرزانہ سے باہر چلنے کو کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ بہت دن بعد میں نے اس سے باہر چلنے کی فرمائش کی تھی ورنہ پچھلے دنوں تو میں اس سے کھنچا کھنچا رہا تھا۔ وہ خوشی سے سرشار میرے ساتھ چل دی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اسے تباہی کے غار میں دھکیلنے لے جا رہا ہوں۔ میں اسے لے کر سیدھا ہوٹل پہنچا۔ ان صاحب نے ایک کمرا پہلے سے ہی بک کیا ہوا تھا۔ میں اسے لے کر کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس وقت تک وہ صاحب وہاں نہیں پہنچے تھے۔ میں نے چائے منگوائی۔ چائے پینے کے دوران میں فرزانہ نے مجھ سے پوچھا بھی کہ یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ میں نے بہانہ بنایا کہ یہاں ایک صاحب آنے والے ہیں مجھے ان سے کچھ کام ہیں ان سے مل کر چلتے ہیں۔

اتنے میں وہ صاحب بھی آ گئے۔ ہم نے دو چار منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر ایک بہانے سے میں وہاں سے اٹھ گیا۔ فرزانہ نے کہا کہ میں بھی چلتی ہوں۔ وہ کچھ خوف زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

"میں بس ابھی پانچ منٹ میں فون کر کے آتا ہوں۔" میں نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

شام کو ان صاحب سے ملاقات ہوئی اور تمام معاملات طے پا گئے۔ دوسری صبح میں اٹھا تو ذہن تر و تازہ تھا۔ یہ کامیابی کا نشہ تھا۔ اتنے میں نوکر اخبار لے آیا۔ میں نے یونہی ایک سرسری نظر اخبار پر ڈالی اور ایک خبر پر میری نظریں جم کر رہ گئیں۔ "گارمنٹ فیکٹری میں کام کرنے والی ایک لڑکی نے خودکشی کر لی......"

نیچے پوری تفصیل تھی کہ فرزانہ نامی ایک لڑکی نے کل شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان زہر پی کر جان دے دی...... اخبار میرے ہاتھ میں کانپنے لگا۔ میرے لالچ اور ہوس کا اتنا بھیانک نتیجہ نکلے گا یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

آج میں ایک بہت بڑی گارمنٹ فیکٹری کا منیجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ میرے تیار کردہ کپڑے ملک بھر میں مشہور ہیں۔ مارکیٹ میں میری ساکھ ہے لیکن جب بھی فرزانہ کا خیال آتا ہے میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کئی کئی راتیں گزر جاتی ہیں میں سو نہیں سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں اسی لیے یہ تحریر بصورتِ اعتراف آپ لوگوں کی نذر کر رہا ہوں۔ خدارا میرے حق میں دعا کیجیے گا کہ مجھے سکون مل جائے۔

......☆☆......

سلسلے وار کہانی

دمگھٹی

ارشد علی ارشد

جب حقیقت فسانہ بن جائے
کیا حقیقت کسی فسانے کی

چھٹی قسط

خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین دسمجھ دار اور دوں سے مختلف سوچ خیالات نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ دو بھائیوں اطہر اور مظہر ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام غیر شادی شدہ پھوپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے مکھنی اس محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے!!

محبت اور عشق کی باتیں کرتی گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی واسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی ہے۔ مکھنی سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اطہر کی دوبئی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہو گا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھی کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے ہی اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر اسے بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو مکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو گیا جبکہ اس کا بھائی باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ ایک روز مکھنی کی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ وہ بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو بلانے جاتی ہے کہ راستے میں اسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اسے چوہدری کے فارم لے جایا جاتا ہے جہاں سے اسے لاہور کی ہیرا منڈی میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات انجم نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو اپنی دکھ بھری داستان اسے سناتی ہے۔

مکھنی انجم کو حوصلہ دیتی ہے پھر مکھنی انجم کو اس غلیظ جگہ سے نکال کر لے جاتی ہے۔ اس کام کے لیے وہ دلاور نامی گارڈ کی مدد لیتی ہے مگر خانم کے غنڈے ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ راستے میں فائرنگ سے دلاور مر جاتا ہے اور ان کی گاڑی میں آگ لگ جاتی ہے۔ مکھنی اور انجم دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔

(اور اب آگے پڑھیے۔)

”نہیں الف بچائے گا اور باقی پانچ ممالک کو بھی الف ہی ان میں ضم کرے گا۔“

”الف......وہ کیسے؟“ بلاول حیران تھا۔ میں نے اس کے سینے پر ہلکی سی چپت لگائی۔

”بدھو بدھو کے بدھو ہی رہو گے۔ دنیا میں ٹوٹل 61 ممالک ہیں ان 61 ممالک میں سے صرف چھ ممالک کے دارالحکومت کے نام الف سے شروع ہوتے ہیں۔ پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد ہے۔ جہاں اسلام آباد

ہو وہاں تباہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سارے سازشی ٹولے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں۔ انشاء اللہ پاکستان روزِ قیامت تک قائم ودائم رہے گا۔ جن دوسرے ممالک کے میں نے نام لیے ہیں فلسطین اور سعودی عرب کے علاوہ ان کے دارالحکومت بھی الف سے شروع ہوتے ہیں اور الف سے ہی اللہ ہے۔ اب سوچو جسے اللہ تعالیٰ بچائے اُسے کون تباہ کر سکتا ہے؟“

میرا بچہ معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے دوسرے بچوں کی طرح تجسس اس میں بھی کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ جس کام سے روکا جائے اُسے کر کے چھوڑتا ہے۔ بہت سمجھا چکی ہوں بیٹا جس کام سے بڑے منع کریں اُسے مت کیا کرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے مگر حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد جو ٹھہرے......اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا۔ ”جنت میں رہو اور جہاں سے مرضی آئے کھاؤ پیو مگر فلاں درخت کے پاس مت جانا۔“ لیکن شیطان مردود نے انہیں ورغلایا اور وہ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کر بیٹھے جس کا نقصان اٹھایا اور جنت سے نکل کر دنیا میں آ گئے مگر معاویہ نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کے سینے پر دو چار مکے برساتے ہوئے کہا۔ ”وہ کام کرو کہ تمہیں نشانِ حیدر ملے۔ جانتے بھی ہو نشانِ حیدر کیا ہے؟“

”آپ ہی بتا دو امی! جانتا بھی ہوں تو آپ نے بتا کے ہی چھوڑنا ہے۔“ میں معاویہ کی بات پر ہنس پڑی فطرتاً میرے جیسا ہی ہے۔

”حضرت علیؓ کا لقب ”حیدر“ ہے۔ حیدر کا مطلب شیر ہے۔ نشانِ حیدر پاکستانی فوج کا اعلیٰ ترین اعزاز ہے۔ یہ پاکستان کی تینوں بحری بری اور فضائی افواج کے اُن جانبازوں کے حصے میں آتا ہے جو بہادری اور شجاعت میں لاثانی ہوتے ہیں جن کا مقصد اللہ اور اس کے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ اور اپنے وطن پاکستان کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کرنا ہوتا ہے۔ نشانِ حیدر پانچ کونوں والا ستارہ ہے جسے توپ دھات زنک اور تانبے کی آمیزش سے تیار کیا جاتا ہے۔ ستارے کے پانچوں کونوں پر تانبے اور نکل کی سفید دھات سے استعمال کیا جاتا ہے اس کے ساتھ ڈیڑھ انچ چوڑا سبز ربن ہوتا ہے۔ نشانِ حیدر کی پٹی کے اوپر واضح الفاظ میں ”نشانِ حیدر“ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ میڈل کی پشت پر خوش قسمت فوجی کے بارے میں معلومات درج ہوتی ہیں۔ شہید کا نام تاریخِ شہادت تاریخ ولادت آرمی نمبر جائے پیدائش وغیرہ۔ نشانِ حیدر کا اعزاز پانے والے شہداء کے ورثاء کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے دس ہزار روپے نقد اور ۳ مربع اراضی الاٹ کی جاتی ہے۔ معاویہ! تجھے بھی انشاء اللہ نشانِ حیدر ملے گا اور لوگ کہیں گے یہ معاویہ ہے۔ مہر داد نگر کے رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی مکھنی کا بیٹا سن رہا ہے تو!“

”سن لیا امی! تو دعا کر میں کام کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ بھاگ گیا۔

”بلاول تباہی کے دن قریب آ رہے ہیں چلو پاکستان چلتے ہیں!“

”تمہیں کس بات کی فکر ہے؟ بقول تمہارے دونوں ہی ملک بچ جائیں گے۔“

”ہاں مگر پھر بھی ہمیں اپنے ملک میں ہونا چاہیے۔ کیا پتا ہواؤں کے رخ بدل جائیں؟“

”ہواؤں کے رخ کون تبدیل کرتا ہے؟“

”اللہ تعالیٰ!“

”اور ان ملکوں کو تباہی سے کون بچائے گا؟“

"اللہ تعالیٰ!"

"پھر فکر مت کرو۔ ہواؤں کا رخ بدلنے والا بھی اللہ ہے اور بچانے والا بھی اللہ۔ وہ جانے اور اس کا کام جانے۔"

"بلاول.....! بہت تاویلیں گھڑنا آ گئی ہیں تمہیں پھر بھی کل کے ٹکٹ بک کرا لو۔ ہمیں ہر صورت میں پاکستان چلنا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر!"

"بولو۔"

"مہر داد مگر تک میری ہر بات بلا چوں چرا مانو گی۔"

"منظور ہے۔"

"اور اگر نہ مانی تو؟"

"بلاول! نہ جانے تمہیں ہر لحہ کھٹکا کیوں رہتا ہے؟ نہ مانی تو سزا تیری مرضی کی۔"

"ٹھیک ہے چلو ٹکٹ لے لیتے ہیں۔"

•.....•.....•

ابوظہبی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر دو ٹرمینل ہیں۔ (اب تین ہو چکے ہیں اور نئے ایئرپورٹ کا کام شروع ہونے والا ہے۔) ٹرمینل ون سے مقامی کمپنیوں کی ایئرلائن پروازیں کرتی ہیں اور ٹو غیر ملکی ایئرلائن کمپنیوں کے لیے مختص ہے۔ ہم ٹرمینل ون کے ویٹنگ ہال میں موجود تھے۔ یہ بالکل چھتری کی طرح بنا ہوا ہے۔ چھتری کے ڈنڈے کی طرح بیچ میں بہت بڑا گول ستون ہے۔ ستون سے نیچے گولائی میں آنے والی چھت اور اس کی دیواریں ہال کسی بڑے شاور کی شباہت بھی رکھتا ہے۔ میری نظر ستون پر پڑی تو مجھے لگا' وہ ہل رہا ہے' میرے دیکھتے ہی دیکھتے اور زور سے ہلنے لگا۔ ستون کا ہلنا رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں' دیواروں' دکانوں اور انسانوں پر لرزہ طاری تھا۔ ڈیوٹی فری شاپ کی چھوٹی بڑی دکانیں باہم ٹکرانے لگیں' شیشے ٹوٹنے لگے اور سامان گرنے لگا۔ در و دیوار کا لرزنا جاری تھا' ساتھ ہی ہواؤں کے تیز جھکڑ بھی چلنے لگے۔ ہوا اتنی منہ زور تھی کہ اس میں دکانوں کا سامان پرواز کرنے لگا۔ پرفیومز' جیولری' خشک میوہ جات' گفٹ' موبائل' سگریٹ اور بے شمار اشیائے خورد و نوش پرزے پرزے ہو کر اڑ رہا تھا۔ مٹی' دھول اور خس و خاشاک بھی شوں شوں کر رہا تھا دکانوں کے ریسپشن پر کھڑی ہوئی فلپائنی لڑکیوں کے منی اسکرٹ ہوا سے اوپر اٹھنے لگے۔ وہ چیختی ہوئی زمین میں لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ مردوں کی ٹائیاں ان کے گلے کا پھندہ بن گئی تھیں۔ وہ لڑکھڑا کر گر رہے تھے۔ میں نے بلاول کی طرف دیکھا' وہ بڑے سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔

"تم بڑے سکون سے بیٹھے ہوئے ہو؟"

"ہاں تو تمہیں کون سا بچھو کاٹ رہے ہیں؟"

"دیکھ نہیں رہے' آندھی اور طوفان آیا ہوا ہے' تیز ہواؤں کی منہ زوری دیکھو' کیا قیامت خیز تباہی مچا رہی ہیں۔ لوگوں کے ہاتھ' پاؤں اور چہرے مٹی سے اٹے ہوئے ہیں۔ تمہیں لوگوں کے انتشار اور چیخ و پکار کا کوئی احساس نہیں؟"

"چپ کر کے بیٹھو مکھنی.....! اب اگر بولی ناں تو تھپڑ ماروں گا۔"

"تم سے وعدہ کیا تھا اسی لیے چپ ہو جاتی ہوں اور جہاں تک تھپڑ کا تعلق ہے تو شوہر ہو میرے' سہنا پڑے گا کیونکہ ہمارے مذہب میں بیوی پر شوہر کے بہت زیادہ حقوق دیئے گئے ہیں ورنہ بلاول' تمہیں میں چیونٹی کی طرح ہتھیلی پر رکھ کر مسل دیتی۔" بلاول ہنسنے لگا۔

"تم اپنے رشتے کا خوب فائدہ اٹھا رہے ہو؟" اس کی ہنسی مزید گہری ہو گئی۔

"تم جانتے ہو' جہاز کس نے ایجاد کیا تھا؟" میں نے کھڑکی سے نیچے جھانک کر پوچھا۔ اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع و عریض اور مخلوق بونی نظر آ رہی تھی۔

"جس نے بھی کیا ہے' میری بلا سے' تم خاموش رہو!"

حکم کی تعمیل کرنا پڑی' وعدہ جو کیا تھا۔ بلاول نیچے دیکھنے لگا۔ برف کے پہاڑ تھے۔

"کون سی جگہ ہے؟"

"قراقرم کے پہاڑ ہیں!"

"یہ کہاں واقع ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا۔" بلاول جان چھڑانے میں ماہر تھا۔

"بلاول' تم میرے ہر سوال پر کیوں جھنجلا جاتے ہو؟"

"بھئی' سچ میں' مجھے نہیں معلوم۔"

"مجھے قراقرم کی پہاڑیاں دیکھنی ہیں!"

"ٹھیک ہے' جا کر دیکھ لو۔" بلاول روانی میں کہہ گیا تھا مگر وہ بھول گیا تھا' میں نے اس کے ہر حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ میں فوراً رضامند ہو کر بولی۔ "ٹھیک ہے' میں چلتی ہوں' گھر میں میرا انتظار کرنا!"

"قراقرم سلسلۂ کوہ' پاکستان' چین اور انڈیا کے سرحدی علاقوں میں واقع ہے۔ قراقرم دنیا کے چند بڑے پہاڑی سلسلوں میں شامل ہے۔ ترکی زبان کے لفظ "قراقرم" کے لفظی معنی "کالی' بھربھری مٹی" کے ہیں۔ سلسلۂ کوہ قراقرم کی سب سے اونچی چوٹی کے ٹو ہے۔ کے ٹو بلندی میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ کے ٹو کے ساتھ قراقرم میں 60 سے زیادہ چوٹیوں کی بلندی 7,000 میٹر سے زیادہ ہے۔ قراقرم سلسلہ کوہ کی لمبائی 500 کلومیٹر تقریباً 300 سو میل ہے۔ اس سلسلے سے گزرنے والا دریائے سندھ اہم ترین دریا ہے۔ میں نے جس طرف بھی نگاہ کی' بلند و بالا پہاڑیوں کے سلسلے نظر آئے' برف سے اٹے ہوئے' سفید چادر میں ڈھکے ہوئے پہاڑوں نے مجھے بے حد متاثر کیا' جی چاہا' باقی زندگی اسی سلسلہ کوہ میں گزار دوں مگر معاً یہ خیال آیا تو میں بے چین ہو گئی۔ کاش میں اسے بھی ساتھ لے آتی۔ بندہ شوہر کے بغیر رہ سکتا ہے' اولاد کے بغیر رہنا بہت مشکل کام ہے۔

بلاول جلا بھنا میرا منتظر تھا' کہنے لگا۔ "تمہیں مجھ سے ذرہ برابر محبت نہیں ہے' مجھے چھوڑ کر اکیلی کہاں چلی گئی تھیں؟"

"بھئی سپاری پر 8 لکھا ہوا ہوتا ہے اور میرے ہاتھوں میں ہمیشہ رہنے والے کی جبین پر بڑا واضح 8 لکھا ہوا ہے۔ اب اور کیا ثبوت دوں اپنی محبت کا؟ اور ہاں' میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی' تمہارے حکم کی تعمیل کی تھی۔ 8 سے بسم اللہ ہوتا ہے اور B سے بلاول بھی۔ جس کام کی ابتدا بسم اللہ سے ہو' اس میں برکت ہی برکت ہوتی ہے

اس لیے ہمارے پیار میں بہت برکت ہے۔"

"کچھ معاویہ پر بھی توجہ دو۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر کرو۔ ضدی ہوتا جا رہا ہے اور بدتمیز بھی۔ بڑوں کی بات نہیں مانتا اور کبھی کبھار گالی دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ تم ماں ہو، اپنے منصب کا پاس رکھو۔"

"میں ماں ہوں اس لیے تم سے بہتر جانتی ہوں۔ ماں کی خدمت کی بدولت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جنت کا ساتھی ایک قصائی بنا ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ کو حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود ہونے کے باوجود آپ سے شرفِ ملاقات حاصل نہ ہو سکا کیونکہ آپؓ اپنی ضعیف والدہ کی خدمت میں مصروف تھے۔ اسلام غائبانہ قبول کیا پھر بھی آپؓ زہد و عبادت کا پیکر تھے۔ طور طریقوں سے مجذوبانہ شان جھلکتی تھی۔ حضرت محمدؐ نے حضرت اویس قرنیؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ تابعین میں سب سے بہتر ہیں، یہ ماں کی خدمت کا صلہ ہے۔"

"بلاول، تم نے یہ دیوار کیوں بنائی ہے؟ ایسے لگتا ہے جیسے یہ گھر کے بیچ میں نہیں، عین میرے دل کے وسط میں کھڑی کی گئی ہے!"

"ملکھنی......! تم بھی عجیب لڑکی ہو، تمہارے کہنے پر ہی تو بنائی ہے، جب بناتے نہیں تھے، چیختی چلاتی تھیں کہ میری بات نہیں مانتے ہو، تم بھی تباہ ہو جاؤ گے، اب بنا دی ہے تو چیختی ہو کہ کیوں بنائی ہے؟ تمام گھر والے تمہارے سامنے ہاتھ باندھے غلاموں کی طرح کھڑے ہوتے ہیں، تمہیں بھی کچھ احساس کرنا چاہیے۔"

"اچھا، بکو مت، مجھے احساس ہے، تمہیں میرا بہت زیادہ خیال ہے۔ اب اسے گرا دو پلیز، اس کا سایہ زہر لگتا ہے، مجھے دھوپ چاہیے۔"

"پاگل لڑکی ہو تم، سندھی کہاوت ہے، خوبصورت بیوی، ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھا پانی قسمت والوں کو نصیب ہوتے ہیں۔"

"تب تو تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں تو تینوں چیزیں میسر ہیں۔" بلاول ہنسنے لگا، وہ ہنستا ہے تو پورا جسم ہلتا ہے، میرا جی چاہا، اس کے سینے پر زور سے مکہ ماروں۔ وہ پھر ہنسا تو میں نے سیدھے ہاتھ کا زوردار مکا اس کے سینے پر مارا۔

"کیوں مار رہی ہو؟"

"اب اس بات کو چھوڑو اور دروازے کے پار دیکھو، کون کھڑا ہوا ہے؟" میں نے بلاول سے کہا تو وہ بولا۔

"مجھے پار نظر نہیں آتا۔"

"مظہر بھائی ہے، جاؤ، دروازہ کھولو۔"

"تمہیں پتا تو ہے، یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے مقفل ہے، یہ نہیں کھلے گا۔"

"کھل نہیں سکتا، ٹوٹ تو سکتا ہے۔"

"مجھ سے نہیں ٹوٹے گا۔"

"تمہیں کون کہہ رہا ہے؟"

"مظہر بھائی، دروازہ کھلے گا نہیں، اسے توڑ کر اندر آ جاؤ۔" میں دروازے کے اس پار مظہر بھائی کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے شیشے کے پار جھانک رہی ہوں۔ پتا نہیں، کیوں میری آنکھوں میں نوکیلا شیشہ زور سے چبھتا ہے؟

"ملکھنی......! اتنا بڑا دروازہ کیسے ٹوٹے گا؟"

"مظہر بھائی، آپ بھی مایوسی کی باتیں کرنے لگے ہو۔ میں بلاول سے کہا کرتی ہوں تو بھی میری طرح ٹھنگنا ہے، میرے بھائیوں کو دیکھو، دونوں اکٹھے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں تو ایک دیوار بن جاتی ہے، جس کے پیچھے یہ سارے گھر والے چھپ سکتے ہیں، دروازہ ضرور ٹوٹے گا بھائی، اگر یہ نہ ٹوٹا تو میری آنکھ کا شیشہ ضرور ٹوٹے گا۔" میری بات کے جواب میں مظہر بھائی نے آگے بڑھ کر چوبی دروازے کو زوردار لات رسید کی، دروازہ تنکوں کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ بکھر گیا جیسے کوئی لکڑہارا کلہاڑی کی ضرب سے لکڑی کو چیرتا ہے تو لکڑی کے کئی پرزے دائیں بائیں اڑ کر گر جاتے ہیں، چوبی دروازہ اسی طرح دائیں بائیں بکھر کر گر گیا مگر میری آنکھ کا شیشہ نہیں ٹوٹا۔ مظہر بھائی نے اندر آ کر بلاول سے ہاتھ ملایا اور مجھے سینے سے لگا کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑی تقویت اور محبت ہوتی ہے بھائی کے ہاتھ میں جب یہ سر پر آتا ہے۔ "مظہر بھائی! شیشہ کیوں نہیں ٹوٹا؟ دیکھو میرا ہاتھ!" میں نے اپنا سیدھا ہاتھ اسے دکھایا، میرے ہاتھ پر سفید کپڑے سے پٹی باندھی ہوئی تھی۔

"سنگھار میز کے شیشے کو مکا مارا تھا، شیشہ تو نہیں ٹوٹا، اپنا ہاتھ زخمی کروا بیٹھی ہے۔"

"بلاول، تم ہمیشہ میری ناکامی کی خبریں مزے لے کر بیان کرتے ہو۔"

"یہ دیوار پر چائے کے چھینٹے کیسے ہیں؟" مظہر بھائی دیوار پر یوں ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے بکری کی پیٹھ سہلا رہا ہو۔

"رات چائے کا تھرماس دیوار پر دے مارا تھا، کہتی ہے، شیشہ نہیں ٹوٹتا۔"

"پھر شیشہ ٹوٹا؟"

بلاول ہنسنے لگا، میرا غصہ پھر عروج کی طرف گامزن تھا۔ میری کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ میں نے ساری اتار کر بلاول کے منہ پر دے ماریں۔ مظہر بھائی خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"مظہر بھائی! آپ کیوں چپ ہو؟ میں نے آپ کو بھی مارا؟ آپ میرے دل کے سب سے زیادہ قریب ہو مگر کبھی کبھی لگتا ہے، شادی کے بعد آپ بھی اپنی بیوی بچوں میں مگن ہو گئے ہو۔"

"ملکھنی......! تیرا دماغ ہمیشہ اپنا مقام چھوڑ دیتا ہے۔ شادی مظہر بھائی کی نہیں، اظہر بھائی کی ہوئی ہے۔"

"ہاں! جب سے وہ دوبئی گیا ہے، اس کی بیوی رانی کی گردن فخر سے تن گئی ہے، اسے سمجھاؤ، غرور...... اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ غرور کرنے والوں کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو، اس کا سر بھی یوں جھکے کہ پھر عمر بھر اٹھا نہ سکے......"

"میں کیا کہوں، تمہاری بھابھی ہے، تم ہی سمجھاؤ۔"

"میری بھابھی سب سے زیادہ مجھ سے جلتی کڑھتی ہے۔ جب میں دبئی گئی تھی، جل کر کوئلہ ہو گئی تھی۔ میں نے کہا، جس دن راکھ ہو گی تو ہوا میں بکھر جاؤ گی۔ اس کے امی ابا، میرے امی ابا سے تعلقات استوار کرنا نہیں چاہتے۔ اظہر بھائی کو دیکھو، اپنی امی ابا کے سامنے رانی کے ابا کو گالیاں نکالتا ہے۔ مجھے یقین ہے، رات میں رانی کے پاؤں چوم کر کہتا ہو گا، تیرے ماں باپ میرے سر کے پھول ہیں۔ کوئی قسم دے کر اسے پوچھے، رانی نے بھی کبھی اسے ایسا کہا؟ بلکہ کہتی ہو گی، تیرے امی ابا مجھے زہر لگتے ہیں، جواباً اظہر بھائی ہنستا ہو گا۔"

"معاویہ کہاں ہے؟"

''یہیں کہیں کھیل رہا ہوگا۔ عجیب بچہ ہے' ہمیشہ ماں بچے کے کان کھینچتی ہے' معاویہ میرے کان پکڑے رکھتا ہے۔''

''شام ہوگئی ہے' مجھے گھر جانا ہوگا۔'' مظہر بھائی اٹھ گیا۔

''لو اب مظہر بھائی کو دیکھو ای (میری ساس) کا ہاتھ پکڑے رو رہا ہے۔ ساتھ میں دوسروں کو بھی رُلا دیا۔ چلو میں بھی رو لیتی ہوں' شاید میری آنکھ کا شیشہ ٹوٹ جائے۔''

''باجی! میری بہن کا خیال رکھنا' اسے ہم نے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے۔'' مظہر بھائی کے آنسو تھمتے نہیں۔ ای نے اس کا تسلی آمیز انداز میں ہاتھ سہلایا..... ''تیری قسم مظہر! اس کا خیال اس کی ذات کے سبب نہ بھی رکھوں' تیرے آنسوؤں کی وجہ سے ضرور رکھوں گی۔ میں نے تمہیں آج پہلی بار روتے دیکھا ہے' تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ' شام ہوگئی ہے' اندھیرا بڑھ رہا ہے اور اندھیرے سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''بلاول' گاڑی نکالو اور مظہر کو گھر چھوڑ آؤ' ساتھ جنید کو بھی لے جاؤ۔ واپسی پر اکیلے رہ جاؤ گے۔ شام کے بعد تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے۔''

''ای! مظہر بھائی کو میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ مجھے اندھیروں سے ڈر بھی نہیں لگتا۔ بلاول کے ساتھ جانے کی فرصت نہیں۔'' جنید کی جلد بازی ہمیشہ مجھے کڑھتی ہے۔

''بلاول.....! سمجھاؤ اسے۔'' میں نے انتہائی تلخ لہجے میں بلاول سے کہا۔ ''یہ رَب کے کاموں میں کیوں دخل اندازی کرتا ہے؟''

''رَب کے کاموں میں دخل اندازی؟''

''ہاں! اللہ نے اسے تم سے چھوٹا پیدا کیا ہے مگر یہ ہمیشہ تم سے آگے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے' ہمیشہ خود کو بڑا ثابت کرنے پر تُلا ہوا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تم سے بعد میں پیدا کیا ہے' چھوٹا ہے تو خود کو چھوٹا تسلیم کر لے۔''

''ہاں' ہاں' سمجھا دوں گا۔ تم کمرے میں جاؤ۔''

''اور یہ بھی بتانا میں کئی بار کہہ چکی ہوں' اکڑی ہوئی گردنیں اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں۔ تباہی کے دن آنے والے ہیں' غرور سے تنے ہوئے سر تن سے جدا ہو جائیں گے۔ امریکہ کا Statue of Liberty بھی پاش پاش ہوگا تو ساتھ انہیں بھی لے ڈوبے گا۔ ایک تو اس گھر میں اتنے افراد ہیں' بندہ' بندوں سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔ بلاول کے سات بہن بھائی' چار بچے اور بیسیوں ان کی اولادیں' سب کو اکٹھا تین کنال کے مکان میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ الگ الگ مکان بنائے جا سکتے ہیں۔ جانتے بھی ہیں کہ جہاں جس قدر زیادہ برتن ہوں' وہاں ان کے ٹکرانے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ برتن جب ٹکراتے ہیں تو کانچ کے برتن ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ پتا نہیں' ان میں سے کون کانچ کا ہے اور کون اسٹیل کا؟ میرا کیا ہے' جب تک آنکھ کا شیشہ نہیں ٹوٹے گا' کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

''اچھا' تم چپ رہو' میں مظہر بھائی کو لے چلتا ہوں۔ اپنے ساتھ ارشاد (جنید سے چھوٹا بھائی) کو لے جا ہوں۔ کشمیر میں نیلی برف کے پہاڑ ہیں' یہ صدیوں سے پگھلے نہیں ہیں لیکن امریکا نے اس پہ ہار پر سے گرم بارش برسائی ہے اسی لیے پاکستان میں سیلاب آنے لگے ہیں۔ امریکی ادارہ ہارپ قدرتی موسموں پر بہت زیادہ

اثر انداز ہو رہا ہے۔ جب گرم بارش برف کے پہاڑوں پر گرتی ہے تو برف پگھلنے سے پانی کا ایک طوفان آ جاتا ہے۔ یہ طوفان سیلاب کی شکل میں پاکستان کے بیشتر علاقوں کو لے ڈوبتا ہے۔ اس بار بپھرے ہوئے پانی کا رخ ہمارے تین کنال کے گھر کی طرف تھا۔ پانی کی منہ زوری اس قدر شدید تھی کہ گھر کے سارے درخت جڑ سے اکھڑ کر گر گئے۔ موٹی بہہ کر نہ جانے کس طرف نکل گئے۔ دیواریں پانی میں ڈوب کر تباہ و برباد ہوگئیں۔ ہم کہاں جائیں؟ گھر کے افراد بہت زیادہ اور ہیلی کاپٹر صرف ایک ہے جس میں صرف پانچ افراد کی گنجائش ہے۔

معاویہ! اف میرے خدا! میرا معاویہ تو پانی ہی میں رہ گیا ہے۔ وہاں ایسا کون ہے جو اس کا خیال رکھے گا؟ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔

''بلاول.....! بلاول!'' میں نے بلاول کا گریبان پکڑ لیا اور ہذیانی انداز میں چیخ کر کہا۔ ''تم ہیلی کاپٹر میں سکون سے بیٹھے ہو اور معاویہ کا کچھ پتا نہیں ہے۔''

''تمہیں بھی معاویہ کا اب خیال آیا ہے جب ہیلی کاپٹر فضا میں اٹھ چکا ہے اور ہاں' فکر مت کرو' معاویہ کو ارسلان چچا نے کمپیوٹر کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ وہ گیم کھیل رہا ہوگا۔''

''مجھے ان سے یہی توقع ہے۔ کوئی نہیں چاہتا' میرا معاویہ بڑا ہو کر بڑا آدمی بنے۔ سب جلتے ہیں معاویہ سے بھی اور مجھ سے بھی!'' میں نے فون نکال کر مظہر بھائی کو کال ملائی۔

''مظہر بھائی آپ ہمارے ہی گھر میں ہیں نا؟''

''ہاں ملکنی' کیا بات ہے؟''

''بھائی' بہت شدید سیلاب آیا ہوا ہے۔ انسان' جانور' مکانات' درخت' سب کچھ بہہ رہا ہے۔ ہم پانچ افراد ہیلی کاپٹر میں ہیں مگر معاویہ..... معاویہ گھر میں رہ گیا ہے۔'' میری آنکھوں سے شیشے کی کرچیاں نیچے گرنے لگیں۔ شاید ٹوٹی ہوئی کرچیاں آنکھوں میں چبھ گئی تھیں اس لیے آنسوؤں کے ساتھ خون بھی بہنے لگا تھا۔

''مظہر! معاویہ کو گھر میں کوئی نہیں بچائے گا۔ سب اس کے دشمن ہیں' وہ اسے مار دیں گے۔ آپ معاویہ کو بچا لیں۔ میں پائلٹ سے کہہ دیتی ہوں۔ ہمیں قراقرم کے سلسلہ کوہ میں نہیں اترنا ہے۔ ہمیں واپس زمین پہ لے جائے۔ زمین والے زمین پہ ہی اچھے لگتے ہیں۔'' میں ہذیانی انداز میں بولے جا رہی تھی۔

''تم فکر نہ کرو ملکنی! معاویہ میرے پاس ہے' میری گود میں بیٹھا ہوا ہے اور بہت پیاری پیاری باتیں کر رہا ہے۔'' ای مجھ سے یوں لپٹ رہی ہیں جیسے میں ابھی ابھی قراقرم کی پہاڑیوں سے اتر کر آئی ہوں۔ اُس طرف کون بیٹھے ہوئے ہیں؟ بہت سی آوازیں آ رہی ہیں۔

برآمدے میں گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد جمع ہیں اور جشنِ آزادی کا فنکشن منا رہے ہیں۔ رضا دلی ماموں اسٹیج سیکریٹری ہیں۔

''مگر آج تو چودہ اگست ہے؟'' میں نے کیلنڈر دیکھتے ہوئے کہا۔

''چودہ اگست ہی تو ہمارا یومِ آزادی ہے ملکنی!''

چودہ نہیں' پندرہ اگست ہے ہمارا یومِ آزادی۔ ہماری تاریخ کے ساتھ مؤرخین نے دغا کی ہے۔ ای ابو نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا اور ابو بولے۔ ''دغا' وہ کیسی ملکنی؟''

''ابو.....! پاکستان رمضان شریف کے مہینے میں بنا تھا نا؟''

''ہاں' ستائیس رمضان المبارک کا دن تھا۔'' ابو نے کہا۔

اسلامی کیلنڈر اٹھا کے دیکھ لیں' 1947ء میں ستائیس رمضان المبارک کو پندرہ اگست کی تاریخ تھی۔ 13 اگست 1947ء کو وائے سرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن غیر منقسم ہندوستان میں دلی سے کراچی آتے ہیں اور وہ 14 اگست 1947ء کو غیر منقسم ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور اسمبلی کے ممبران کے سامنے وہ اپنی تقریر میں کہتے ہیں۔ پاکستان کا گورنر جنرل اگلے دن یعنی پندرہ اگست کو منتخب کیا جائے گا۔ پندرہ اگست 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناحؒ پاکستان کے گورنر جنرل اور ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے عہدے کا حلف اٹھاتے ہیں۔ پاکستان میں جب اولین ڈاک ٹکٹ شائع ہوئے تو ان پر یوم آزادی کی اصل تاریخ پندرہ اگست ہی شائع ہوئی تھی۔ سال 1948ء کے لیے حکومتِ پاکستان نے سرکاری چھٹیوں (گزیٹڈ ہالی ڈیز) کی فہرست شائع کی تو اس میں بھی یوم آزادی کی چھٹی کا دن پندرہ اگست لکھا ہوا تھا۔ بعد میں نہ جانے کیا ہو کہ ۲۷ رمضان المبارک بھی بدل گیا اور تاریخِ جشنِ آزادی بھی! اگر حقائق یہی کہتے ہیں تو آزادی کے اصل دن کا تعین کر لینا چاہیے۔ آخر بھارت نے بھی تو اپنے کئی شہروں کے نام تبدیل کیے ہیں۔ بمبئی' ممبئی ہو گیا' مدراس' چنائے ہو گیا تو ہم اپنا یومِ آزادی درست کیوں نہیں کر سکتے؟''

•.....•.....•

''بلادل! سیلاب تباہی مچا کر گزر گیا ہے۔ ہمارا گھر بھی تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ تم معاویہ کا خیال رکھنا۔ مجھے اس کے پاؤں کا نشان نظر آ رہا ہے۔ تمہیں پتا نہیں' میں معاویہ کے لیے کتنا بھاگی ہوں۔ سارے گھر والے اسے چھپانا چاہتے ہیں۔ اسے حاصل کرنے کے لیے میں نے ناقابلِ بیان اذیتیں برداشت کی ہیں' پانی کے پتلے پائپ سے سینکڑوں بار گزری ہوں۔ تمہیں پتا بھی ہے' ایک انچ کے پائپ سے گزرنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ پورا وجود چھلنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن کھنچے چلے جاتے ہیں۔ کنپٹی کے بال پلاس سے پکڑ کر ادھیڑے جاتے ہیں۔ پورا جسم ہی زخموں سے چُور چُور ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ سارے دکھ درد سہے ہیں۔ معاویہ کے لیے میں کئی بار مری ہوں اور کئی بار زندہ ہوئی ہوں مگر تم سارے گھر والوں کو بتا دو کہ میں معاویہ کو ایک بلند پایہ انسان بنا کے چھوڑوں گی۔ اسے نشانِ حیدر ضرور ملے گا۔''

میں ابو ای کو دیکھتی ہوں تو حال میں پلٹ آتی ہوں۔ مجھے حال میں لوٹنا اچھا نہیں لگتا۔ روم کولر ٹھنڈی میٹھی ہوا میری طرف پھینک رہا ہے۔ میرا دل و دماغ باغ باغ ہو رہا ہے۔ مجھے متبرک اور مقدس خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ میرے سامنے بیت اللہ شریف ہے۔ میں آنکھیں کھولتی ہوں تو تین کنال کے گھر کے بند برآمدے میں ہوتی ہوں مگر آنکھیں بند کر لوں تو بیت اللہ شریف کے سامنے!

یہاں مجھے بہت ساری سُریلی اور دل موہ لینے والی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کتنا خوبصورت پرنور اور باوقار بیت اللہ شریف ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بیت اللہ شریف تعمیر ہو چکا تھا۔ فرشتے اس کا طواف کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے' دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل جنت میں سب سے پہلے کعبہ شریف تعمیر کیا گیا جسے بیت المعمور کہا جاتا ہے جو کہ ہنوز موجود ہے۔ زمین میں خانہ کعبہ کی تعمیر عین بیت المعمور کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام نے فرمائی۔ جب نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان آیا تو اس طوفان سے خانہ کعبہ بھی نہ بچ سکا اور اس کے آثار مٹ گئے۔ بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی مدد سے اسے پھر سے تعمیر کیا۔ بیت اللہ کی عمارت مختلف سائز کے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی لمبائی ۱۸ فٹ اور عرض ۱۴ فٹ ہے جبکہ اونچائی ۳۵ فٹ ہے۔ جب اسے ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا' تب خانہ کعبہ پر چھت نہیں تھی۔ موجودہ بیت اللہ شریف پر چھت بھی موجود ہے۔

•.....•.....•.....•

''شش..... شش.....!''

مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' ابو ای کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

''کیا ہے ابو؟ آپ نے مجھے کیوں روکا؟''

''نہیں منکھنی.....! میں نے تمہیں نہیں روکا' تم سو جاؤ۔'' ابو نے کہا۔

ابو بھی عجیب ہیں' سونے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے جاگنا پڑتا ہے مگر میں کہاں تھی؟ خانہ کعبہ میں' مکہ مکرمہ کی معطر فضاؤں میں! اوہ ابو! آپ نے مجھے فضول میں واپس کھینچ لیا۔

میں نے آنکھیں دوبارہ موند لیں۔ ٹھنڈی میٹھی ہوائیں پھر چلنے لگیں۔ دورِ نبوی ﷺ میں خانہ کعبہ کے داخلی اور خارجی دو دروازے تھے۔ اب ایک دروازہ ہے جس کی چوکھٹ کو ملتزم یعنی چمٹنے کی جگہ کہا جاتا ہے۔ حاجی حضرات یہاں چمٹ کر روتے ہیں' بلبلا کر گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ دروازے کے جنوب مشرقی کونے میں حجرِ اسود نصب ہے۔ بعض روایات کے مطابق حجرِ اسود حجرِ ابیض یعنی سفید تھا۔ لوگوں کے چُومنے سے ان کے اندر کے گناہوں نے اسے حجرِ اسود کر دیا۔ حجرِ اسود سات انچ قطر کا پتھر ہے۔ ایک حادثے کی وجہ سے یہ ٹکڑے ہو گیا تھا پھر اسے ٹکڑوں کی شکل میں ایک جگہ یکجا کر کے نصب کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت طیبہ سے قبل بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر شروع ہوئی۔ جب حجرِ اسود کے نصب کرنے کا وقت آیا تو بہت سے قبائل میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ اختلاف اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ نیام سے تلواریں نکل آئیں۔ خون خرابے سے بچنے کے لیے طے یہ پایا کہ کل صبح جو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو گا' وہی حجرِ اسود نصب کرے گا۔

اگلی صبح رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپؐ کے بعد آنے والے بے اختیار پکار اٹھے۔ ''آپؐ بے شک صادق و امین ہیں' ہمیں آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔'' آپؐ نے اپنی چادر بچھا کر حجرِ اسود اس پر رکھا۔ آپؐ نے ہر قبیلے کے سردار کو حکم دیا کہ چادر کا کونہ پکڑ لے۔ اس طرح تمام قبائل کے سرداروں نے یہ شرف حاصل کیا پھر حجرِ اسود کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے نصب کیا۔

•.....•.....•.....•

''سن رہے ہیں؟'' امی کی آواز آئی۔

''ہاں ہاں' سن رہے ہیں منکھنی! بولو نا! آگے بھی بولو آنکھیں مت کھولنا۔''

''خانہ کعبہ کی گیارہ مرتبہ تعمیر کی گئی۔ پہلی بار فرشتوں نے تعمیر کیا' دوسری بار آدم علیہ السلام نے' تیسری بار شیث علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا۔ چوتھی بار اسے ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ پانچویں بار عمالقہ' چھٹی مرتبہ

جرہم' ساتویں بار قصیٰ بن کلاب نے یہ شرف حاصل کیا۔ آٹھویں بار قریش نے تعمیر کیا۔ نویں بار عبداللہ بن زبیرؓ نے تعمیر کیا۔ دسویں بار حجاج بن یوسف اور گیارہویں مرتبہ سلطان مراد رابع بن سلطان احمد نے اسے تعمیر کیا۔ ان کے بعد بھی آج تک کعبہ شریف کی مرمت اور حرم شریف کی توسیع کا کام مختلف مسلمان خلفاء اور بادشاہوں نے جاری رکھا ہوا ہے۔ اب حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت ہے۔ سنیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "صرف تین مساجد ایسی ہیں جن کے لیے سفر کیا جاسکتا ہے۔ ایک مسجد حرم' دوسری مسجد اقصیٰ اور تیسری میری مسجد یعنی مسجد نبوی!

اب دنیا تباہ ہونے والی ہے جس نے جہاں رہنا ہے' وہیں مرنا ہے۔ میکدے والے مے و جام میں لڑھکتے ہوئے لڑھک جائیں گے۔ مسجد والے مسجدوں میں پرسکون نیند سو جائیں گے۔ بازار والے دکانوں کی جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے ساکت ہو جائیں گے اور مزاروں والے کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہوئے کھڑے رہ جائیں گے۔

تباہی' صرف تباہی! اوپر دیکھو' آسمان چنگھاڑ رہا ہے۔ نیچے دیکھو' زمین پہ لرزہ طاری ہے۔ مکان' درخت' پہاڑ' میدان' کھیت' گاؤں' شہر' سب کے سب تباہ ہو جائیں گے۔ وقت ختم ہو چکا ہے۔ میری آنکھ کا شہتیر ٹوٹنے والا ہے' ہوائیں منہ زور ہو چکی ہیں' آسمان سے شعلے لپک رہے ہیں۔ زمین تڑخ رہی ہے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگے ہیں۔ کچھ نہیں بچے گا' سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اب بھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔ تم لوگوں نے اپنے اپنے فتاویٰ مرکز کھول رکھے ہیں۔ کیا پاکستان میں سب کافر ہیں؟ کوئی مسلمان نہیں ہے؟ ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا ہے۔ ہر شخص بہ زعم خود مفتی ہے لیکن سب کافر ہیں۔ راہ چلتا راہ گیر' سبزی فروش یار کشا ڈرائیور! دکاندار ہو یا بزنس مین' وزیر ہو یا فقیر' کسان ہو' بوڑھا ہو یا نوجوان' دین کا کوئی بھی مسئلہ ہو' کسی سے بھی پوچھ لو وہ فوراً کفر کا فتویٰ جاری کر دے گا۔ ہر شخص مفتی ہے لیکن کوئی مسلمان بھی ہے؟

یوں لگتا ہے کہ حدیث شریف میں جن تہتر فرقوں کا ذکر آیا ہے' وہ سارے پاکستان میں جنم لیں گے۔ ایک فرقہ دوسرے کے پیچھے' دوسرا' تیسرے اور تیسرا' چوتھے کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہیں۔ دو آمنے سامنے کی مساجد کے پیش امام صاحبان منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر پورے دلائل کے ساتھ دوسرے کو کافر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلاول! تم اپنا موازنہ نہ کرو۔ تم کون ہو' مسلمان یا کافر؟ اگر مسلمان رہنا ہے تو دوسروں کی فکر بعد میں کرو' پہلے خود کامل مسلمان بنو۔"

•.....•.....•

سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے اور میں یہاں قید ہوں تنگ و تاریک کمرے میں۔ نہ روشنی ہے' نہ تازہ ہوا۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے رفتہ رفتہ میری روح جسم سے نکلتی جا رہی ہے۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا ہے۔ لگتا ہے' مجھ پہ نزع کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی ملکھنی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ کتنی خوب صورت اور دلکش دنیا ہے۔ مجھے اسے چھوڑنا پڑے گا۔ انسان ہزار برس بھی جی لے لیکن اسے بہرحال ایک دن مرنا ہی پڑتا ہے۔ آخرت ایک وسیع و عریض' بے کراں سمندر ہے اور دنیا اس کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے اس سمندر سے چلو بھر پانی بھر لیا جائے۔ پتا نہیں' ہم چلو بھر پانی کے لیے اس بحرِ بے

کراں کو فراموش کیوں کر دیتے ہیں؟

مجھے ابھی جینا ہے' اپنے لیے نہ سہی' معاویہ اور بلاول کے لیے! ابھی تو میری آنکھ کا تیشہ بھی نہیں ٹوٹا۔ میں کیسے مر سکتی ہوں؟ میں نے ایک کربناک چیخ ماری۔ میری آواز ویران حویلی میں گونج کر رہ گئی۔ کھنڈر نما ویران حویلی کا تاریک کمرا' کمرے کا گرد آلود' ٹھنڈا فرش! یوں لگتا ہے جیسے فرش پر کسی نے بے شمار سوئیاں ڈال رکھی ہیں۔ میں سوئیوں پر لیٹی ہوئی ہوں جو مجھے چبھ رہی ہیں اور میرا جسم لہولہان ہو رہا ہے۔ پورے جسم سے لہو کا رساؤ جاری ہے اور کسی کو کوئی فکر نہیں۔

میں جھٹکا کھا کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔ مجھے باہر نکلنا ہے۔ میں اذیت ناک موت نہیں مرنا چاہتی مگر باہر کیسے نکلوں؟ ہر طرف اندھیرا ہے' سپاٹ دیواریں اور پتھریلی چھت' کوئی دروازہ' کوئی رستہ نہیں جس سے باہر نکلا جا سکے مگر مجھے کوشش تو کرنا ہی ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے خاصی قوت سے میرے کانوں کے پردے پر بھاری پتھر دے مارے ہوں۔

"خبردار! اگر اٹھنے کی کوشش کی تو تمہارے پاؤں کاٹ دوں گا۔" یہ..... یہ وہی آواز تھی جو مجھے ابوظہبی میں ہسپتال کے کمرے میں سنائی دی تھی۔ جب ماموں رضاولی' معاویہ کے کان میں اذان دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اسی آواز نے مجھے آٹھ انچ کے پائپ سے آٹھ بار گزرنے پر مجبور کیا تھا۔ گھپ اندھیرے میں صرف وہ آواز سنائی دے رہی ہے۔ بولنے والا کہاں تھا' مجھے کچھ علم نہیں تھا۔

وہ کرخت لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "کٹے ہوئے پیروں سے کوئی چل نہیں سکتا۔ ساری عمر یہیں پڑی رہو گی۔ گل سڑ جاؤ گی' تمہارے جسم کو چوہے نوچیں گے اور کیڑے کھائیں گے۔"

میری ہنسی نکل گئی۔ یہ بھی مجھے پاگل لگتا ہے جو ایسا کہہ رہا ہے۔ یہ سب تو قبر میں ہوگا؟ لیکن ممکن ہے' نہ ہو۔ کھرے مومن کے لیے تو قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ ہو سکتا ہے' میرے مقدر میں باغ لکھا ہو۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟" اس بار لہجے میں پہلے سے زیادہ سفاکی اور درندگی تھی۔

"چوہوں اور کیڑوں والی بات پر ہنس رہی ہوں۔" میں نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی تو میرے کانوں سے کھر کھر کھر کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مجھے لگا جیسے میرے قریب ہی کوئی مشین چل رہی ہے۔

"یہ..... یہ کیا ہے؟"

"الیکٹرک مشین! مشین کے ساتھ تیز دھار بلیڈ ہے جو سخت لکڑی کاٹنے میں ایک سنٹ لگاتا ہے لیکن انسانی ہڈی کاٹنے میں پندرہ سیکنڈ لیتا ہے۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"نن..... نہیں..... میں بھاگوں گی نہیں..... یہ ظلم مت کرو۔" میں چلا اٹھی۔ میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ کھر کھر کی آواز نزدیک سے نزدیک تر ہو رہی تھی۔ اس بار آواز والا نہیں رہا تھا۔ بے ہنگم بلند قہقہہ' چھت پھاڑ دینے والی کریہہ آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"تم..... تم ہو کہاں.....؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتے ہو؟ تمہاری آواز بہت مکروہ ہے' شکل بھی بھیانک ہوگی۔"

"درست قیاس لگایا ملکھنی' شکل دیکھو گی تو خوف سے مر جاؤ گی۔ میں فی الحال تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ صرف

گستاخی کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

کھر کھر کی آواز میرے پاؤں کے قریب پہنچ گئی۔ میں نے خوف سے پاؤں اپنی جانب سمیٹنا چاہے مگر سمٹے نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ جکڑے جا چکے ہیں۔ میں کوئی بھی حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ مجھے محسوس ہوا' مشین کا تیز دھار بلیڈ فل اسپیڈ سے گھوم رہا ہے۔ اس کی ہوا میرے پاؤں کو حدت پہنچا رہی تھی۔ میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میری شلوار کے پائنچے ہوا سے اٹھ کر اوپر ہو گئے۔ میرے پاؤں ٹخنوں تک عریاں ہو گئے۔

کھر کھر کی آوازیں بڑھنے لگیں۔ میرا جسم بری طرح لرزنے لگا۔

"نہیں...... یہ...... ظلم...... مت......" میرے منہ سے تیز چیخ خارج ہوئی۔

بلیڈ میرے ٹخنے سے ٹکرا چکا تھا۔ کھرچ کھرچ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میرا سانس سینے میں گویا گھٹ کر رہ گیا۔ چیخیں گلے میں دب کر رہ گئیں اور ذہن گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

ظالموں نے میرے دونوں پاؤں کاٹ دیے تھے۔ میرا ابا رحیم اللہ ترکھان تھا مگر کبھی ترکھانوں والا کام نہیں کیا تھا۔ میں نے کبھی آری چلتی نہیں دیکھی تھی مگر لکڑی کٹتے دیکھی تھی۔ اتنی بے دردی سے کوئی لکڑی نہیں کاٹتا جتنی بے دردی سے میرے دونوں پاؤں کاٹے گئے تھے۔ لہو فرش پر پانی کی طرح بہنے لگا۔ مجھے اب پتا چلا' اذیت کسے کہتے ہیں۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ درد کی حس کا تعلق براہ راست انسانی دماغ سے ہوتا ہے۔ آج کل کا دور نت نئے تجربات کا دور ہے اس لیے اس معاملے میں بھی نئی دریافتیں سامنے آئیں تو پتا چلا کہ درحقیقت درد کا احساس دلانے والے خلیے جلد کے اندر پائے جاتے ہیں اسی لیے ڈاکٹر حضرات degree of burn معلوم کرنے کے لیے جلی ہوئی جلد میں سوئی چبھوتے ہیں۔ مریض کو درد محسوس ہو تو پتا چل جاتا ہے۔ جلد میں درد کا احساس دلانے والے خلیے زندہ ہیں اور زخم سطحی ہیں۔ اگر درد کے خلیے مر جائیں تو مریض کو سوئی چبھونے سے بھی درد نہیں ہو گا۔

مجھے بھی سائنس کا یہ مفروضہ سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر میں نے پڑھا' تیا ٹگ مائے یونیورسٹی' تھائی لینڈ کے اناٹومی کے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین پروفیسر میگاٹیٹ ٹی جانسن درد محسوس کرنے والے خلیوں کے بارے میں تحقیق پہ تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ یہ جاننے کی سعی میں ہیں کہ درد محسوس کرنے والے خلیے درحقیقت انسانی جسم میں کہاں پائے جاتے ہیں؟ اپنی تحقیق میں ڈوبتے جا رہے تھے اور الجھتے جا رہے تھے کہ ان کی مشکل قرآن کریم کے پارہ نمبر ۵' سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵۶ نے دور کر دی۔

(ترجمہ۔ "جن لوگوں نے کفر کیا' ہماری آیتوں کا' بے شک انہیں ہم عنقریب آگ میں ڈال دیں گے۔ جس وقت ان کی کھالیں پک (گل) جائیں گی۔ اس کے علاوہ (دوسری) بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں۔ بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔")

پروفیسر میگاٹیٹ ٹی جانسن چونک پڑا۔ جس چیز کو وہ برسوں سے کھوج رہا ہے' وہ مسلمانوں کی کتاب میں چودہ سو برس پہلے سے بتا دی گئی ہے یعنی درد محسوس کرنے والے خلیے انسانی جلد کے اندر پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر مزید آگے بڑھے' تب انہیں پتا چلا۔ قرآنِ کریم سائنسی کتاب نہیں ہے بلکہ کتابِ ہدایت ہے۔ اس کے

باوجود اس میں چھ ہزار سے زائد نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ ان چھ ہزار میں سے ایک ہزار سے کچھ زیادہ نشانیاں سائنس کے متعلق ہیں۔ پروفیسر صاحب کی زندگی اور سوچ کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔

ریاض' سعودی عرب میں آٹھویں سعودی میڈیکل کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس کا موضوع تھا۔ "قرآن وسنت کے سائنسی آثار"

اس کانفرنس میں پروفیسر میگاٹیٹ ٹی جانسن نے بھی شرکت کی اور بھرے مجمع کے سامنے کلمۂ حق پڑھ کر مسلمان ہوئے۔

اس سارے واقعے کا اصل پس منظر مجھے معلوم نہیں تھا مگر اب جبکہ میرے دونوں پاؤں کٹ گئے ہیں' میں جان چکی ہوں' درد محسوس کرنے والے خلیے کیا ہوتے ہیں۔ میں اس درد سے نجات چاہتی تھی مگر جس طرح اپنی جگہ سے حرکت کرنے سے قاصر تھی' اسی طرح درد کو رفع کرنے کے معاملے میں بھی بے بس تھی۔

دفعتاً مجھے لگا' باہر چہل پہل شروع ہو گئی ہے' چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

"مکھنی......! مکھنی!"

میں چونک پڑی۔

"مظہر بھائی!" میرے انگ انگ میں خوشی کا احساس سرائیت کر گیا۔ لگتا ہے' مجھے گھر والے لینے کے لیے آ گئے ہیں۔ زیادہ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ آوازوں میں ابو اور بلاول کی آوازیں واضح ہیں۔ پھوپھو اور مسکان کی مدہم آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے' میرے میکے اور سسرال والے دونوں خاندان مجھے لینے آ گئے ہیں۔"

میرا روم روم خوشی سے سرشار ہو گیا مگر میں باہر کیسے نکلوں گی؟ میرے تو پاؤں ہی کٹ گئے ہیں' پاؤں کی اذیت ایک بار پھر بڑھنے لگی۔ درد بے کراں ہوتا چلا گیا۔ درد اس قدر بڑھ گیا کہ میں سر کے بال نوچنے لگی۔

باہر سے پھر مجھے پکارا جانے لگا۔ "مکھنی......! مکھنی......!"

"مظہر بھائی! میں یہاں ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"مکھنی! ہم کب سے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ باہر نکلو۔" بہت سے قدموں کی آہٹوں سے مجھے محسوس ہوا کہ سب لوگ باہر جمع ہو گئے ہیں لیکن تاریک کمرے کا نہ تو کوئی دروازہ ہے نہ میرے پاؤں سلامت ہیں۔ باہر والے اندر کیوں نہیں آ جاتے؟"

"مظہر بھائی! آپ لوگ باہر کیا کر رہے ہیں؟ خدا کے لیے' اندر آ جائیے۔ مجھے یہاں سے باہر نکالیں پلیز!"

"مکھنی! ہم اندر نہیں آ سکتے' یہاں صرف ایک چھوٹا سا رخنہ ہے' تم رخنے سے ہاتھ باہر نکالو۔ ہم تمہارے ہاتھ میں انگوٹھی پہنائیں گے اور تم خود باہر آ جاؤ گی۔ ہم سب تمہارے استقبال کے لیے باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ امی ابا اور رانی بھابھی بھی ہیں۔"

(اس حیرت اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے۔)

......☆☆......

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا' اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پھر صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہ ہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات بہ راہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اِتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور بہ راہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات فوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کی بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110' آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

ماہِ شوال المکرّم

عزیزو.....!

ماہِ رمضان المبارک کا اختتام ہوا۔ وہ لوگ بہت خوش نصیب ہیں جنہوں نے اِس متبرک اور مقدس ماہ کو پایا اور اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھایا۔ زندگی کی بے ثباتی دیکھتے ہوئے جو لوگ مکمل صحت کے ساتھ اِس ماہ کو پاتے ہیں' وہ یقیناً خوش نصیب ہوتے ہیں۔ اَب ماہِ شوال المکرّم گویا روزہ داروں کے لیے اللہ کی جانب سے انعام ہے کہ اللہ کے نیک بندے عیدالفطر کی خوشیاں مناتے ہیں۔ پورے رمضان المبارک میں روزہ دار اپنے نفس پر قابو رکھتے ہیں اور انعام کے صلے میں عیدالفطر آتی ہے۔ عیدالفطر سے ہمیں محبت' اخوت اور بھائی چارے کا سبق ملتا ہے۔ یہ ہر صاحبِ استطاعت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خوشی کے اس موقع پر اپنے اُن نادار و سفید پوش بھائیوں کا خیال رکھے جو خودداری کے باعث کسی کے آگے دستِ سوال بھی دراز نہیں کرسکتے۔ ہمیں چاہیے کہ اس عیدالفطر کے موقع پر اپنے تمام مسلمان بہن بھائیوں کو یاد رکھیں اور انہیں بھی خوشیاں فراہم کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں کو بہت محبوب رکھتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔

⊖ محمد علی ابڑو۔ روہڑی۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ میرا مسئلہ بھی حل کر دیجیے۔ میرے دو سوال ہیں جن کے جواب چاہئیں۔ مسئلہ نمبر 1۔ میں عرصہ سات سال سے سخت ترین مالی مشکلات کا شکار ہوں جس وقت سے میری نوکری یونیٹیلٹی اسٹور پہ شروع ہوئی ہے' مجھے ہر دفعہ نقصان ہوتا ہے۔ ہر سال مجھے چالیس ہزار یا پچاس ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔ بابا جی' میں ملازمت عنقریب چھوڑنے والا ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں ایف آئی اے پولیس میں نوکری کروں۔ بابا جی' اب آپ مجھے کوئی بہت ہی مؤثر وظیفہ تحریر کیجیے کہ جس سے میں جلد از جلد ایف آئی اے پولیس میں نوکری کروں۔ میری یہ خواہش پوری ہو اور مجھے نوکری مل جائے۔ میرا دوسرا مسئلہ یادداشت اور ذہن کی بہتری کے لیے اور ترقی کے لیے آسان سا وظیفہ دیں جو میں آسانی سے کر سکوں۔ بابا جی' مجھے آسان سا وظیفہ دیں جو میں عشاء کی نماز کے بعد کروں اور 20 دن یا 25 دن کا وظیفہ دیں۔ اللہ کے واسطے' جواب سے ضرور نوازیں۔ میں آپ کو ساری عمر دعا دیتا رہوں گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بابا جی' میں نے بڑی امید سے خط لکھا ہے کہ میرے مسائل حل ہوں اور میری زندگی بن جائے۔ بابا جی' مجھے بغیر سفارش نوکری مل جائے۔

☆ بیٹے علی! رزق میں برکت کے لیے بعد نمازِ عشاء سورۃ واقعہ ترجمے کے ساتھ پڑھا کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

⊖ عامر' کراچی۔

☆ بیٹے عامر! تمہارا خط مجھ تک پہنچایا گیا' خط پڑھ کر ایک بات تو واضح ہو گئی کہ تمہاری فیکٹری پر سفلی عملیات کروائے گئے ہیں جو چیزیں بھی وہاں سے نکلی ہیں' انہیں سمندر برد کر دو۔ چوکیدار فوری طور پر تبدیل کر لو۔ اس کے علاوہ اُن ملازمین کی لسٹ ضرور تیار کرو جو پہلے سے اس فیکٹری میں ملازمت کر رہے تھے اور اب تمہارے ساتھ بھی ہیں۔ مجھے نام ارسال کرو۔ جلد از جلد دو عدد تعویذ منگوا کر فیکٹری میں رکھ دو۔ تفصیل کے لیے ''سچی کہانیاں'' کے دفتر فون کرو۔ میں فیکٹری کا حصار بھی باندھ دوں گا۔

⊖ ٹ۔ ج۔ لاہور۔

☆ بیٹی ٹ۔ ج! شوہر سے اس مسئلے پر بات کرنا چھوڑ دو۔ جس بات پر جھگڑا ہو' اسے ترک کر دینا چاہیے حالانکہ تم جو چاہتی ہو' وہ جائز ہے۔ شوہر سے کہو کہ وہ تمہیں یہاں گھر الگ لے کر دے دے۔ تم اپنے والدین کے گھر رہنا نہیں چاہتیں مگر یہ بات بھی نرمی اور موقع محل دیکھ کر کرنا۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

⊖ ک۔ کاشف۔ بٹ گرام۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! خدا آپ کو خوش رکھے۔ بابا جی' سچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا ہوں لیکن آپ کا کالم دل کی گہرائیوں سے پڑھتا ہوں کیونکہ آپ کا جواب دینے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ آپ اتنے سہل وظائف خلقِ خدا کو دیتے ہیں کہ خدا کی مخلوق بھی سہولت کے ساتھ کر لیتی ہے۔ میں اپنے مسائل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے' آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ بابا جی' میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت شرمیلا ہوں' مجھ میں اعتماد نہیں ہے' لوگوں سے صحیح طرح بات نہیں کر سکتا' زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے

مجھے بعد میں اپنے آپ پر بہت غصہ آتا ہے لیکن پھر کچھ نہیں کر سکتا۔ لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بابا جی' میں چاہتا ہوں کہ میں بھی دوسروں کی طرح سب سے کھل کر' ہنس کر بات کر سکوں لیکن میری کمزوری میری خواہش پر غالب آ جاتی ہے۔ بابا جی' میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسکول میں لڑکے' لڑکیاں اور گاؤں میں بھی لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں' مجھے کم تر سمجھتے ہیں' مجھے عورتوں کے ناموں سے پکارتے ہیں مثلاً باجی گل' گل بوٹا جی وغیرہ جس کی وجہ سے مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں اکیلے میں روتا بھی ہوں۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگتا ہوں لیکن شاید اللہ تعالیٰ مجھے ایسی ہی سزا دینا چاہتا ہے کہ میں لوگوں میں کم تر رہوں' لوگ مجھے برے ناموں سے پکاریں' میرا ہر وقت مذاق اڑائیں یا یہ اللہ کے محبت کرنے کا دوسرا روپ ہے؟ بابا جی' میرا تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری زبان میں ہکلاہٹ ہے یعنی باتیں صحیح طرح نہیں کر سکتا' زبان گنگ ہوتی محسوس ہوتی ہے' ہکلاہٹ کے لیے میں نے پانی اور چینی بھی دم کر کے استعمال کیے لیکن ان سے افاقہ نہیں ہوا۔ طرح طرح کے ورد و وظائف بھی پڑھے لیکن ان کا بھی خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا۔ لوگ میری ہکلاہٹ پہ ہنستے ہیں اور مجھے غصہ بھی آتا ہے۔ ایک تو میرے اندر اعتماد نہیں اور جب بات بھی کرنے لگتا ہوں تو لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔ آپ خود سوچیے بابا جی' یہ صحیح ہے؟ بابا جی' چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ میں نماز کا پابند نہیں ہوں۔ کبھی کبھی نماز پڑھتا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ میرا دل نماز میں لگ جائے۔ بابا جی' میری شکل بھی اتنی بری نہیں ہے' جاذبِ نظر ہوں' لوگ میرے سامنے کہتے ہیں تم خوب صورت ہو لیکن وہ میری باتوں پہ ہنستے ہیں' مجھے برے ناموں سے پکارتے ہیں لیکن کیوں؟ بابا جی' میری یہ بھی بری عادت ہے کہ میں کسی بدصورت کو دیکھ لوں تو اس سے مذاق کرنے لگتا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ ان مسائل سے میری جان چھوٹ جائے۔ اب آپ مجھے آسان سا وظیفہ یا تعویذ دیں تاکہ میرے مسائل جلدی سے حل ہو جائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدارا' میری مدد کریں۔ میری عمر 16 سال ہے۔ ممکن ہو تو ان مسائل کو رسالے میں جگہ دیں۔ اگر نہ ہو سکے تو کوئی بات نہیں لیکن جواب ضرور دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اچھا' اب اجازت دیں' اگر کوئی بات اچھی یا بری لگی ہو تو بتا دیجیے گا کیونکہ ہم آپ اور آپ کے کالم کے بغیر کچھ نہیں۔

☆ بیٹے کاشف! تم نے اپنے مسائل کی وجہ خود ہی لکھ ڈالی ہے۔ جب تم کسی معمولی صورت کے انسان کو دیکھتے ہو تو مذاق کرتے ہو' تمہاری اسی عادت کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے ناراض ہیں اور لوگ تمہارا مذاق بنا رہے ہیں۔ شکل اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ جو کسی کی شکل کا مذاق اڑاتا ہے' دراصل وہ اللہ کی نافرمانی کر رہا ہوتا ہے۔ تم اپنی یہ ایک بری عادت ترک کر دو۔ تمہارے سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں دو بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر 7-7 بار الحمد شریف پڑھا کرو اور اس دوران اپنی آنکھیں اپنے چہرے پر مرکوز رکھو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ خلوصِ دل سے مانگی گئی ہر جائز دعا قبول ہوتی ہے۔ اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگو۔ بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ نجم ترجمے کے ساتھ ضرور پڑھو۔

⊖ عبدالعزیز جی آ۔ چکوال۔

○ قابلِ احترام بابا جی! السلام علیکم! ۱۳ مارچ کو بیٹی حنا عزیز کی شادی اپنے بھانجے سے کی جو کراچی

میں رہتے ہیں۔ بچی بیمار ہوئی تو ظالم ساس جعلی اور لٹیرے عاملوں سے تعویذ' گنڈے لاکر بچی کا اپنے طور پر علاج کرنے لگی۔ جاہل عورت کسی ڈاکٹر' اسپیشلسٹ کے پاس بچی کو نہ لے گئی بلکہ محلے میں ہی ایک عطائی ڈاکٹر سے علاج کراتی رہی۔ بچی سے بخار کی حالت میں گھر کے کام کراتی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی رہی۔ تین ماہ میں میری پھول جیسی بیٹی زندہ لاش بن گئی۔ لڑکا (داماد) اچھا ہے' بیوی کا بہت خیال رکھتا ہے مگر ماں باپ سے دبتا ہے۔ یہ تعویذ بچی کے گلے میں تھا جو میں نے کھول کر دیکھا تو لگا' یہ قرآنی آیات کریمہ تو نہیں پھر یہ کون سی زبان ہے؟ بچی کو میں لے آیا ہوں اور لاہور ہسپتال میں داخل کرادیا ہے۔ پلیز بابا جی! ضرور بتایئے' یہ ہے کیا؟ ادھر تلہ گنگ میں ایک رُوحانی بابا نے بتایا کہ یہ کالا جادو ہے۔

☆عزیزم عزیز! اللہ تمہیں اپنی اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ بچی کو اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لنگ کے علاج کراؤ۔ دوا اور دُعا دونوں بہت ضروری ہیں۔ جہالت کی وجہ سے لوگوں کو عالم اور عامل کا فرق ہی نہیں معلوم۔ بس جہاں سے ملے' تعویذ لے لو' یہ رویہ غلط ہے۔ میں بچی کے لیے دُعا گو ہوں۔ تم حسب استطاعت صدقہ ضرور نکالو۔ سب خیر ہوگی۔ صبح وشام بچی سے کہو' آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے اور بہ کثرت سورۃ الناس اور سورۃ فلق پڑھے۔ مجھے 15 دن بعد مطلع کرو۔

⊖ صدف۔ لاہور۔

o بابا جی! السلام علیکم! پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں لیکن میں بہت مجبور اور بے بس ہوں۔ میں بھی اپنی کہانی آپ تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ بابا جی! میرا نام صدف ہے اور میں لاہور کی رہنے والی ہوں۔ میری بے وقوفیوں کی وجہ سے مجھ پہ بہت قرض چڑھ گیا ہے' میں پڑھی لکھی ہوں۔ میں نے M.B.A. کیا ہے لیکن بابا جی! میں سچ کہہ رہی ہوں' میرے دماغ کو اس وقت پتا نہیں کیا ہوا' میں نے گارمنٹ کا کام شروع کیا تھا جس سے مجھے بہت نقصان ہوا اور میں مقروض ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے بھی بے وقوف بنایا' بہت لوگوں کے پاس گئی لیکن سب نے صرف پیسے لیے اور کام نہ ہوا۔ بہت عاملوں کے پاس بھی گئی۔ کوئی چھ ہزار مانگ رہا ہے' کوئی آٹھ ہزار تو کوئی پندرہ ہزار۔ پیسے کا نقصان ہی نقصان ہوا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ پلیز' آپ کے رسالے کے توسط سے میری مدد کی جائے' میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز بابا جی' رسالے کے توسط سے بہت سے ایسے لوگ جو کہانیوں میں لکھتے ہیں کہ ہم لوگوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں' آج ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ قرض کی بنا پر مجھے سسرال والوں نے نکال دیا ہے۔ میرے دو بچے ہیں' وہ بھی اُن کے پاس ہیں۔ بات طلاق تک پہنچ گئی ہے۔ اگر میری کچھ مدد ہوجائے تو میرا گھر بچ جائے گا۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔

☆صدف بیٹی! یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے' بغیر سوچے سمجھے کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہیے۔ تم پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو اور چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا ورد کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔ تم بھی ہر فجر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگو۔ دُعا مانگتے وقت اگر آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں تو بہت بہتر ہے کہ اللہ جل شانہ کو گریہ بہت پسند ہے۔ میں نے تمہارا مسئلہ بھی شائع کردیا ہے۔ اگر کوئی صاحب حیثیت شخص ''سچی کہانیاں'' سے رابطہ کرے گا تو تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔

⊖ نورین خان' لاہور۔

o بابا جی' السلام علیکم! میں کئی سال سے ''سچی

کہانیاں'' کی قاری ہوں۔ بابا جی! آپ نے بے شمار افراد کے مسائل حل کیے ہیں' میں بھی آج کل ایک مسئلے سے دوچار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ بابا جی! میری عمر پچیس سال ہے۔ میں نے گریجویشن کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرلی تھی۔ ادارے میں صرف دو خواتین ہیں' ایک میں اور دوسری ایک پختہ عمر کی عورت ہیں۔ میں خاصی خوب صورت اور پرکشش ہوں۔ اس میں اپنی تعریف کا پہلو ہرگز نہیں ہے بلکہ واقعی ایسا ہے۔ ادارے کے کئی افراد مجھ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ تین افراد تو بہت زیادہ سیریس ہیں' ان میں ایک کو میں بھی پسند کرتی تھی۔ اچھا' خوش پوش اور خوبرو لڑکا تھا۔ وہ گلبرگ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ ایک بھائی کینیڈا میں تھا اور بہن شادی کے بعد لندن شفٹ ہوگئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے سب کچھ مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ اس کا کوئی بھائی کینیڈا میں تھا نہ بہن لندن میں مقیم تھی۔ میرا دل اس کے جھوٹ پر اس کی طرف سے کھٹا ہوگیا اور مجھے اس لڑکے سے نفرت سی ہوگئی۔ باقی دو لڑکے تو میرے معیار کے تھے ہی نہیں۔ اسی دوران میں میرے آفس کے ایم ڈی مجھ میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ سیدھے' سچے اور کھرے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ ہیں۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اس وقت او لیول کر رہا ہے۔ انہوں نے مجھے شادی کے لیے پروپوز کیا ہے۔ ویسے تو میں انہیں بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ وہ میرے ساتھ بہت مخلص ہیں لیکن ان کی بیوی اور سسرال سے ڈر لگتا ہے۔ وہ لوگ خاصے بارسوخ ہیں اور اس شادی میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ بابا جی! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں؟ دوسری طرف وہ لڑکا بھی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے جس نے خود کو رئیس زادہ ظاہر کیا تھا۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے تمام مسائل حل ہوجائیں۔ زندگی بھر آپ کی ممنون رہوں گی۔

☆نورین بیٹی! تمہاری اس روش سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ تمہارا مسئلہ صرف اور صرف پیسا ہے۔ تم نے لالچ میں آکر اس نوجوان سے محبت کی پینگیں بڑھائیں پھر اس کی طرف سے مایوس ہوکر تم نے اپنی کمپنی کے ادھیڑ عمر ایم ڈی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ یہ رویہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ تم اپنی خودغرضی اور لالچ میں یہ بھی بھول گئیں کہ تمہارے اس اقدام سے ایک دوسری عورت کا گھر اجڑ جائے گا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مسئلہ تمہارا نہیں ہے بلکہ تم تو خود دوسروں کے لیے مسئلہ ہو۔ مجھے تمہاری اس ڈھٹائی پر بھی حیرت ہے کہ تم غلط کام کر رہی ہو اور اس کی تکمیل کے لیے مجھ سے وظیفہ بھی مانگ رہی ہو۔ انسان کو اتنا بھی لالچی اور خودغرض نہیں ہونا چاہیے۔ نورین بیٹی! اللہ سے ڈرو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں نیک ہدایت دے۔ بیٹی! تم پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو اور اٹھتے بیٹھتے استغفار کیا کرو۔ بعد نماز مغرب ایک تسبیح سورۃ قریش کی پڑھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرمانے والا اور انہیں نیک ہدایت دینے والا ہے۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں یہ عمل کرلو۔ انشاء اللہ' تمہیں ذہنی انتشار سے نجات مل جائے گی۔

⊖ شہزاد احمد' گوجرانوالہ۔

☆شہزاد بیٹے! تمہارے خط کی اشاعت تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ فی زمانہ بے شمار نوجوانوں کا ہے۔ غیر ملکی میڈیا کی یلغار بالخصوص انٹرنیٹ نے نوجوانوں کو ذہنی طور پر مریض بنا دیا

ہے۔ان خرافات سے بچنے کا واحد طریقہ پنج وقتہ نماز کی پابندی ہے۔اگر تم واقعی ان فضول کاموں سے بچنا چاہتے ہو تو انتہائی خضوع و خشوع سے نماز کا اہتمام کرو۔ اس کے ساتھ ہی تم صحت مند لٹریچر کا مطالعہ کرو۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرو اور اٹھتے بیٹھتے یَاحییُ یَاقیومُ برحمتک استغیث کا ورد کیا کرو۔یقین جانو' تمہیں کسی بھی قسم کی کوئی بیماری نہیں ہے۔یہ سب تمہارے ذہن کا فتور ہے۔تمہیں کسی حکیم یا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔نوجوانوں کو تباہ کرنے میں جتنا ہاتھ فحش چینلز اور انٹرنیٹ کا ہے' اس سے کہیں زیادہ ان جعلی حکیموں اور سنیاسی باداوں کا ہے جو الٹی سیدھی دوائیں اور جڑی بوٹیاں دے کر نوجوانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔تم چالیس دن میری ہدایات پر عمل کرو' اس کے بعد مجھے خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کرو۔ انشاءاللہ تعالیٰ' تمہاری تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔

⊖ ثمینہ رحمت علی' اوکاڑہ۔

○ بابا جی' السلام علیکم! میں گزشتہ کئی برس سے ''سچی کہانیاں'' پابندی سے پڑھ رہی ہوں اور ''مسئلہ یہ ہے'' بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بابا جی' تین سال قبل بھی اللہ کے کرم اور آپ کی دعاؤں اور تجویز کردہ وظیفے سے میرا ایک مسئلہ حل ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین!) میں اب پھر انتہائی سنگین مسئلے سے دوچار ہوں۔میرے شوہر لاہور کی ایک بہت بڑی فرم میں ملازمت کر رہے تھے اور گھر میں ہر طرح کی خوش حالی تھی۔ تین ماہ پہلے اچانک میرے شوہر کی ملازمت ختم ہو گئی۔آفس کے جی ایم سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔میرا ایک بیٹا فرسٹ ایئر انجینئرنگ میں پڑھ رہا تھا۔گزشتہ مہینے اسے اچانک بہت شدید بخار ہوا' اس کے بعد وہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔مجھے خود بھی اچانک بیٹھے بیٹھے چکر آتے ہیں اور میری حالت بری ہو جاتی ہے۔اس کے بعد میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہلنے جلنے سے معذور رہتی ہوں۔میں پنج وقتہ نماز کی پابند ہوں۔ ہر نماز کے بعد مختلف اوراد اور وظائف کا ورد کرتی ہوں۔رات کو عشاء کے بعد پابندی سے سورۃ یٰسین اور سورۃ کہف کا چالیس بار ورد کرتی ہوں۔صبح فجر کے بعد سے لے کر سورج نکلنے تک میں چالیس بار سورۃ اخلاص کا ورد کرتی ہوں۔ان سب باتوں کے باوجود میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی نے میرے گھر پہ کچھ کرا دیا ہے۔اپنی ایک جاننے والی کے ساتھ میں ایک مشہور عامل کے پاس بھی گئی لیکن پیسے کے زیاں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بابا جی' میں شدید مشکلات میں گھری ہوئی ہوں' شوہر کی بے روزگاری اور بیٹے کی بیماری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بابا جی' آپ کو اللہ کا واسطہ' میرے لیے کچھ کریں۔اللہ کے بعد آپ ہی میرا آخری سہارا ہیں۔ مجھے کوئی وظیفہ بتائیں یا تعویذ دیں کہ ان مشکلات اور پریشانیوں سے چھٹکارہ نصیب ہو۔ ساری زندگی آپ کی ممنون رہوں گی۔

☆ثمینہ بیٹی' تمہارا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ بیٹی' دنیا دکھ اور پریشانیوں کا گھر ہے' یہاں ہر شخص پریشان ہے' کوئی کم پریشان ہے اور کوئی زیادہ۔ دکھ مجھے اس بات کا بھی ہے کہ تم نے جانتے بوجھتے ان پیشہ ور عاملوں پہ رقم لٹائی؟ بیٹی' تم پہ یا تمہارے گھر پہ کسی نے کچھ نہیں کر دیا ہے بلکہ تم نے خود ہی یہ پریشانیاں مول لی ہیں۔اوراد و وظائف کی کثرت بھی پریشانیوں کا باعث ہوتی ہے۔پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم اتنی کثرت سے وظائف کس کی اجازت سے پڑھ رہی ہو اور کیوں پڑھ رہی ہو؟ بیٹی' میں متعدد مرتبہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ وظائف کی کثرت سے بھی نقصان پہنچتا ہے پھر بہت سے وظائف ایسے بھی ہوتے ہیں

جنہیں پڑھنے سے پہلے اجازت ضروری ہوتی ہے۔ میں ''سچی کہانیاں'' میں جو وظائف تجویز کرتا ہوں' ان سے سب استفادہ کر سکتے ہیں لیکن ان میں بھی ایک وقت میں صرف ایک ہی وظیفہ کرنا ہوتا ہے۔ میں تمہارے توسط سے ''سچی کہانیاں'' کے تمام قارئین کو بھی یہ بتا رہا ہوں کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی وظیفہ کیا جائے۔تم سب سے پہلے تو یہ کرو کہ تمام اوراد و وظائف کو ختم کر دو' ایک ہفتے تک صرف پنج وقتہ نماز اول وقت میں ادا کرو اور بعد نمازِ فجر قرآن پاک کی تلاوت کر لیا کرو۔ایک ہفتے بعد فجر کی سنتوں کے بعد اور فرض سے پہلے ایک مرتبہ سورۃ رحمٰن کی تلاوت کر لیا کرو اور بعد نمازِ مغرب ایک مرتبہ سورۃ واقعہ پڑھ لیا کرو۔اٹھتے بیٹھتے ہر وقت حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا ورد کرتی رہو۔کسی بھی عامل یا سیانے کے پاس جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔اکتالیس دن تک یہ عمل کرو۔ اس دوران میں حسبِ استطاعت صدقہ بھی دیتی رہو کہ صدقہ بلاؤں کو ٹالتا ہے۔بیٹے کی بیماری کے سلسلے میں مجھے تفصیلی خط لکھ کر وظیفہ اور تعویذ منگوا لو۔

⊖ راجہ آفتاب احمد' آزاد کشمیر۔

☆ بیٹے راجہ آفتاب احمد' اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنا مکمل ڈاکٹری چیک اپ کراؤ۔ اندر اندر گھٹنے کی کوئی وجہ نہیں۔بعض اوقات ہم جو سوچ رہے ہوتے ہیں' وہ نہیں ہوتا۔اللہ پر بھروسا رکھو اور ہر نماز کے بعد ایک تسبیح سورۃ الناس کی پڑھو۔مدت 3 ماہ ہے۔

⊖ عالیہ' لاہور۔

○ بابا جی' میں بہت بدنصیب عورت ہوں' بچپن میں ماں باپ گزر گئے' کبھی ماموں کے گھر رہی' کبھی چاچاؤں کے گھر۔جیسے تیسے بچپن گزرا۔ 16 سال کی تھی تو بیاہ کر لاہور سے گجرات آ گئی۔شوہر بے انتہا سخت مزاج اور اکھڑ ہے۔شادی کے 7 سال کے بعد اولاد نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کر کے بیٹھ گئے۔ان کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد اللہ نے مجھے بیٹے سے نوازا۔شوہر کا جھکاؤ پھر میری طرف ہو گیا۔اس بات پر دوسری بیوی نے بہت ہنگامے کیے اور آخرکار 4 سال بعد وہ خلع لے کر چلی گئی۔اب میری بدقسمتی دیکھیے کہ جب میرے شوہر کا رویہ مجھ سے اچھا ہوا تو ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ کار کے حادثے میں ختم ہو گئے۔اس وقت تک میرا بیٹا 8 سال کا تھا۔میرے سسرال والوں نے عدت کے دوران ہی مجھ سے میرا بچہ چھین لیا اور عدت پوری ہونے پر مجھے پھر سے ماموں کے گھر بھیج دیا۔اب اس بات کو بھی کئی سال ہو گئے ہیں' میں دن رات اپنی اولاد کے لیے تڑپتی رہتی ہوں۔میرے گھر والوں کے مالی وسائل اتنے نہیں کہ عدالتی کارروائی کر سکیں۔آپ سے التجا ہے کہ کوئی ایسا زود اثر وظیفہ دیں کہ ایک ماں کو اس کی اولاد مل جائے۔میں ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گی۔

☆بیٹی عالیہ' تمہارا خط پڑھ کر مجھے بے تحاشہ دکھ ہوا۔دنیا میں بہت ظالم لوگ ہیں مگر ایسے سفاک بھی ہیں جو ماں سے معصوم بچے کو دور کر دیں۔تم نے اتنے دکھ اٹھائے۔اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے صبر کا پھل ضرور دے گا۔ مجھے اپنا مکمل پتا ارسال کرو تاکہ میں تمہارا لاہور میں موجود اپنی بہت اچھی بیٹی سے رابطہ کرا سکوں۔وہ وکیل ہے' وہ تمہاری ضرور مدد کرے گی۔بیٹی' بے شک تم نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں مگر اولاد کی خاطر زندگی کی آخری سانس تک لڑنا دعا اور دوا دونوں لازمی ہیں۔اللہ تعالیٰ بھی ایسے لوگوں کو نصرت و کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے۔نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ آلِ عمران پڑھو اور اپنے اوپر دم کر لو۔نمازِ عشاء کے بعد 1100 بار یاولیُ کا ورد کرو۔ اول و آخر درود شریف 11 - 11 بار۔ مجھے 14 دن بعد پھر مطلع کرو۔

⊖ طاعت محبوب' راولپنڈی۔

o محترم بزرگ' آپ نے میری والدہ کو مناسب رشتوں کے حصول کے لیے ایک وظیفہ دیا تھا' انہوں نے وظیفہ کیا تو جناب' ایک صاحب نے ہم سے رابطہ کیا ہے۔ بظاہر تو سب اچھا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو بات آگے بڑھائی جائے؟

☆ بیٹی طاعت' مجھے مکمل نام مع والدہ ارسال کرو تاکہ میں استخارہ کرسکوں۔ شادی ایک بہت بڑا فیصلہ ہے۔ بنا استخارہ کیے حامی بھرنا بہت غلط ہے۔ زندگی کے چھوٹے بڑے سب فیصلوں میں اللہ سے مدد لینے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

⊖ محسن رضوی' بحرین۔

o بابا جی! میں اپنی بچیوں کے لیے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے میرے بہت ہی اچھے دوست کی بیگم نے آپ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میری عمر 55 سال ہے۔ دو جوان بچیاں ہیں جن کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ پردیس میں اچھے رشتوں کی بہت کمی ہے۔ دن ماں کی بچیاں ہیں مگر ان کی تربیت میں' میں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کوئی ایسا اسم الٰہی بتا دیں جس کی برکت سے میں اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ میں یہاں ایک آئل ریفائنری میں ہوں لہٰذا وظیفہ فجر اور عشاء کے بعد کا دیجیے۔

☆ عزیز محسن' اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں اور جس گھر میں جاتی ہیں' وہاں خوشیاں ہی خوشیاں لاتی ہیں۔ بچیوں سے کہو کہ وہ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھیں۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْن

پھر دعا کریں۔ تم بہ کثرت یَا کَرِیْمُ کا ورد کیا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ و خیرات ضرور کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

⊖ رفیع خاور' سیالکوٹ۔

o بابا جی' آداب' آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتا ہوں مگر کبھی نہ سوچا تھا کہ خط لکھوں گا۔ پتا نہیں' آپ جواب بھی دیں گے یا نہیں؟ میں مقامی اسکول میں ٹیچر ہوں۔ تنخواہ بہت معمولی ہے۔ گھر کی ذمے داریاں بہت ہیں۔ انہی سوچوں نے مجھے ذہنی طور پر بہت کمزور کردیا ہے۔ بوڑھے والدین' جوان بہنیں اور معذور بھائی' سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ گھر والوں کو چھوڑ کر باہر بھی نہیں جاسکتا۔ آپ کو خط لکھ کر دل ہلکا کرلیا ورنہ تو لوگ یہاں سمجھتے ہیں کہ استاد صاحب سب کو ہر مسئلے کا حل دیتے ہیں' خود پریشان ہو ہی نہیں سکتے۔ بہنیں پڑھی لکھی ہیں مگر نوکری نہیں کرواسکتا۔ لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔

☆ بیٹے رفیع' مجھے تمہارا خط پڑھ کر بہت حیرت ہوئی' تم تعلیم یافتہ انسان ہو کر اتنی جاہلانہ سوچ رکھتے ہو۔ کیا لوگ اس مشکل وقت میں تمہارا ساتھ دے رہے ہیں؟ پھر یہ خوف کیسا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اسلام نے عورتوں کو درس و تدریس کے شعبے میں قدم رکھنے کی اجازت دی ہے پھر تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اوروں کے کام آئے۔ اپنے دل و ذہن کو وسعت دو' بلاوجہ کے خوف مت پالو۔ زندگی کو سہل بناؤ۔ اگر اسلامی قوانین کے تحت چلو گے تو سب ٹھیک رہے گا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

⊖ رابعہ خالد' لاہور۔

o بابا جی' میں آپ کو فرضی نام سے خط لکھ رہی ہوں۔ میرے والدین نے میری شادی اپنی پسند سے میرے چچازاد سے کی۔ میں کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی میں نے اپنے شوہر کو ذہنی طور سے قبول نہیں کیا مگر زندگی گزرتی رہی۔ میں ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میرے شوہر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ سسرال میں عزت ہے۔ مجھے ڈھونڈنے سے بھی ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ اب پچھلے 3 ماہ سے میں عجیب الجھن کا شکار ہوں' جس شخص کو شادی سے پہلے چاہتی تھی' وہ اب پھر میری زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ وہ مجھے شوہر سے طلاق لینے کا کہہ رہا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہتی ہوں اور ویسے بھی یہ حقیقت ہے کہ عورت کبھی اپنا پہلا پیار نہیں بھولتی۔ میں بس آپ سے اتنا چاہتی ہوں کہ عزت کے ساتھ میری جان اپنے سسرال اور شوہر سے چھوٹ جائے.....

☆ بیٹی رابعہ' تمہارے خط کا کچھ حصہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہو کہ دنیا میں کتنے بدنصیب لوگ بھی رہتے ہیں۔ تم سمجھدار خاتون ہو۔ کم عقل کو تو سمجھایا بھی جاسکتا ہے مگر عقل والے کو کچھ بھی کہنا بیکار ہے۔ تم جو کرنا چاہتی ہو' یقیناً اس پر بہت سوچ کر عمل کر رہی ہوگی۔ تمہیں کالم کے ذریعے جواب دینے کا مقصد صرف ایک کہ جو بات تم نے کہی کہ عورت اپنا پہلا پیار نہیں بھولتی' اس کا جواب دیا جائے۔ بیٹی' عورت اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین تحفہ ہے کیونکہ سب سے پہلے وہ ماں ہے پھر بیٹی ہے' بہن ہے' بیوی ہے' ہر رشتے میں وہ صرف عزت اور محبت کی خاطر قربانیاں دیتی نظر آتی ہے۔ عورت کا پہلا پیار وہ گود ہوتی ہے جس میں اس نے آنکھ کھولی ہوتی ہے پھر وہ پیار ہوتا ہے جس نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہوتا ہے یعنی باپ پھر وہ شخص جو اس کو تحفظ دیتا ہے یعنی شوہر اور سب سے بڑھ کر جہاں اس کے پیار کی تکمیل ہوتی ہے' وہ ہے اس کی اولاد۔ تم ہر رشتے کو ٹھوکر مار کر نفس کی خاطر جس راستے پر چل رہی ہو' اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ہر عورت کے سر سے چادر مت اتارو۔ عورت کی محبت کو اپنی منفی سوچ کی وجہ سے غلط پیرائے میں مت بیان کرو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔

⊖ راحت' گوجرانوالہ۔

o محترم بابا جی' السلام علیکم! آج آپ کی بیٹی آپ کی خدمت میں دو مسئلے لے کر حاضر ہوئی ہے اور امید ہے کہ آپ کے مشورے سے اچھا حل نکلے گا۔ بابا جی' یہ ایک دردناک بات ہے جو مجھے بہت دکھ دیتی ہے اور میں ہمیشہ اپنے دکھ آپ سے شیئر کرتی ہوں۔ بابا جی' ہمارے محلے میں ایک عورت رہتی ہے جو گزشتہ 3 سال سے بہت بری بیماری میں مبتلا ہے۔ بابا جان' وہ عورت ہر وقت اپنے جسم کو نوچتی رہتی ہے اور کہتی ہے کہ میرے جسم میں کیڑے پڑے ہیں جو نکالتی ہوں اور اپنے اردگرد بے شمار شاپر زگرہ لگا کر رکھے رہتی اور کہتی ہے کہ میں اپنے جسم سے کیڑے نکال کر ان میں بند کردیتی ہوں تاکہ دوبارہ نہ چمٹ جائیں۔ بابا جی' ان کا حافظہ اور نظر سماعت سب بالکل ٹھیک ہے' ذہن ٹھیک ہے مگر نہ جانے یہ کس گناہ کی سزا ہے کہ تین سال سے وہ سخت سردی میں بھی اپنا جسم نہیں ڈھانپ سکتی نہ کپڑے پہن سکتی ہے۔ ان کی آنکھوں سے ہر وقت آنسو بہتے ہیں۔ محترم بابا جان' میری آپ سے التجا ہے کہ آپ ان کے لیے خاص طور پر دعا کریں اور کوئی ایسا حل بتائیں جس سے یہ مسئلہ حل ہوجائے اور یہ بھی بتائیں کہ جو وظیفہ آپ ماں جی کے لیے بتائیں اور یہ ضرور بتائیں کہ سورۃ بقرہ آیت 41- 90 دن کا وظیفہ ہے۔ معذوری میں جو ناغے ہوں' وہ بعد میں

پڑھ کر نوے دن پورے کرلوں یا یہ ٹھیک رہے گا؟ بابا جان' میری یہ اپیل ہر قاری تک پہنچے اور ہر پڑھنے والا ماں جی کے لیے دعائے خیر کرے اور خدا سب کی دعائیں قبول کرکے ماں جی کو اس اذیت ناک مرض سے نجات دے۔ (آمین!)

☆بیٹی راحت' مذکورہ خاتون سے کہو' بکثرت توبہ استغفار کیا کریں۔ بس اب یہی حل ہے۔ تم بھی ان کے لیے دعا کرو کہ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ بہن سے کہو' اولاد کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالے۔ اللہ ضرور رحم کرے گا۔

⊖ شمیم خان' کراچی۔

o بابا جی' پہلے تو سلام قبول کریں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں ''سچی کہانیاں'' بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور ہر مہینہ صرف آپ کے مسئلہ کے لیے ''سچی کہانیاں'' لیتی ہوں۔ میں غریب لڑکی ہوں' آپ کو روپے نہیں دے سکتی مگر آپ میرے مسئلے کا جواب ضرور دیں۔ میں ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے آپ کے کالم میں پڑھا تھا کہ عصر کی نماز میں سورۃ النباء پڑھ کر چہرہ پر پھیر لیں تو رنگ گورا ہو جائے گا اور دودھ دہی استعمال کریں۔ یہ وظیفہ 90 دن کا تھا۔ میں اس کی اجازت چاہتی ہوں' آپ اجازت دیں۔ میری بہن کے لیے بھی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ میرے بال بہت لمبے اور گھنے ہو جائیں' میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کوئی تیل بنادیں اور یہ بتادیں' سر کس چیز سے دھویا کروں اور وظیفہ تیل کا کب تک کروں؟ وظیفہ کی مدت ضرور بتائیے گا۔ میں بہت پریشان ہوں' میں چاہتی ہوں کہ بال بہت لمبے' گھنے ہو جائیں۔ میری مدد کریں۔

☆بیٹی شمیم' وظیفہ کی اجازت ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایک وقت میں ایک ہی وظیفہ کرو' نماز کی پابندی کے ساتھ۔ کرم ہوگا۔

⊖ صالحہ' مقام نامعلوم۔

o محترم بابا صاحب' السلام علیکم! ہم یہ ''سچی کہانیاں'' ایک طویل عرصے سے پڑھ رہے ہیں۔ بابا صاحب' آپ کو خط لکھنے کی کوششیں کرتے مگر ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے بہت سوچا اور یہ فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کا حل یقیناً آپ کے ہی پاس ہوگا۔ بابا صاحب' آپ اللہ کے نیک بندے ہیں' آپ کے اس نیک کام کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے مسائل حل ہو رہے ہیں۔ اللہ آپ کو اس نیک کام کی توفیق دیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ماموں کی شادی کو 7 سال ہوگئے ہیں لیکن اولاد کی سعادت سے محروم ہیں۔ ہر وقت بہت پریشان ہوتے ہیں اور خود بہت زیادہ کمزور ہیں۔ بابا' آپ استخارہ کریں اور کوئی تعویذ بتائیں جس سے ہم سب کا یہ خواب پورا ہو سکے۔ بابا' ساری زندگی آپ کو دعائیں دیں گے۔ ہمارا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے امتحان بہت قریب ہیں۔ بابا' آپ ہمارے لیے دعا کریں کہ اللہ ہم سب کو پاس کریں اور نیک کام کرنے کی توفیق دے۔ بابا' آپ ہمیں پڑھائی کے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو ہم پڑھائی کے دوران کرسکیں اور پاس ہونے کے لیے ہمیں تعویذ دیں۔

☆بیٹی' اولاد کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ جہاں تک تمہارے مسئلے کا تعلق ہے تو ہر نماز کے بعد یا سمیع کا ورد ضرور کیا کرو۔ ⊖⊖

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انتخاب

زندگی اور موت

کیا یہ حقیقت ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی کشش موت ہے اور یہ زندگی صرف موت کی وجہ سے خوب صورت ہے اور اگر موت نہ ہوتی تو زندگی بھی نہ ہوتی؟ دن اس لیے دن ہوتا ہے کہ اس کے بعد رات ہوتی ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو دن نہ ہوتا۔ جو کچھ بھی ہوتا' وہ ایک وقت ہوتا' ایک زمانہ ہوتا لیکن اُسے دن نہیں کہا جا سکتا تھا جیسے نیکی کا وجود بھی صرف بدی سے ہے۔ اگر بدی نہ ہوتی تو اس کے دوسری جانب نیکی بھی نہ ہوتی' بس اسی طور موت کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں اور اس زندگی میں جتنی بھی رعنائیاں اور خوشیاں ہیں' وہ سب موت کی مرہونِ منت ہیں۔ سیاہ پوش موت جو مجھے ایک عورت کے نہیں' مرد کے روپ میں دکھائی دیتی ہے' میرے ساتھ ساتھ پہاڑوں میں سفر کرتی ہے' میں جب کبھی مرگ صفت پہاڑی نالے کو عبور کرنے لگتا ہوں تو وہ دوسری جانب منتظر ہوتی ہے۔ کسی ایسے مقام سے گزرنے لگتا ہوں جس کے عین نیچے ایک گہری کھائی ہے جس میں بہتے دریا کا شور بھی اوپر تک اتنی بلندی تک نہیں آ سکتا اور راستہ اتنا خطرناک ہے کہ آپ آسانی سے نیچے گر سکتے ہیں تو وہاں موت سیاہ پوش خاموش کھڑی ہے اور میں نہیں جانتا کہ میں اس مقام سے بچ نکلوں گا یا کہ نہیں؟ یہ موت مجھے لے جائے گی وہاں پامیر کے پہاڑوں میں ایک جھیل ہے کرومیر' میں اس کے سرسبز اور پھولوں میں اَٹے وسیع کناروں پہ چلا جا رہا ہوں تو موت وہاں بھی موجود ہے۔ میں اُس سے پوچھتا ہوں کہ دیکھو یہاں تو کوئی بلند اور خطرناک مقام نہیں ہے۔ اوپر کی چٹانوں سے پتھر نہیں آ رہے' میں کسی تند و تیز نالے کو پار نہیں کر رہا' ایک ہموار علاقہ ہے اور یہاں تو موت کا کوئی امکان نہیں اور اس کے باوجود تم یہاں بھی کھڑی ہو اور مجھے دکھائی دے رہی ہو تو کیوں آئی ہو؟ اس پہ موت کہتی ہے کہ میں تمہارے لیے بس منظر کو خوب صورت اور سحر انگیز بنانے آئی ہوں اس لیے کہ دنیا کے سارے منظر میری وجہ سے خوب صورت ہیں۔ یہ صرف انسان کے اندر فنا کا ہی احساس ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا اور آج یہ منظر تجھے خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی تصنیف "کاروں سرائے" سے اقتباس۔

انتخاب: کامران عباسی' حیدر آباد۔

دل کی کسوٹی

کھرا سونا اور کھوٹا سونا بغیر کسوٹی پر پرکھے قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ خدا جس کے دل میں کسوٹی رکھ دیتا ہے' بلاشبہ وہ یقین کو شک سے جدا کر لیتا ہے اور وہ جو حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ "اپنے دل سے فتویٰ پوچھ۔" اُس کو وہی جانتا ہے جو وفاداری سے پُر ہے۔ زندہ کے منہ میں اگر ایک تنکا آ جائے تو اُس کو چین اُسی وقت آئے گا جب وہ اُسے نکال لے گا۔ دنیا کا احساس اس

جہان کی سیڑھی ہے اور آخرت کا احساس آسمان کی سیڑھی۔

دنیاوی جس کی تندرستی طبیب سے معلوم کرو اور آخرت کی جس کی تندرستی محبوب سے معلوم کرو۔ اس جس کی تندرستی بدن کی تندرستی سے ہے اور اُس جس کی تندرستی بدن کی شکستگی سے ہے۔ رُوح کا بادشاہ جسم کو ویران کرتا ہے اور اُس کی ویرانی کے بعد اُسے آباد کرتا ہے۔ بڑی مبارک ہے وہ جان جس نے عاقبت کی فکر کی۔ اپنا گھر بار اور ملک و مال خرچ کر ڈالا۔ رُوحانی کیفیات کو حاصل کرنے کے لیے اپنے جسم کو لاغر کیا۔ سونے کے خزانے کے لیے پہلے گھر کو ویران کیا اور پھر اُس کو رُوح سے آباد کیا۔ جسم کو شیطان کے قبضے سے نکالنے کے لیے ویران کرنا پڑتا ہے۔ (مجاہدات سے) اور پھر رُوح کے ذریعے آباد کیا جاتا ہے۔ اُس یکتا کے کلام کی کیفیت کون بیان کرے؟ کبھی یوں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس۔ دین کا کام حیرت کے بغیر نہیں ہے۔ وہ لوگ جو حقیقت کے راز سے واقف ہیں' بے خود' حیراں اور مست و سرگرداں ہیں۔ نہ ایسے حیران کہ اُن کی پشت اس کی طرف ہو جائے بلکہ ایسے حیران کہ چہرہ اس کے سامنے رہے۔ حیرانی دو قسم کی ہے' ایک وہ جو شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے اور دوسری وہ جو محویت پیدا کرتی ہے۔ حیرانی محویت بھی دو طرح کی ہے' ایک حالت میں طالب و مطلوب کا امتیاز کیا جا سکتا ہے اور دوسری حالت میں امتیاز نہیں رہتا۔ ایک ہی ذات کارفرما ہوتی ہے۔ ہر ایک حیرت زدہ کے رُخ کو دیکھ اور ادب کر' ہو سکتا ہے تُو خدمت کرنے سے صاحبِ معرفت ہو جائے۔

"مثنوئ مولانا رُوم" سے اقتباس۔

انتخاب: سید فرحان احمد' کراچی۔

جذبہ

غم اور مسرت دونوں جذبے ذاتی ہیں۔ ہر شخص مختلف چیزوں میں خوشی ڈھونڈتا ہے۔ اپنا اپنا ظرف ہے۔ جیسے جنت و جہنم کا تخیل' ایک بچے کے لیے بہشت کا تخیل کچھ ہوگا اور بوڑھے کے لیے کچھ۔ دہقان کا نظریہ جہنم' فلسفی کے نظریے سے مختلف ہوگا اور پھر دل کی گہرائیوں کو کون پہنچ سکتا ہے؟ مکمل قبضہ ہو جانے پر بھی زندگی کا ایک حصہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں کسی کا دخل نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔

شفیق الرحمان کی تصنیف "پچھتاوے" سے اقتباس۔

انتخاب: غلام حیدر' بلتستان۔

ملین ڈالر

نیویارک شہر کو بناتے ہوئے ہر ممکن تدبیر سے کام لیا گیا کہ مینزہ کو پاؤں پھیلانے کی جگہ' درخت کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ کئی مربع میل کے جس قطعے پر شہر واقع ہے' پہلے اُس پر کنکریٹ کا فرش بچھایا گیا اور جب وہ خشک ہوا تو اُس پر تارکول کا لیپ کر دیا۔ سبزہ اب پاؤں رکھے تو کہاں رکھے؟ پھر شہر کے نیچے اَن گنت چھوٹی بڑی نالیاں کھود ڈالیں۔ کچھ تازہ پانی کی شریانیں' کچھ نکاسی کی وریدیں' جو نالیاں ذرا بڑی بن گئیں' اُن میں زمین دوز ریلیں دوڑا دیں۔ ایسی کھوکھلی کوکھ میں جو درخت جڑ پکڑے تو کیونکر پکڑے؟ درخت دشمنی میں اسی پر اکتفا نہیں بلکہ لوہے اور شیشے کے بہ فلک ڈھانچے پہلو بہ پہلو بنا دیے تاکہ زمین سے ساٹھ ستر منزل بلند سطح پر رہنے والے کو کھڑکی سے اگر بفرضِ محال درخت نظر آ بھی جائے تو وہ قابلِ توجہ نظر نہ آئے۔ شہر بسانے والے بڑے دور اندیش تھے' وہ چاہتے تھے کہ اس شہر کے لوگوں کی پوری توجہ اور ساری توانائیاں دولت پیدا کرنے میں صرف ہوں اور کوئی چیز بھی اس مقصد کی راہ میں حائل نہ ہو۔ مینزہ اور درخت کے بارے میں یہ خدشہ تھا کہ اگر انہیں پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو لوگ کام کاج چھوڑ کر صرف غزلیں کہنے پر کمر باندھ لیں گے۔ اس پس منظر میں جب نیویارک عالمی میلہ کے میدان میں ایک قد آور گھنے چھتنار درخت کے گرد تماشائیوں کا ہجوم دیکھا تو مسافر کو تعجب نہ ہوا۔ یہ عجیب درخت ہے' نہ ہریالی نہ چھاؤں' نہ وہ سبز پتے جنہیں "ہر ورقے دفتر معنی کردگار" کہیں اور نہ ٹھنڈی چھاؤں جس کے نیچے بیٹھ کر غریب الوطنی کی دھوپ سے پناہ لیں۔ نہ کیلی فورنیا کے مہاگنی کے اس چوڑے درخت کی طرح ہے جس کے تنکے میں سے سڑک آر پار نکل جاتی ہے اور نہ کینیا کے ان قد آور درختوں میں سے ہے جن کی شاخوں پر آشیانوں کی طرح شکاری سیاحوں کے لیے ہوٹل کے رہائشی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ تو اصلی درخت لگتا ہی نہیں گویا اس کا تنا زمین سے اگنے کی بجائے اس میں گاڑا گیا ہے۔ شاخیں

پھوٹنے کی بجائے جوڑی گئی ہیں۔ پتے نکلنے کی بجائے ٹانکے گئے ہیں اور یہ بات سچ ہے۔ اسے کارگاہ میں نقشے کی مدد سے تیار کیا گیا اور پیش ساختہ ٹکڑوں کو یہاں نمائش میں لا کر باہم جوڑ دیا۔ اس میں عام درختوں کا حسن بے پرواہ نہیں۔ اس کی شکل اقلیدس ہے۔ یہ سراسر مصنوعی لگتا ہے۔ اس کے باوجود یہاں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ ایک خلقت ہے کہ اس درخت کو دیکھنے کے لیے اُمڈی آ رہی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ للچائی نظروں سے دیکھتی ہے۔ حیرت اور حسرت سے دیکھتی ہے۔ منہ سے بے اختیار ہائے اور کاش کے ہم معنی انگریزی الفاظ یا لغات میں نہ ملنے والی امریکی آوازیں نکل جاتی ہیں۔ بعض تماشائیوں کی آنکھوں میں اتنا تقدس ہے جیسے زیارت کے لیے آئے ہوں۔ یہ درخت عالمی میلے میں ایک مشہور مالی ادارے کی طرف سے نصب کیا گیا ہے۔ یہ دولت کا درخت ہے اس پر پتوں کی جگہ کرنسی نوٹ لگے ہوئے ہیں جن کی مالیت ایک کروڑ روپے کے برابر ہے۔ اس کا نام ملین ڈالر درخت ہے۔

مختار مسعود کی تصنیف "سفر نصیب" سے اقتباس۔

انتخاب: نرگس جمال، کراچی۔

سرپرائز

ایک خوش نُما کنگری ایک دِن لاہور میں نازل ہوئی۔ مجلس میں دوستوں کے علاوہ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکیوں میں ایک الہڑ سی ماڈرن سی شے تھی جو زبان کی گرم تھی لیکن قابلیت کی معتدل۔ ہمیں گوشت پوست میں دیکھ کر ایک حیرت کے عالم میں کہنے لگی۔

"ہائے اللہ......! آپ زندہ ہیں؟ میں تو سمجھی تھی کہ آپ پچھلی صدی میں گزرے ہیں۔ پلیز، میری بک میں آٹوگراف دے دیجیے اور آج کی تاریخ بھی لکھ دیں اور پلیز، ہمارے گھر آئیں ناں...... میں آپ کو اپنی ممی سے ملانا چاہتی ہوں۔ اوئی...... کتنی بڑی سرپرائز ہو گی ممی کے لیے......"

اگر ہم سچ مچ اپنی دعوت دہندہ کے ساتھ چل پڑتے تو اس کی زندہ ممی کے لیے کچھ اسی قسم کی سرپرائز کا باعث بنتے جیسے مصر کی مُردہ ممی ان کے ہاں دستک آ دیتی۔ چنانچہ آٹوگراف بک میں تو میں نے بہ خوشی اپنا نام لکھ دیا مگر ان کی ممی کے حضور جانے سے پرہیز کیا کہ کہیں محترمہ مجھے میرا بھوت سمجھ کر غش میں نہ ڈوب جائیں اور ہماری الہڑ میزبانہ کو ڈاکٹر یا پولیس یا دونوں نہ بلانے پڑیں۔

کرنل محمد خان کی تصنیف "بجنگ آمد" سے اقتباس۔

انتخاب: شوکت حسین، حیدر آباد۔

حُسنِ ظن

الحمدُ للہ! مجھے فخر ہے کہ میں عورت ذات کے متعلق کسی بھی قسم کے تحقیر آمیز نظریات نہیں رکھتا۔ اس نے مجھے زندگی دی ہے لہٰذا میں اس سے زندہ رہنے کا حق نہیں چھین سکتا۔ وہ میرا لباس ہے لہٰذا میں اسے تنگ انسانیت ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ اس نے میری نجاستیں دھو کر مجھے پاک صاف رکھا لہٰذا میں اسے نجس مخلوق قرار نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھے انگلی پکڑ کر زمین پر چلنے کا طریقہ سکھایا لہٰذا میں اس کے پاؤں سے زمین نہیں کھینچ سکتا۔ اس نے میری تربیت کر کے مجھے انسان بنایا لہٰذا میں اسے ناقص العقل نہیں کہہ سکتا۔ اس کا ودیعت کردہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے لہٰذا میں اسے شیطان کا دروازہ یا لغزش کا محل نہیں کہہ سکتا۔ اس نے مجھے گھر کی پُرآسائش و پُرسکون زندگی عطا کی ہے لہٰذا میں اسے فتنہ و فساد کی جڑ قرار نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھے کامل بنایا لہٰذا میں اسے ناقص نہیں کہہ سکتا۔ اس نے مجھے انسان بنایا لہٰذا میں اسے آدھا انسان قرار نہیں دے سکتا۔ اس نے اپنی زندگی کے ہر سانس کے ساتھ مجھے اپنی دُعاؤں سے نوازا ہے لہٰذا میں اسے حقارت آمیز گالیاں نہیں دے سکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میری اپنی ہی ذات کی تحقیر تذلیل اور نفی ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں عورت ذات کے متعلق ہر طرح کا حُسنِ ظن رکھتا ہوں۔

غلام اکبر کی تصنیف "عورت کا مقدمہ" سے اقتباس۔

انتخاب: امتیاز علی، لاہور۔

محبوبِ حقیقی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے عقیدے اور شاعری میں جگہ جگہ محبوبِ حقیقی کی اطاعت کی تلقین کی ہے۔ آپؒ نے اللہ تعالیٰ سے اپنا سچا عشق ہمیشہ قائم رکھا۔ اللہ کی قُربت آپؒ کی منزل تھی۔ آپؒ نے اس منزل کی رَسائی کے لیے حضور نبی کریمؐ کی ذاتِ اُولیٰ صفات کو ذریعہ بنایا۔ آپؒ کے نزدیک اللہ کی رَضا حاصل کرنے کے صرف دو ہی ذریعے ہیں، ایک اسلامی لائحۂ عمل جس کے تحت کلامِ حکیم انتہائی خُلوص، فہم اور مَن حیث الجوع پڑھا اور سمجھا جائے اور پھر احکامُ اللہ کی تعمیل کی جائے اور دوسرا ذریعہ سرورِ کائنات فخرِ موجودات کی حُرمت و اطاعت کا ہے۔ اِن دونوں ذرائع کا نام ہی وحدت الوجود ہے۔ توحید کو قرآن کی بنیادی تعلیم قرار دیتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ "دنیا میں اضطراب و بے چینی کا صرف ایک علاج توحید کے عقیدے کی استقامت ہے اور اللہ کی ذات پر بھروسہ دلوں کی تسکین کا باعث ہے۔"

آپؒ کا تصوّف زندگی آموز ہونے کے ساتھ زندگی آمیز بھی ہے۔ آپؒ اللہ کے خود بھی سچے عاشق تھے اور آپؒ کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ سب لوگ بھی اللہ کو صحیح طور پر اور بخوبی پہچان لیں تا کہ بے راہ روی اور گمراہی اُن کے قریب سے بھی نہ گزرے۔ آپؒ کا خیال ہے کہ قرآنِ مجید کی تعلیمات ہی ہموار اور کشادہ راہ پر سفر کرنے کے لیے حقیقی جذبہ پیدا کرتی ہیں اور یہ جذبہ جب کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو پھر وہ اپنی منزل سے کبھی نہیں بھٹکتا۔

شاہ صاحبؒ کا ایمان ہے کہ اگر کوئی شخص عشق کو اپنا راہ نُما اور ضابطۂ اخلاق بنا لے تو وہ کامیاب و کامران ہو جاتا ہے۔ آپؒ کا اپنے دور کے مسلمانوں پر بڑا احسان ہے۔ آپؒ نے اللہ رسولؐ اور کتاب کا بیک وقت دَرس دیا۔ اِس دَرس کی بدولت یہ ساری قومیں جو لسانی اعتبار سے جدا جدا ہیں، نظریۂ اسلامی کی روشنی میں ایک اُمّت کہلاتی ہیں۔ آپؒ کا کلام پڑھنے کے بعد فکر و تجسس کی راہیں از خود واضح ہو جاتی ہیں۔ آپؒ عربی زبان کی شاعرانہ لذت سے بھی آشنا تھے۔ فارسی زبان کا فہم اور اِدراک بھی رکھتے تھے۔

آپؒ کو دین سے اتنی محبت تھی کہ آپؒ نے اِس کو اُخوت کا سرچشمہ سمجھا اور سب کو اتحاد و یگانگت کا دَرس دیا۔ آپؒ کا نظریہ فقط ایک تھا اور وہ انسان دوستی سے عبارت نظریہ تھا جس میں پاکیزگی بھی تھی اور دردمندی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر حشمت جاہ کی تصنیف "سندھ کے اولیائے کرامؒ" سے اقتباس۔

انتخاب: انعام الٰہی، کراچی۔

آشنائیاں

اپنے اخبارات میں ہم روز یہ خبر پڑھتے کہ فلاں لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تو تسلی ہوتی، چلو آشنا کے ساتھ ہی گئی ہے، کسی اجنبی کے ساتھ تو نہیں گئی۔ وہاں ہمیں ایک سفری کتاب ملی۔ دوست نے بتایا۔ "یہ میرے دادا سے سفر کرتی مجھ تک پہنچی ہے اسی لیے وہ اس کی دادی کی طرح لگ رہی تھی۔" اس کتاب میں لکھا تھا۔ "اگر آپ کسی کو بیوٹی فل بنانا چاہتے ہیں تو اس سے آشنائی کریں۔" "لو" سب سے اچھا بیوٹی شن ہے۔" تب سے ہمارا دل ہر کسی کو خوب صورت بنانے کو چاہنے لگا۔ سولن ولسن کہتا ہے۔ "خوب صورت عورت وہ ہے جو مجھ سے محبت کرتی ہے۔" روسیوں کے نزدیک عورت اور واڈکا میں یہ فرق ہے کہ ان میں سے ایک بوتل میں ہوتی ہے لیکن وہ محبوبہ کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے وہ اسے بوتل سے نکال رہے ہیں۔ کہتے ہیں، محبت اندھی ہوتی ہے، شکر ہے ورنہ تو وہ بہت کچھ دیکھ لیتی۔ آزادی کے بعد وہاں یہ تبدیلی آئی ہے کہ ایک بچہ کہہ رہا تھا۔ "ہمارے گھر میں اب ہر کسی کے لیے الگ کمرہ ہے ایک میرے بھائی کے لیے ایک بہن کے لیے لیکن امی بے چاری کو اب بھی ابا کے کمرے میں ہی سونا پڑتا ہے۔" میڈم نے ہمیں بتایا کہ میری خاوند سے نہیں بنتی پھر بھی میں اس سے چار لڑکیوں جتنی محبت کرتی ہوں۔ جس نے میڈم کو دیکھا ہے وہ اس بات پر یقین بھی کرتا ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو اپنے سائے میں رکھنا چاہتی ہوں تو ہم نے کہا تھا۔ "میڈم آپ کا سایہ اتنا ہے کہ اس میں آپ پورے محلے کو رکھ سکتی ہیں۔" وہ کہتی، پتا نہیں، میں نے کون سی غلطی نہیں کی کہ میرا خاوند مجھے ملنا ہی نہیں چاہتا۔" ویسے عقل مند عورت وہ ہوتی ہے جو ان باتوں کا کوئی نوٹس نہ لے جو بستر پر کہی جاتی ہیں۔ محبت جذبات کا وہ سمندر ہے جسے چاروں طرف اخراجات نے گھیر رکھا ہے۔ کمیونزم میں روٹی، کپڑا اور مکان ملتا ہے حالانکہ بندے کو روٹی کے بعد محبت چاہیے۔ محبت کے بعد وہ کپڑے ڈھونڈتا ہے یوں نعرہ روٹی، محبت، کپڑے اور گھر ہوتا تو ابھی تک کمیونزم نے گھر کیا ہوتا۔ دنیا میں تمام لوگ لورز سے محبت کرتے

ہیں سوائے ان کے جو فون کرنے کے لیے آپ کی کال ختم ہونے کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس سفری بیگ میں ایک نصیحت تھی جو یہ ہے کہ کبھی کسی لڑکی کو یہ نہ کہو کہ تم خوب صورت ہو' کہو کوئی دوسری عورت تم جیسی نہیں' وہ خوش ہو جائے گی اور تم جھوٹ بولنے سے بچ جاؤ گے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی تصنیف "خندہ پیش آنیاں" سے اقتباس۔

انتخاب: ایاز فاروقی' حیدر آباد۔

بارہواں کھلاڑی

انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی حالت بھی کرکٹ کے بارہویں کھلاڑی جیسی ہو جاتی ہے کہ اہم ہونے کے باوجود غیر ضروری ہوتا ہے' فاضل پرزہ۔ اولاد جوان ہو چکی ہوتی ہے' اپنے فیصلے کرنے کی مالک و مختار' کبھی کبھار پری کے لیے بارہویں کھلاڑی کی رائے بھی پوچھ لی جاتی ہے کہ اتمام حجت ہو سکے۔ ادھر بیوی بھی بغاوت کر دیتی ہے۔ ساری عمر اپنے میاں کی بات ماننے والی بیوی کو بھی موقع مل جاتا ہے۔ جب تک مرد جوان ہوتا ہے' بیوی کو خاطر میں نہیں لاتا' بات بے بات اسے جھڑکتا رہتا ہے' اپنی من مانی کرتا رہتا ہے' اسے یہ غرور ہوتا ہے کہ وہ کما کر لاتا ہے۔ اگر بیوی اس کی نہیں سنے گی تو اسے نوراً میکے بھیج دے گا' اسے تین حرف کہہ کر ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ بنا دے گا اور اگر زیادہ جوش آیا تو ایک سوتن لا کر اس بے چاری کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے بٹھا دے گا۔ عورت یہ سب اس لیے برداشت کرتی رہتی ہے کہ اول تو فطرت نے اس کے خمیر میں صبر کا مادہ زیادہ رکھا ہے' کچھ مشرقی روایات کا پاس کہ میاں سو جوتے مارے' تب بھی سہاگن وہی کہلاتی ہے جو پیا من بھائے۔ ادھر کم بخت پیا کا من سو جوتے مارنے کے بعد ہی پیار پر آمادہ ہوتا ہے لیکن کیا کرے' مجبور ہوتی ہے' آخر اس کا صبر رنگ لاتا ہے اور اس کی اولاد جوان ہو جاتی ہے اور سو جوتے مارنے والا پیا خود پھٹے پرانے جوتے میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ اولاد کے جوان ہوتے ہی بیوی ایک دم بکری سے شیرنی بن جاتی ہے۔ اب اسے اس نک چڑھے شوہر کے نخروں پر نہیں پلنا ہوتا۔ کماؤ پوت اسے روٹی' کپڑا اور مکان دینے لگتے ہیں۔ باپ کے گھر سے میاں کے گھر تک کا سفر آگے بڑھتا ہے اور عورت اولاد کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ شوہر کی فرمائش کو چونچلا پن اور اس کے غصے کو ٹھٹھا جانا کہنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال ہاشمی کی تصنیف "مجبوریاں" سے اقتباس۔

انتخاب: زینب عباس' کراچی۔

رشتے

انسان سوچتا ہے' دنیا میں جینے کے لیے اسے رشتے ناتوں کا سہارا چاہیے' اس کے بغیر وہ اپنی بقاء کی جنگ نہیں لڑ سکتا مگر وہ نہیں جانتا' کبھی کبھی یہ رشتے کیسے اپنا عادی بنا کر اپنے سہارے کی بے ساکھی چھین کر منہ کے بل گرا دیتے ہیں۔ رشتے جلتی ہوئی لکڑی کی طرح ہوتے ہیں۔ دور ہوں تو سلگ سلگ کر دھواں دیتے ہیں' قریب ہوں تو لو دے کر جل اٹھتے ہیں۔ اپنے ہونے کے خراج میں زندگیاں بھینٹ لے لیتے ہیں اور کبھی آسودہ نہیں ہوتے۔

سعدیہ عزیز آفریدی کی تصنیف "ایک چراغ روشن ہے" سے اقتباس۔

انتخاب: اجمل عطاری' اسلام آباد۔

انمول خزانہ

تجربے کے موتی

☆ جو دشمن سے بے پرواہ ہو جاتا ہے' وہ انجام کار رنج و تکلیف اٹھاتا ہے۔

☆ دشمن کی چاپلوسی اور خوشامد سے ہوشیار رہ۔

☆ تمہارا دشمن اگر مچھر سے بھی چھوٹا ہو تو اسے ہاتھی سے بھی بڑا سمجھو۔

☆ اپنے نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں۔

☆ جس نے اپنے دشمن کو پہچان لیا' گویا اس نے آدھی فتح حاصل کر لی۔

☆ دشمن کے حسن سلوک پر بھروسہ نہ کر کیونکہ پانی سے آگ کو کتنا ہی گرم کیا جائے' پھر بھی وہ اسے بجھانے کو کافی ہے۔

☆ دشمن کے لیے انگیٹھی زیادہ گرم نہ کر مبادا تمہیں اس میں جلنا (نہ) پڑ جائے۔

☆ دشمن کو اسلحے سے زیر کرنے کی بجائے اخلاق اور احسان سے گرویدہ بناؤ۔

مراسلہ نگار: معین الدین' ڈی آئی خان۔

یاد رکھنے والی باتیں

☆ دوسروں کا احتساب کرنا بہت آسان ہے اور

اپنی ذات کا ایمان داری سے حساب کرنا ہی کٹھن ہے۔

☆ محبت پانا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں' لیکن محبت پھیلانا ہر کسی کے لیے ممکن ہے۔

☆ زندگی کو سمجھنے والے اس سے بے زار رہتے ہیں جبکہ نہ سمجھنے والے خوش و خرم۔

☆ دل ایک مختتی ہے' جس پر ایک وقت میں صرف ایک مضمون ہی لکھا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا مضمون لکھنے کے لیے پہلے مضمون کو دھونا پڑتا ہے اور بعض روشنائیاں اَن مٹ ہوتی ہیں جن سے لکھی ہوئی تحریروں کو سات سمندروں کا پانی بھی نہیں مٹا سکتا۔

☆ کون کہتا ہے کہ پہلی محبت کا رنگ پکا اور اَن مٹ ہوتا ہے۔ اگر ایک بار آگہی کی بارش برس جائے تو ناپختہ دل سے محبت خود بخود دھل جاتی ہے جیسے کوئی کسان نئی فصل بونے سے پہلے زمین پر اُگی جڑی بوٹیاں تلف کر کے اسے صاف شفاف کر کے ہل چلاتا ہے تاکہ نئی اور تازہ فصل کاشت ہو سکے۔

☆ الفاظ جتنے بھی متاثر کن استعمال کریں' مخاطب پر اس کا اثر تب ہی ہوگا اگر ان میں خلوص اور سچائی ہوگی۔

مراسلہ نگار: سلیمہ خان' پشاور۔

پہلا پہلا

☆ اُردو کا سب سے پہلا شاعر امیر خسرو' دہلی۔

☆ اُردو کا سب سے پہلا استاد شاعر سلطان علی شاہ۔

☆ اُردو کا پہلا صاحب دیوان محمد علی قطب شاہ۔

☆ اُردو کی صاحب دیوان شاعرہ بائی حسینہ۔

☆ اُردو کا پہلا ادیب میر امن دہلوی۔

☆ اُردو کا پہلا افسانہ نگار رتن ناتھ سرشار۔

☆ اُردو کا پہلا مرثیہ نگار نمیر یار محمد مشرف۔

☆ اُردو کا پہلا ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد دہلوی۔

☆ اُردو کا پہلا اخبار "جہاں نما" کلکتہ۔

☆ اُردو کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ' حیدر آباد۔

☆ اُردو کی ابتداء چھٹی ہجری سے۔

مراسلہ نگار: محمد علی' حیدر آباد۔

سنہری باتیں

☆ جو اپنے لیے اُصول نہیں بناتے' انہیں دوسروں کے بنائے ہوئے اُصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔

☆ کامیاب انسان ماضی کی ناکامیاں یاد رکھتے ہیں۔

☆ لوگ اپنے فیصلوں کی وجہ سے ترقی کرتے ہیں۔

☆ اپنی قابلیت پر رشک کرنے والا اپنی قوتوں کو کم کرتا ہے۔

☆ شخصیت کی تعمیر خیالات کرتے ہیں۔

☆ دوسروں کے نگران ہونے سے بہتر ہے کہ اپنی نگرانی کی جائے۔

☆ عظیم اور معمولی آدمی میں جو فرق ہے' وہ صرف عزم اور ارادے کا ہے۔

☆ لوگ اتنا ہرگز نہیں جانتے جتنا دعویٰ کرتے ہیں۔

☆ جدوجہد چیزوں کی قیمت بڑھاتی ہے۔

☆ جو چیزیں پراسرار ہوتی ہیں' وہ پرکشش بھی ہوتی ہیں۔

☆ نرم الفاظ کی لاگت معمولی مگر قدر و قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

☆ جس نے غم برداشت نہ کیے' وہ خوشی کا مزہ کیا جانے۔

☆ ہر مشکل کا توڑ آپ کے دماغ کے اندر ہے۔

☆ جو لوگ آپ سے زیادہ ذہین ہیں' ان سے جلنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ ان سے زیادہ محنتی بن سکتے ہیں۔

مراسلہ نگار: شرمئی خان' کوئٹہ۔

اچھی اور سچی باتیں

☆ اچھے دوست کی پہچان مصیبت کے وقت ہوتی ہے۔

☆ محبت' نفرت کو محبت میں بدل سکتی ہے لیکن نفرت' محبت کو نفرت میں نہیں بدل سکتی۔ اگرچہ وہ سچی ہو تو۔

☆ مذاق ایسا کرو کہ رونے والے ہنس پڑیں تاکہ ہنسنے والے بھی رو پڑیں۔

☆ کسی کو زیر کرنے کے لیے خود کو زیر ہونا پڑتا ہے۔

☆ انسان وہ ہی اچھا ہوتا ہے جو خود دکھ برداشت

کر کے بھی اوروں کو خوشیاں دے۔
☆ کسی کا گریبان پکڑنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔

مراسلہ نگار: ثمینہ ماجد' کراچی۔

ہری مرچیں

○ ماں آسمان سے زمین پر لاتی ہے۔
■ بیوی زمین سے زیرِ زمین پہنچاتی ہے۔
○ ماں خون پسینے سے پرورش کرتی ہے۔
■ بیوی ایک انگلی پر نچا نچا کر ذلیل کرتی ہے۔
○ ماں اولاد کے لیے ہر تکلیف اٹھاتی ہے۔
■ بیوی' شوہر سے ہر مشقت کرواتی ہے۔
○ ماں اولاد سے کچھ نہیں مانگتی۔
■ بیوی روزانہ نت نئی فرمائشیں کرتی ہے۔
○ ماں دُعائیں دیتی ہے۔
■ بیوی طعنے دیتی ہے۔
○ ماں اپنے ہاتھ سے ناشتا پکاتی ہے۔
■ بیوی بازار سے ناشتا منگواتی ہے۔
○ ماں مال وزر کا مطالبہ نہیں کرتی۔
■ بیوی پوری تنخواہ وصول کرتی ہے۔
○ ماں گھر چلاتی ہے۔
■ بیوی صرف زبان چلاتی ہے۔
○ ماں گھر پر کھانا تیار کرتی ہے۔
■ بیوی ہوٹل یا فوڈ اسٹریٹ میں کھانا پسند کرتی ہے۔

خلاصہ: جو ماں باپ کی خدمت نہیں کرتا' وہ ساری زندگی بیوی اور افسرانِ بالا کی خدمت کرتا ہے۔

مراسلہ نگار: نور گھلو' حیدر آباد۔

زندگی کے رنگ

◘ سورج اور چاند نے کہا۔ ''زندگی روشنی ہے جو اندھیروں کو نگل لیتی ہے۔''
◘ ہوا نے کہا۔ ''تیز ہوا میں جم کر کھڑے رہنا زندگی ہے۔''
◘ گلاب نے کہا۔ ''زندگی ہار اور جیت کا نام ہے۔''
◘ سمندر نے کہا۔ ''زندگی جوش ہے' جذبہ ہے۔''
◘ کھلاڑی نے کہا۔ ''زندگی ہار اور جیت کا نام ہے۔''
◘ فوجی نے کہا۔ ''زندگی صرف جیت کا نام ہے۔''
◘ پرندے نے کہا۔ ''زندگی آزادی کا نام ہے۔''
◘ مجاہد نے کہا۔ ''زندگی وطن کی امانت ہے۔''
◘ شاعر نے کہا۔ ''زندگی شاعری ہے۔''
◘ رب تعالیٰ نے کہا۔ ''زندگی امتحان ہے تاکہ تمہیں آزمایا جائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرتا ہے۔''

مراسلہ نگار: آصف زیدی' کراچی۔

انمول موتی

♦ تعلیم دو قسم کی ہوتی ہے' ایک ہمیں کمانا اور دوسری زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ (ایڈیز)
♦ بزدل انسان موت آنے سے پہلے ہی کئی بار مر چکا ہوتا ہے' لیکن بہادر آدمی صرف ایک ہی بار مرتا ہے۔ (شیکسپیئر)
♦ دوست کو اپنے حال سے اتنا ہی واقف کرو کہ اگر دشمن ہو جائے تو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے۔ (ہربرٹ اسپنسر)

مراسلہ نگار: محمد عثمان۔ کراچی۔

☺ ذرا مسکرائیے

مدد

☺ ایک دن ایک امیر اپنے گھر کے لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ گھنٹی بجی اور اس کا نوکر ایک غریب سے شخص کو اس کے پاس لایا اور خود اپنے کام سے اندر چلا گیا۔ اس غریب نے امیر آدمی کے سامنے اپنے ایسے حالات بیان کیے کہ وہ امیر آدمی زار و قطار رونے لگا اور روتے روتے نوکر کو آواز دی۔

غریب خوش ہو گیا کہ اب اس کی مدد ہوگی۔ نوکر بھاگا ہوا آیا تو امیر آدمی نے کہا۔ ''خدا کے واسطے' اس کو فوراً باہر نکال دو' کم بخت نے رلا رلا کر میرا برا حال کر دیا۔''

مرسلہ: حافظ احسان اللہ بازئی' ضلع پشین' نگاندہ۔

▲▼△▽

گر یوں ہوتا!

ناصر سلیم' خانیوال

یوں ہوتا' محبت ہوتی...... رسوا نہ کرتی...... پھول کھلتے' بہار نہ آتی۔ سناٹے ہوتے' وحشتیں نہ ناچتی۔ ویرانیاں' دیوار اپنی پھر کا ہے کی پروے واری' ظرف داری' حالات کی فرماں برداری' حاکمِ وقت کے انصاف' محبتوں کے عہد ٹوٹ جانے کے خوف' اٹھی آنکھ' خشک ہوئے آنسو' ان آنکھوں میں لکھی ان مٹ تحریریں' اس سندیسوں کے جواب میں' کبھی نہ آیا' کوئی خط' کوئی پتر' یوں ہوتا' ہم نوا ہوتے' ہم سفر ہوتے' راہ گزر ہوتے' ان قافلوں کے جو محبت میں لٹ گئے۔ آسرا ہوتے بھولنے والے کا' دامن دیکھتے' ساتھ چلنے والے کا۔ پھٹے پیرہن' زخمی پاؤں' اجلے لباس' میلے دل' سسکتے کارواں جو محبت میں رل گئے' مل نہ سکے۔ بے تول بکنے والے' بک کے پھر بے مول ہو جانے والے' کچھ نہ ہوتا' حقیقت میں' زندہ رہنے کے لیے آسرا ہوتا ڈھلتے سورج کا' مچل جانے والے چاند کا' نہیں' کہکشاں کا دامن نہ خالی ہوتا' ہاتھ کی حنا' لہو کے رنگ' محبت' ہر ایک کو تو راس نہیں ہوتی۔ یوں ہوتا' پر تکلم ہوتے' غبارِ وقت کے ساتھ' بادل نصیبوں کے ہوتے' پت جھڑ نہ ہوتا' کبھی نفرت کا' ہوا نہ چلتی' کبھی بچھڑ جانے کی' رہنا نہ پڑتا' پردوں کی اوٹ میں' ہاں' یوں بھی ہوتا' کوئی چاہنے والا ہوتا جو نفرت کے بدلے محبت دیتا' جو غلطی کا ازالہ کرتا' سزا نہ دیتا۔ ہاتھ اٹھتے بھی دُعا کے لیے تو آنکھ چھلک پڑتی۔ صبر کی تگ و دو میں اور یوں ہوتا۔ یوں نہ ہوتا تو یوں ہوتا۔ کچھ بھی نہ ہوتا۔ تو میرا ہوتا اور محبت پہ اعتبار ہوتا۔ محبت پہ اعتبار نہ کرنے والے لوگ بہت جلدی اپنی محبتوں کو کھو دیتے ہیں۔ کاش کہ تو بھی ایسا ہی کرتا......

جب لاد چلے گا بنجارہ

محمد آصف ریاض' ناصر کالونی' جھنگ صدر۔

میرے ہم نشینو! ہم دنیا کے ناز نخروں کے لیے نہیں آئے' یہ غدار ہے' مکار ہے' دغا باز ہے' فریبی ہے' دھوکے باز ہے' اس کا باطن اور ہے' اس کا ظاہر اور ہے' اس کی خوشیوں کے پیچھے غم کی قطاریں ہیں' اس کی راحت کے پیچھے دکھوں کے سمندر ہیں' اس کی عزت کے پیچھے ذلت کی سیاہیاں ہیں' اس کی خوشیوں کو غم نگلتے ہیں' اس کی زندگی کو موت کھاتی ہے' اس کی جوانی کو بڑھاپا لے جاتا ہے اور اس کی سیج کو قید کی سیج سے بدل دیا جاتا ہے۔ ارے' دس منزلہ بلڈنگ بنانے والے! کیا پتا تیری دس ہاتھ کی قبر تیار ہو چکی ہو۔ ارے' اونچے جوڑے پر تیری نظر جم نہ رہی ہو اور کیا پتا تیرے کفن کا کپڑا بازار میں آ چکا ہو۔ بڑی بڑی خوشبوؤں سے اپنے آپ کو معطر کرنے والے! کیا پتا' قبر کی اندھیری کوٹھڑی تیرے پیٹ کو پھاڑ کر پوری قبر کو بدبودار بنانے کے لیے تیار ہو چکی ہو۔ خوشیاں منانے والے! کیا پتا' تیرے اوپر ماتم ہونے والے ہوں۔ اللہ کی پکار سنو! ''میرے بندو! جس دن تمہیں میں نے پیدا کیا تھا' اس دن سے لے کر آج تک میں تمہیں دیکھتا رہا' تمہاری سنتا رہا' کچھ بھی نہ کہا۔

رات کے سجدے بھی دیکھے' رات کے رقص بھی دیکھے' رات کی پاک دامنیاں بھی دیکھیں' حلال بھی دیکھا' حرام بھی دیکھا' سچ اور جھوٹ بھی دیکھا' حق اور باطل بھی دیکھا' عفت و پاک دامنی کو دیکھا' زنا اور فحاشی کو دیکھا' حیا اور بے حیائی کو دیکھا' ظلم و عدل کو دیکھا' ہر چیز کو دیکھتا رہا' دخل نہ دیا' آج تیار ہو جاؤ۔ جس نے کلمہ پڑھا ہے' اسے اللہ' رسول کا پابند بننا پڑے گا۔ اگر نہیں بنے گا تو سزا ملے گی اس لیے سنبھالو اپنے آپ کو!

موت ایک حقیقت

عائشہ خورشید انور' کراچی۔

میں موت سے نہیں ڈرتی! موت برحق ہے' اس سے ڈرنا ایک فطری عمل ہے اور جبکہ اس موت سے کوئی چھٹکارہ بھی نہیں تو پھر ڈر کاہے کا؟ لیکن پھر بھی اک عجیب بے چینی طاری ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کے مرنے کا سنو یا پھر اس کو آخری منزل کی طرف روانہ ہوتے دیکھو' تب تمام دن اسی سوچ و فکر میں گزر جاتا ہے کہ آج اُس کی' کل ہماری باری ہے۔ میں بھی اک دن ایسے ہی اچانک مر جاؤں گی پھر سب کو اطلاع دی جائے گی کہ عائشہ خورشید وفات پا گئیں پھر تو گھر دھڑا دھڑ لوگوں سے بھرنے لگے گا' چاہے اور اَن چاہے لوگوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ بھانت بھانت کی بولیاں ہوں گی پھر غسل دیا جائے گا پھر کفن بھی پہنا دیا جائے گا اور پھر میرا آخری دیدار بھی کرا دیا جائے گا۔ جو مجھے چاہتا ہوگا' وہ میرے چہرے پر نُور دیکھ لے گا۔ بے شک ہونہ ہو اور جو مجھے تمام عمر ناپسند کرتا ہوگا' وہ چپکے چپکے میرے مرے ہوئے جسم پر سو سو کیڑے نکال دے گا۔ بچے بلک بلک کر رو رہے ہوں گے' صرف اس وقت تک جب تک میں کفن پوش حالت میں گھر پر پڑی رہوں گی پھر بہت سی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ مجھے آخری آرام گاہ تک لے جایا جائے گا اور پھر مجھے زمین کی تہہ میں اتار دیا جائے گا۔ میں اس دنیا کی انارکلی اب آخری وقت میں زمین میں چنوا دی گئی ہوں پھر سب مجھے اکیلا چھوڑ کر گھر آ جائیں گے۔ گھر آنے کے بعد کھانے کا دور چلے گا۔ کوئی میری' کوئی میرے مرنے کی بریانی کی تعریف کرے گا پھر سب اپنے گھر کی راہ لیں گے۔ اس موت نے میرا اس دنیا سے باب یہیں بند کر دیا۔ آگے کی زندگی کا مجھے کچھ بھی علم نہیں۔ کوشش یہی کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اپنے اعمال سدھاروں' زیادہ سے زیادہ نیکیاں کماؤں اور اس نیکی اور اعمال کمانے میں' میں کہاں تک کامیاب ہوئی' اس کا پتا تو مرنے کے بعد ہی چلے گا یا پھر قبر میں پتا چلے گا۔ قبر کا حال صرف اللہ اور مُردہ ہی جانتا ہے اسی لیے صرف میں نے اپنی موت کا حال لکھا ہے' موت کے بعد کا علم مجھے نہیں ہے کیونکہ میں ابھی مُردہ نہیں' زندہ ہوں۔

دل

ماریہ جلال' ملیر' کراچی۔

دل ایک آئینہ ہے' یہ اگر برائی سے پاک ہو تو اس میں خدا نظر آتا ہے مگر جب یہی برائی سے بھرا ہو تو شیطان کا گھر بن جاتا ہے۔ بہ ظاہر یہ جسم کا ایک چھوٹا عضو ہے مگر کبھی یہ کسی کے سینے میں محبت بن کر دھڑکتا ہے تو کسی کے دل سے لاوا کی مانند نکلتا ہے۔ اگر دل بے رخی پر اتر آئے تو اندر ہی اندر سلگ کر اپنی جھوٹی انا کی خاطر راکھ ہو جاتا ہے مگر کبھی یہ خود پر گزرے کرب کو عیاں نہیں کرتا۔ یہی دل ہے جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر رانجھا کشکول ہاتھ میں لے کر در در بھٹکا ہے تو کبھی فرہاد کی شکل میں سنگلاخ چٹانوں سے نہریں نکالتا ہے۔ دل کی ہزار آنکھیں ہوتی ہیں مگر یہ محبوب کے عیب نہیں دیکھ سکتا۔ سچی محبت کرنے والا دل صرف ایک شخص کے لیے دھڑکتا ہے۔ محبت' نفرت' کدورت ان سب کا تعلق دل سے ہے۔ انسانی زندگی کے بے شمار جذبوں' آرزوؤں' امنگوں' خوابوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ دل انسان کو کبھی اپنے ہاتھوں اتنا بے بس کر دیتا ہے کہ خود اس کے اختیار میں نہیں رہتا اور جب دل نفرت پر اتر آئے تو پتھر کی مانند ہو جاتا ہے۔ جب ہم کوئی گناہ کرتے ہیں تو دل پر ایک سیاہ نکتہ بن جاتا ہے اور یہی نکتہ گناہوں کی کثرت سے بڑھتے بڑھتے دھبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں کچھ نظر نہیں آتا لہٰذا ہمیں اس آئینہ دل کو ہمیشہ پاک و صاف رکھنا چاہیے۔

اعتماد

محمد آصف ریاض' لمت کالج' جھنگ صدر۔

اعتماد ایک ایسا ستون ہے جس پر ہر رشتے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ رشتوں کی پائیداری کے لیے اعتماد کا ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ رشتہ چاہے ماں کا ہو' دوستی یا پھر محبت کا' اعتماد کی غیر موجودگی' رشتوں کی ناپائیداری اور ناپختگی کا باعث ہوتی ہے۔ کسی شخص پر اعتماد کی وجہ سے ہم اس سے یہ توقع وابستہ کر لیتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا فعل جس سے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے' کرنے سے گریز کرے گا۔ بے اعتمادی رشتوں میں ایک ایسے خلا کو جنم دیتی ہے جس کو پورا کرنا محال ہوتا ہے۔ والدین کو اعتماد ہوتا ہے کہ ان کی اولاد ایسا کچھ نہیں کرے گی جو اُن کے لیے ذلت اور باعثِ شرم ہو۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو والدین اور اولاد کے رشتے میں بھی دراڑ پڑ جاتی ہے۔ محبت کے رشتے میں ہم اپنی محبوب شخصیت سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے قول و فعل کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔ زندگی کے کسی ایسے موڑ پر جب ہمارے قدم متزلزل ہوں' جب روشنی ماند پڑ جائے' تاریکی و وحشت کی حد تک پھیل جائے اور جب ہر چیز کا نقش دھندلانے لگے تو ہمیں اعتماد ہوتا ہے کہ کوئی ایسی ذات ہے جو ہمارے قدموں کو ڈگمگانے نہیں دے گی۔ جو تاریکی میں جگنو جیسی روشنی کی کرن لائے گی' جو ہماری رکی ہوئی زندگی کو پھر رَواں دَواں کر دے گی۔ دوستی میں بے اعتمادی اس پھول کے مشابہ ہے جس کو پودے سے الگ کرنے کے بعد اس کی پنکھڑیوں کو منتشر کر دیا گیا ہو اور پھر بے رحمی سے انہیں اپنے پاؤں تلے روند دیا ہو۔ میری نظر میں وہ شخص سب سے بڑا مجرم ہے جو دوسروں کے جذبات و احساسات سے کھیلتا ہے اور دوسروں کے اعتماد کا خون کرتا ہے۔ ایسے لوگ معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے معاشرے میں رہنے کا حق چھین لینا چاہیے کیونکہ جب اعتماد ٹوٹتا ہے تو دکھ اور غم کی کرچیاں ہماری آنکھوں کو زخموں سے چور چور کر دیتی ہیں۔ اعتماد کو ٹھیس پہنچنے کا مطلب ہے کہ انسان کا اندر سے ٹوٹنا اور جب انسان اندر سے ٹوٹتا ہے تو پھر اسے سمبھلنے کے لیے ایک زندگی بھی ناکافی ہوتی ہے۔

جنگ

کرن نسیم شاد' کراچی۔

دل اور دماغ کے درمیان جنگ سدا سے جاری ہے' یہ ازل سے ہے اور میرے خیال میں ابد تک جاری رہے گی۔ دل اور دماغ دونوں کے نظریات اور ترجیحات ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ہی زندگی کو اپنے طریقے سے دیکھتے ہیں۔ اکثر لوگ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتے ہیں اور ہمیشہ اس پر قائم و دائم رہتے ہیں لیکن بسا اوقات ہمارے دل اور دماغ دونوں ہی کسی ایک گتھی پر ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں اور انسان کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ ان میں سے کس کا کہا مانے' ایسی صورت میں دل' دماغ سے کوئی سوال کرتا ہے تو دماغ ٹھوس دلیلوں پر دلیلیں دیئے جاتا ہے' معاملات کی نزاکت کو سمجھاتا ہے' وقت کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے' دنیا میں چلنے کا ڈھنگ سکھلاتا ہے' دنیاداری نبھانے کا طریقہ بتلاتا ہے' ایسے عالم میں دماغ نہ جانے کیا کیا باور کراتا رہتا ہے لیکن دل اس کا قائل نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان سب کو نہیں مانتا پھر دماغ تنقیدی لہجے میں دل سے اس کے نظریات دریافت کرتا ہے تو دل ایک دم اداس اور خاموش سا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں' ایک وہ جو دل کا کہا مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے برعکس دماغ کے حق میں ہوتے ہیں جو دماغ کے بتائے رستے پر چلتے ہیں' وہ اکثر اہلِ دل پر ہنستے' مذاق اڑاتے یا تنقید کرتے

ہی نظر آتے اور آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں اور دماغ فخر سے کہتا ہے۔ ”میرا کہا مان کہ یہ کتنے مطمئن اور کامیاب ہیں‘ میں تو سرخرو ہوگیا۔“ لیکن دل شاید اس لیے سدا اداس رہتا ہے کیونکہ دل جانتا ہے کہ جو لوگ اس کی پیروی کرتے‘ اپنے دل کی آواز سنتے اور ہمیشہ خوابوں‘ خیالوں‘ بارشوں‘ یادوں‘ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں‘ وہ ہر دم روتے‘ بلکتے‘ سسکتے‘ تڑپتے‘ اجڑتے‘ ٹوٹتے اور بکھرتے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کو گزرتے وقت یا حالات سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ وہ ایک لمحے میں ہی اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ وہ شاید دنیا میں چلنے کا صحیح ڈھنگ تو نہیں جانتے مگر کس طرح رشتوں کے حقوق اور فرائض نبھائے جاتے ہیں‘ وہ ضرور سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بنیاوی تڑتی وکامیابی معنی نہیں رکھتی۔ ان کی اہمیت کی حامل چیزیں بہت معمولی اور چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں اور وہ خوشیاں بھی ایسی ہی چیزوں میں کھوجتے ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی عملی زندگی اکثر ناکام گزرتی ہے اور یہ جن چیزوں کے حصول میں تگ ودو کرتے ہوئے اپنی زندگی کو وقف کردیتے ہیں‘ اس سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دل کے وہ رشتے اور باتیں صرف یادیں بن جاتے ہیں‘ خیال صرف خیال رہ جاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں‘ وہ سنہرے خواب کرچی کرچی ہوکر آنکھوں میں چبھتے ہیں‘ بارشیں بھی روٹھ جاتی ہیں اور یہ دل..... سند ابارش کی طرح برستا رہتا ہے اور آنسو بہاتا ہے‘ اپنی ناکامی پر‘ اپنے احساس‘ اپنی سوچ پر اور کہتا ہے۔ ”میں سرخرو نہ ہوسکا‘ آخر کیوں؟ میں سرخرو نہ ہوسکا؟“

آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام‘ میری سعی عمل بھی ناکام

سوال

مدیحہ پھول‘ دوحہ قطر

میری ایک دوست ہے۔ اس کے والد اور بھائیوں کی زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ میری دوست کے چار بھائی اور والد اسی دشمنی کی نذر ہوچکے تھے‘ بس ایک بھائی رہتا تھا۔ وہ ایک روز نماز پڑھنے جارہا تھا کہ اسے دشمنوں نے گھیر لیا۔ وہ جان بچانے کے لیے مسجد کے ساتھ موجود لہلہاتے کھیت میں چھپ گیا کیونکہ اس وقت اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میری دوست کو جب یہ معاملہ پتا چلا تو وہ اپنے گھر سے پردے کی پروا کیے بغیر اپنے بھائی کو بچانے دوڑی۔ ساتھ ہی اس نے گھر سے بھائی کی کلاشنکوف بھی لے لی تھی۔ جب وہ دشمنوں کے بالکل سامنے جاکر کھڑی ہوگئی تو گولیاں چلنا بند ہوگئیں۔ میری دوست نے اپنے خاندانی دشمنوں سے کہا کہ میرے بھائی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں اس لیے تم لوگ مجھے اس تک یہ کلاشنکوف پہنچانے دو۔ بھائی نے بہن کی آواز سنی تو وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر پناہ گاہ سے باہر آگیا اور بہن کو ڈانٹنے لگا کہ اگر تمہیں گولی لگ جاتی تو اس کا بدلہ میں کیسے لیتا؟ پورے خاندان کے مردوں کو مار کر بھی بدلہ ختم نہ ہوتا۔“ جبکہ دشمن پارٹی نے کہا۔ ”اگر ہماری چلائی کوئی گولی تمہیں لگ جاتی تو ہم ساری زندگی سر اٹھا کر نہیں چل سکتے۔“

دشمنی کوئی فخر کی بات نہیں مگر اس میں آپ کو عورت کے احترام کی روایت ملے گی تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو اپنی دشمنی میں دہشت گرد کا روپ دھار کر عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کرتے ہیں؟

.....☆☆.....

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار‘ ادبی ذوق کے آئینہ دار

رُولی مریم حمید..... اورنگی ٹاؤن
میرے مولا! تیری جنت سے جدا لگتی ہے
میری دھرتی مجھے معصوم دُعا لگتی ہے

ایم یو شاہین..... کراچی
جنت میں نہ کھینچو نہیں جانا‘ نہیں جانا
میں چھوڑ کے آقا کا مدینہ نہیں جانا

زاہدہ رشید علوی..... راولپنڈی
مسکراتے موسموں میں کرب کے پہلو بھی دیکھ
جو مقید ہیں حصارِ گل میں‘ وہ آنسو بھی دیکھ

ذیشان شفیق..... کوٹ سمابہ
صرف اتنی سی بات پہ رہبری چھن گئی ہم سے
کہ ہم سے کارواں منزل پہ لٹوائے نہیں جاتے

فرمان اللہ خان..... بنوں
آئے کو کہہ گئے تھے نہ آئیں خدا کرے
کیا لطف آرہا ہے مجھے انتظار میں

ایمن ناز..... العین یو اے ای
اِک کرب سا ہے رُوح کے اندر چھپا ہوا
آنکھوں میں جل رہے ہیں مرے خواب‘ کیا لکھوں

عُکاشہ سحر ایمان..... ملتان
اتنا تو مجھے یاد ہے شاید کسی رُت میں
کچھ لوگ قریب رگِ جاں ہونے لگے تھے

ظفر عباس زاہد..... پنجگرائیں
عمر بھر بے چراغ راستوں میں‘ زندگی نے ہمیں گزارا ہے
چاہتوں کی بساط پر محسن دل بڑی مشکلوں سے ہارا ہے

صائمہ ناز..... کورنگی
دے خط‘ منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

نگہت نگار محمد صادق..... کراچی
اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

سلمانہ تسلیم رضا..... گھوٹکی
کیا ہے‘ کیا ہے مگر اور پرکھنا سیکھو
یوں ہی بیکار سمندر نہ کھنگالو یارو.....!

عبدالرزاق تاج بلوچ..... دوحہ قطر
جب تیرا چہرہ کسی اور سے نہیں ملتا
کسی اور سے کیوں ہم دل لگائیں؟

مہر غلام شبیر سرگانہ..... باگڑ سرگانہ
ہم تم کو روتے ہی نہ رہتے اے مرنے والو!
مر کے اگر پا سکتے تم کو‘ مر جاتے ہم بھی

عمران گل سیج..... دریا خان
اُس کے حسیں لب تھے جسم سے بے نیاز
دیکھا جو حال میرا‘ خیالوں میں کھو گئے

ریاض بٹ..... حسن ابدال
تہذیب کے لاشے پہ کھڑا کب سے نہ جانے
فرسودہ رواجوں کا بدل سوچ رہا ہوں

راحیل احمد مجاہد..... ذیرہ اللہ یار
کوئی بھوکا ہو تو یہ عقدہ کھلے
کون کتنا صاحبِ کردار ہے

اختر عباس اختر..... فیصل آباد
اُسے گمان تھا کہ چاہا زمانے بھر نے اُسے
عزیز سب کو تھا لیکن ضرورتوں کی طرح

مریم صدیقہ..... اقبال نگر‘ چیچہ وطنی
اِک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل اور سارے دریچے دھو جائے

علی محمد وفا بروہی..... باہو کھوسہ
وہ ہوش و حواس‘ تاب و تواں داغ جا چکے
اَب ہم بھی جانے والے ہیں‘ سامان تو گیا

شاکر بشیر نانوری..... کھل
ہم نے کس صبر سے ہر جبر سہا ہے لیکن
اَب جو ہم چیخ اٹھیں‘ آپ بھی غصہ نہ کریں

کوثر ناز رفیق......لیاری
آنکھیں ہزار ضبط کی کوشش کے باوجود
رُک رُک کے بار بار برستی ہیں آج بھی

غزالہ شاہین عبدالقیوم......حیدرآباد
کبھی بندے کو خدا مت کہنا
ہے بڑی اس کی سزا' مت کہنا

خان عطاء اللہ گبول......گھوٹکی
کفن نہ ڈالو میرے چہرے پہ' مجھے عادت ہے مسکرانے کی
نہ دفناؤ میری لاش کو' اب بھی امید ہے اس کے آنے کی

سارہ سندھو نظامانی......ٹنڈو سومرو
اپنی ادائیں دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں' کوئی دیکھتا نہ ہو

تنویر شاکر عاطر......پنڈ داد' جہلم
شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے
ہمیں خبر ہے لٹیروں کے ہر ٹھکانے کی

محسن سلیم......کراچی
وہ جو میرے غم میں شریک تھا جسے میرا غم بھی عزیز تھا
میں جو خوش ہوا تو پتا چلا وہ میری خوشی کے خلاف تھا

رضوانہ کوثر......لاہور
میں جب سوتی ہوں تھک کر' تم سرہانے بیٹھ جاتے ہو
میرے ہم زاد ہو شاید' تمہیں کیا نام دوں آخر؟

ایمان علی......سکھر
دور سے دیکھ کر میں نے اسے پہچان لیا
اس نے اتنا بھی نہیں مجھ سے کہا کیسے ہیں؟

سلمیٰ ممتاز نوشاہی......بہاول پور
کوئی رستہ نہ جب نظر آیا
احتیاطاً بچھڑ گئے ہم لوگ

ماروی سکھیو......عمر کوٹ
جن کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہو
اُن کی آنکھیں اداس ہوتی ہیں

سونول دھانول......حیدرآباد
ایسے منظر پہ گھل کے بچھڑ جا مجھ سے
میری آنکھوں میں کسی اور کی صورت نہ رہے

سعدیہ اسلم......خانیوال
وہ ساتھ تھے تو وقت کے پر تھے لگے ہوئے
لمحے ہمارے واسطے اب ماہ و سال ہیں

شائستہ پرویز......لاہور
چشم بینا کو تو دونوں چاہئیں ہیں ایک سی
آئینے پر گرد ہو یا رخِ آئینہ ہو صاف

رُدی حمید......مظفر گڑھ
خوش رنگ پیرہن سے بدن تو چمک اٹھے
لیکن سوال رُوح کی تابانیوں کا ہے

مہناز خان......ملتان
میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا تھا فراز
میرے سینے میں اسی شاخ کا کانٹا اترا

سیدہ تسنیم زہرہ......لاڑکانہ
ہر قدم اٹھتا ہے اک احساسِ آزادی کے ساتھ
مسکراتا' گنگناتا' جھومتا جاتا ہوں میں

شاہین اکرام......کامل پور
موتی ہیں ان کی تہہ میں کہ پتھر' کسے خبر؟
دل تو سمندروں سے بھی گہرے ہیں دوستو!

سیمارؤف......لاہور
کنبِ جنوں سے عشق کو نکال کر مثالِ مہر
کوئی کہو' میں کیا کروں کہ یہ کام بھی کر لیا

دردانہ گل......پشاور
کبھی سلگنا' کبھی خارزار میں رہنا
بڑا کٹھن ہے تیرے انتظار میں رہنا

حمیرا صدیقی......جہلم
آوارگانِ عشق کی حدِ سفر کہاں؟
منزل ہو سامنے تو پلٹ جائیں راہ سے

سعدیہ اقبال سعیدی......کراچی
جنگل منافقت کے سروں سے بلند تھے
سچ کے گلاب رُوح کے اندر سمٹ گئے

آپ کی خبر

◆......شادی خانہ آبادی......◆

☆ماہنامہ سچی کہانیاں کے مدیر راجا محمود' 19 اگست کو شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ادارہ اپنے ساتھی کی خوشیوں میں برابر کا شریک ہے اور اس جوڑے کی خوشیوں اور زندگی کی کامیابیوں کے لیے دُعاگو ہے۔

☆......اعتکاف مبارک......☆

☆ ہماری دیرینہ ساتھی' لکھاری اور شاعرہ رضوانہ کوثر نے اس برس بھی رحمتوں بھرے ماہِ رمضان المبارک میں اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی۔ ادارہ رضوانہ کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دل سے دُعاگو ہے۔

☆......سالگرہ مبارک......☆

☆ہماری قاری ثمینہ ناز' کراچی کے فرزند مجتبیٰ حسن کی سالگرہ 9 اگست کو منائی گئی۔ ادارہ مجتبیٰ حسن کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دُعاگو ہے۔

☆ہماری دوست لکھاری عائشہ خورشید انور کے صاحب زادے معاذ انور' 14 اگست 2013ء کو 21 برس کے ہو گئے۔ معاذ کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے ادارہ دُعاگو ہے۔

☆ہماری پرانی قاری رخسانہ نوید نے 9 رمضان المبارک کو اپنی سالگرہ منائی۔ ادارہ دل سے رخسانہ کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دُعاگو ہے۔

📖......کتاب خبر......📖

📖 گزشتہ ماہ ہمارے دوست شاعر فہیم شناس کاظمی کی خوب صورت نظموں کا مجموعہ ''راہداری میں گونجتی نظم'' منظر عام پر آ گیا ہے' جسے ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر ادارہ فہیم شناس کاظمی کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور دل سے ان کی کامیابیوں کے لیے دُعاگو ہے۔

📖 ہماری دوست لکھاری زمر نعیم کا ناول ''تم کیا ملے'' القریش پبلی کیشنز کے توسط سے شائع ہو کر مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

📖 زمر نعیم کا ایک اور ناول ''تیری چشمِ نم کی چاہ میں'' بھی القریش پبلی کیشنز نے شائع کر دیا ہے۔

ان خوب صورت ناولز کی اشاعت پر ادارہ زمر نعیم کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

📖 ہماری دوست لکھاری اور شاعرہ دردانہ نوشین خان کی خوب صورت نظموں سے سجا مجموعۂ کلام ''پھولوں کی رفوگری'' شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ ادارہ دردانہ نوشین خان کو اس خوب صورت مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور دل سے ان کی کامیابیوں کے لیے دُعاگو ہے۔

......☆☆......

''آپ کی خبر'' کا حصہ بننے کے لیے تمام رائٹرز اور قارئین بلاجھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔